

فہرست کتب



محبت ابر کی صورت

نگہت سیما

علم و عرفان پبلشرز

34- اردو بازار، لاہور فون: 042-7352332-7232336

فہرست

7	محبت ابر کی صورت	-1
20	نارسا	-2
49	اندھا قرض	-3
60	بیوٹی کلینک	-4
75	اوور ایج	-5
90	بے جہت سفر	-6
112	تھوک	-7
121	کوچن مارک	-8
147	پس لفظ	-9
161	کھوٹا سکھ	-10
172	انسان یا پرندہ	-11
184	چھوٹی سی بات	-12
193	پناہ گاہ	-13
207	چھاپ	-14
227	ماہ تمام	-15
232	انٹلیکچوئل	-16

محبت ابر کی صورت

سب لوگ کہتے تھے وہ بہت لکی ہے، بہت خوش قسمت..... لیکن گل مہر کو شاید اپنی خوش قسمتی کا یقین نہ تھا حالانکہ صبح ناشتے کی بڑی سی ٹیبل پر انواع و اقسام کا ناشتہ دیکھ کر وہ خود کو باور کرانے کی کوشش کرتی کہ وہ بہت خوش قسمت ہے، پھر صبح سے لے کر شام تک وہ خود کو مختلف حوالوں سے یہ باور کراتی رہتی۔

ناشتے کے لوازمات سے بھی ٹیبل پر کینو اور سیب کے جوس سے بھرے جگ، گاجر کا حلوہ، بوائٹل اور فرائی انڈے، آلیٹ سلاکس، مکھن، جیم، خستہ پراٹھے..... اور کھانے والے وہ صرف چار افراد.....

کبھی اس نے ٹی وی پر ڈرامہ دیکھتے ہوئے ایسی ہی بھی ٹیبل دیکھ کر آپا سے کہا تھا۔

”ہائے آپا کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں یہ لوگ، اتنی اقسام کا ناشتہ۔“

اور اب جب ایسی ہی ناشتے سے بھری ٹیبل سامنے ہوتی تھی تو پتا نہیں کیوں اسے اماں کے ہاتھ کے بنے مولیٰ اور آلو کے پراٹھے یاد آنے لگتے تھے اور معمولی کپوں میں گرم گرم ہونٹ ہلاتی چائے..... تب وہ صرف سوکھا سلاکس چائے کے گھونٹ کے ساتھ نگل لیتی۔

”بیٹا جوس ضرور لینا چاہیے صبح۔“

پاپا کبھی کبھی کہتے تو وہ خاموشی سے جوس گلاس میں ڈال کر گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے فہد مرزا کو سلاکس پر مکھن لگاتے دیکھتی رہتی اور ذہن وہیں اپنے چھوٹے سے باورچی خانے میں، اماں اور آپا کے گرد گھومتا رہتا۔

اتنا بڑا گھر، اتنا خوبصورت لان جس میں رنگ رنگ کے پھول تھے۔ کبھی اس نے سوچا تھا کہ ایسے گھروں میں رہنے والے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں اور اب جب وہ ایسے ہی گھر میں

تھی تو اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہ تھا۔ اسے پھول کتنے پسند تھے، لیکن اس کے چھوٹے سے گھر میں کیاریوں کی گنجائش نہ تھی تب وہ مٹی کے چھوٹے چھوٹے دو گیلے لے آئی تھی جن میں گلاب اور موہیے کے پودے لگے تھے۔ اس نے ان گیلوں کو سرخ رنگ کیا تھا اور کتنے شوق سے پانی دیتی تھی اور جب اس کے گلاب کے پودے پر پہلا پھول کھلا تھا تو اس نے اماں، ابا آپا سب کو ہی بتایا تھا اور موہیے پر کھلنے والے پہلے پھول تو ذکر اماں کو دیئے تھے کانوں میں پہننے کے لیے..... اور اماں صرف دو پھول پہننے سے کتنا جگمگاتی تھیں، کتنی چمک آگئی تھی ان کے چہرے پر، جومی کے چہرے پر اتنے قیمتی ٹاپس پہن کر بھی نہیں آتی۔

اور یہاں اس گھر میں ہر رنگ اور ہر قسم کے گلاب تھے، موہیے کی بلیں تھیں جو ستونوں پر لپٹی اور پیرس تک چلی گئی تھیں، مالی صبح صبح پھول چن کر بید کی خوبصورت ٹوکری میں بھر کر لاؤنج میں ٹیبل پر رکھ دیتا تھا..... لیکن اسے پتا نہیں کیوں اپنی خوش قسمتی پر شک سا تھا، اگر شک نہ ہوتا تو وہ کبھی خود کو صبح سے شام تک یہ باور کرانے کی کوشش نہ کرتی کہ وہ، یعنی گل مہر بہت خوش قسمت ہے۔

فہد مرزا جیسا خوبصورت، انساٹ اور پڑھا لکھا ساتھی، اتنا بڑا شاندار گھر..... وہ اپنے بیڈ روم کے خوابناک ماحول میں سفید اور گولڈن لیمینیشن والے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر سو جاتی۔

یہ آسانی ویلوٹ کے قیمتی پردے.....

یہ اتنا شاندار فرنیچر.....

یہ سب..... اس شاندار بیڈ سے ٹیک لگائے، امریکہ اور فرانس سے خریدی ہوئی ٹائیاں پہنے وہ سو جاتی رہتی، خود کو باور کراتی رہتی کہ وہ بہت خوش قسمت ہے لیکن اس خوش قسمتی پر دل پتا نہیں کیوں خوش نہیں ہوتا تھا، جیسے کہیں کوئی کمی ہے..... لیکن کیا.....

چھ ماہ میں وہ بیزار ہو گئی تھی، ادب سی گئی تھی۔ اس کا دل کبھی کبھی شدت سے چاہنے لگا تھا کہ بھاگ کر اپنے گھر چلی جائے اور باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر پکوڑے اور چپس تلے اور پلیٹ میں ڈال کر امی کی چٹنی سے کھائے، خوب چٹارے لے لے کر..... اور راتوں کو آپا کے ساتھ بنا آہٹ کے، ننگے پاؤں باورچی خانے میں جا کر چپکے چپکے بنائے اور سینڈوچ بنا کر اس طرح دونوں دبے پاؤں اپنے کمرے میں آ جائیں اور پھر رات کو دیر تک جاگتے ہوئے یہ سینڈوچ اور چائے پی جائے.....

ای سے سر میں تیل کی مالش کروائے اور جب نیند سی آنے لگے تو امی کی گود میں ہی سر

رکھ کر سو جائے.....

آپا سے خواہ مخواہ ہی لاڈ اٹھوائے.....

ضد کر کے چھٹی چھوٹی باتیں منوائے.....

یہاں سب کچھ تھا، بن مانگے ہی..... ایک بار اس نے آپا سے کہا تھا۔

ہائے کتنا مزہ آئے آپا، اگر ہمارا بھی ایک کک ہو جو کھانا بنا کر ٹیبل پر لگا دے اور کہے۔

کھانا لگ گیا بیگم صاحب! اور ہم سارا دن مزے سے کتابیں پڑھیں اور ٹی وی دیکھیں۔“

اور اب، جب کک کھانا بنا دیتا، رضیہ بی بی کھانا ٹیبل پر لگا دیتی تو کچھ بھی اچھا نہ لگتا۔

سارا دن ٹی وی دیکھ دیکھ کر اور کتابیں پڑھ پڑھ کے بھی وہ تھک جاتی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اب اس کا

جی ہی نہ چاہتا تھا، نہ ٹی وی دیکھنے کو نہ پڑھنے کو..... حالانکہ کبھی اسے کتنا شوق تھا کلرڈ ٹی وی

خریدنے کا..... اور اب اتنا بڑا ٹی وی تھا، شاید 29 انچ کی اسکرین والا..... اور کہاں وہ 14 انچ کا

سوئی خریدنے کے لیے اماں کی مٹیں کرتی رہتی تھی۔

وہ واقعی ہی خوش قسمت ہے..... ریویوٹ ہاتھ میں لے کر وہ سو جاتی۔

لوگوں کی سائیں کتنی ظالم ہوتی ہیں، اسے انجم آپا کے سنائے قصے ابھی بھی یاد تھے۔

شادی سے پہلے تو وہ اچھی خاصی خوفزدہ رہتی تھی کہ ایسی ساس اگر میرے نصیب میں ہوئی تو میرا تو

مارے خوف کے دم ہی نکل جائے گا..... لیکن اس کی ساس تو انجم آپا کی بیٹی گئی ساسوں سے بالکل

مختلف تھیں۔ بھنوں کی تراش سے لے کر، ہاتھوں کی نیل پالش تک سے آراستہ، صبح ناشتے کی ٹیبل

پر ایک لمحے کو تو اپنے چہرے کے تاثر سے وہ بہت سخت لگتی تھیں لیکن اس تاثر سے قطع نظر، وہ ذرا بھی

سخت مزاج نہ تھیں، بہت نرم لہجے میں بات کرتی تھیں۔ انہیں بہو کی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہ

تھا۔ باقاعدگی سے پارلر جانا، فریڈز سے ملنا یا پھر سوشل ورک کرنا..... اور نہ ہی ان کے پاس اتنا

وقت تھا کہ وہ بیٹے کو پاس بٹھا کر خواہ مخواہ ہی بہو کے خلاف اس کے کان بھریں۔ ایسی انوکھی ساس

تھیں اس کی..... فہد مرزا چونکہ اکلوتے تھے اس لیے پناہ قسم کی حاسد، جلا دندیں تو سرے سے تھیں

ہی نہیں جن کے قصے انجم آپا سے سن کر کئی بار تو اسے مارے خوف کے نیند ہی نہیں آئی تھی کہ اگر

ایسی جلا قسم کی تندوں سے اس کا واسطہ پڑ گیا تو کیا ہوگا، وہ تو اتنی نازک دھان پان سی تھی..... اور

اس خوف سے ایک بار دل ہی دل میں اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا، یہ اور بات کہ

اس سے پہلے کہ وہ آپا یا اماں کو اس فیصلے سے آگاہ کرتی، ایک محبت کرنے والے، چاہنے والے

رفیق کے خیال نے اسے روک لیا۔

اس کی محبت سنگ ہوگی تو پھر ان پناہ، حاسد تندوں کو بھی برداشت کر ہی لوں گی.....

اور اب تو انجم آپا کی بتائی گئی نندیں نہ تھیں، ساس بھی بڑی بے ضرری تھی۔ تو اگر کہنے والے یہ کہتے تھے کہ گل مہر بہت خوش قسمت ہے تو وہ کچھ غلط تو نہ کہتے تھے۔
جب آپا نے آٹا گوندھتے ہوئے سرگوشی میں اسے بتایا تھا کہ اس کے لیے فہد مرزا کا رشتہ آیا ہے تو اسے بھی اپنی خوش قسمتی پہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔
”وہی فہد مرزا ناجو اس روز تایا جان کے گھر آئے ہوئے تھے، اپنی ممی کے ساتھ غالباً فریجہ باجی کو دیکھنے؟“

”ہاں!“ آپا مسکرائی تھیں۔ ”لیکن انہوں نے تمہیں پسند کر لیا۔“

”ہائے اللہ آپا مجھے؟ فریجہ باجی نے تو اتنے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پورے تین ہزار کا بوتیک سے لائی تھیں وہ سوٹ اور میرا وہ ڈیڑھ سو روپے کا کاشن کا سوٹ جس پر آپ نے کڑھائی کر دی تھی ورنہ وہ تو کپڑا ہی اتنا گھٹیا تھا۔“

”انہوں نے تو تمہیں دیکھا گل مہر، تمہارے کپڑوں کو نہیں۔“

”پر آپا.....“ اسے تو شروع سے عادت تھی حجت کرنے کی ”وہ تو اتنے امیر کبیر لوگ ہیں اور تایا جان بھی تو اتنے امیر ہیں۔ تاکی جان تو کہہ رہی تھیں، فریجہ کو جہیز میں ڈیفنس میں پلاٹ بھی دیں گی اور ہمارے پاس کیا ہے۔ پھر بھلا وہ کیوں رشتہ ڈالیں گے ادھر۔“

”وہ لالچی نہیں ہیں لیکن مہر و اماں کا ارادہ نہیں ہے ادھر تیرا رشتہ کرنے کا۔“

”کیوں؟“

”ان کا خیال ہے تاکی اماں ناراض ہوں گی۔ ابا کی بیماری میں اور پھر ابا کے بعد انہوں نے کتنا خیال رکھا ہمارا۔ اگر تایا ہماری مدد نہ کرتے تو بھلا ابا کا علاج ہو سکتا تھا۔“

”ہاں یہ تو ہے لیکن آپا اگر اماں نے انکار کر دیا تو کیا پھر وہ فریجہ باجی سے شادی کر لیں گے؟“

”اندھ سے اس کا دل بچھ سا گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اندر دھڑکنوں نے کیسا دھمال ڈالا ہو تھا۔“

”اندھ سے اس کا دل بچھ سا گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اندر دھڑکنوں نے کیسا دھمال ڈالا ہو تھا۔“

”اندھ سے اس کا دل بچھ سا گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اندر دھڑکنوں نے کیسا دھمال ڈالا ہو تھا۔“

”اندھ سے اس کا دل بچھ سا گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اندر دھڑکنوں نے کیسا دھمال ڈالا ہو تھا۔“

”اندھ سے اس کا دل بچھ سا گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اندر دھڑکنوں نے کیسا دھمال ڈالا ہو تھا۔“

”اندھ سے اس کا دل بچھ سا گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اندر دھڑکنوں نے کیسا دھمال ڈالا ہو تھا۔“

”اندھ سے اس کا دل بچھ سا گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے اندر دھڑکنوں نے کیسا دھمال ڈالا ہو تھا۔“

تایا جان آ گئے۔

”انکار کیوں کیا بھابی، فہد بہت اچھا لڑکا ہے اور مرزا صاحب بہت شریف آدمی ہیں۔“

”لیکن بھائی صاحب، وہ فریجہ.....“ اماں منمنائی تھیں۔

”تو کیا ہوا، مہر بھی تو اپنی ہی بیٹی ہے۔ فریجہ کا کہیں اور ہو جائے گا۔ جہاں اس کا نصیب۔“

تایا اور تاکی اماں نے تو بالکل برا نہ مانا تھا۔ انہیں آپا کا دکھ تھا جو بھری جوانی میں بیوہ ہو کر ماں کے در پر آ بیٹھی تھیں اور جتنی زندگی سسرال میں رہیں کانٹوں پہ بسر کی۔

”اچھا ہے گل مہر کی زندگی تو اچھی گزر جائے گی۔“ تایا اور تاکی جان کا خیال تھا۔

تب اماں چپ کر گئیں اور اس کے دل میں تو لڈو پھوٹنے لگے تھے۔

”ہائے اللہ کتنی رومیٹک سی بات ہوئی ہے کہ فہد مرزا نے اسے دیکھا اور پسند کر لیا اور پھر اس کی غربت کا خیال کیے بغیر رشتہ بھی دے بیٹھے.....“

”بالکل کہانیوں اور افسانوں ایسی بات ہیں نا آپا؟“

آپا مسکرا دی تھیں۔

”جھلی ہے تو تو، مہر۔ وہ بڑے لوگ ہیں وہاں ایسی اونگی بوٹکھی باتیں مت کرنا۔“

”میں کوئی بیوقوف ہوں آپا۔“ اور پھر اس نے آپا سے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن دل ہی دل میں نہ جانے کتنی ہی باتیں سوچ ڈالی تھیں۔

فہد مرزا کہیں گے گل مہر جب میں نے تجھے دیکھا تو مانو، میرا دل میرے سینے سے نکل کر تمہارے قدموں میں آ پڑا..... کہانیوں میں پڑھے کتنے ہی ڈائلاگ اس نے سوچ ڈالے تھے پھر میں کیا کہوں گی بھلا.....

اور جب کچھ نہ سوچا تھا تو کتنے ہی پرانے رسالے کھنگال ڈالے تھے کہ کوئی اچھا سا جواب رٹ لے کہیں فہد مرزا اسے بیوقوف ہی نہ سمجھ لیں۔

پھر تایا ابا نے یتیم بھتیجی کو اپنے ہی گھر سے رخصت کیا تھا اور جہیز کے لیے تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا تھا۔

”ہمارے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں اور جس چیز کی کمی تھی وہ ہم لے جا رہے ہیں۔“

مرزا صاحب نے تایا ابا سے کہا تھا پھر بھی تایا ابا نے کچھ نہ کچھ دیا ہی تھا۔ اماں کے اکٹھے کیے ہوئے کپڑے اور برتن تو وہ اماں کے گھر ہی چھوڑ آئی تھیں۔

اس گھر میں بھلا کس چیز کی کمی تھی، سچ ہی تو کہا تھا مرزا صاحب نے اور اس کی خوش قسمتی

کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتی، آپا سے لاڈ اٹھواتی اور رات کو جب اپنے بستر پر لیٹی تو اس انجانے ان دیکھے شخص کو گھنٹوں سوچتی جس کے پاس اس کے لیے ڈھیروں ڈھیروں محبت ہوگی اور اب وہ ان دیکھا شہزادہ ڈھیر ساری اضافی خوبیوں کے ساتھ خود ہی اس کے در پر آ گیا تھا۔ تو وہ دل میں سینٹ سینٹ کر رکھی گئی محبت اس پر لٹانے کو بے چین پھرا کرتی۔ دو ماہ میں ہی فہد مرزا اسے دنیا کے ہر شخص سے زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔ اماں اور آپا سے بھی زیادہ..... جبکہ ابھی وہ اپنے گھر تھی اور ابھی سوائے ایک بار کے اس نے فہد مرزا کو دیکھا تک نہ تھا اور جب وہ اس کے سنگ رہے گی، اس کے ساتھ، تو فہد مرزا تو اتنی محبتیں پا کر خود کو کتنا خوش قسمت سمجھے گا..... لیکن فہد کو تو شاید محبت کی چاہ ہی نہ تھی اور نہ ہی اسے پتی ورتا قسم کی مشرقی عورتیں پسند تھیں۔

اس کا دل چاہتا تھا وہ اس کے لیے اپنے ہاتھ سے ناشتہ بنائے.....

اس کے کپڑے پر لیں کر کے لٹکائے.....

اس کے جوتے پالش کرے.....

اور اس کے چھوٹے چھوٹے سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرے.....

”Let it یار۔“ فہد مرزا پہلے روز اسے ریک سے جوتے نکاتے دیکھ کر جھنجھلائے تھے۔

”یہ سب تمہیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ملازم ہیں نا۔ اور اشرف کو پتا ہے کہ مجھے کون سا سوٹ اور کون سی ٹائی چاہیے ہوتی ہے۔ آفس میں کیا پہننا ہے اور اگر لنگ یا ڈنر پر جانا ہے تو کیا پہننا ہے۔“

تب ریک میں براؤن شوز پر رکھے اس کے ہاتھ دیئے ہی رہ گئے تھے۔

بلیک ڈنر سوٹ کے ساتھ بلیک شوز پہن کر وہ بریف کیس اٹھا کر چلے گئے تھے۔

اسے سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ وہ کیسے، کس طرح فہد کی محبت میں خود کو مٹا ڈالے۔ وہ چاہتی تھی خود کو فہد کے قدموں میں بچھا دے اور فہد بے اختیار کہہ اٹھے۔

”ارے گل مہر تم تو سازی کی ساری محبت کے خیر میں گندھی ہو..... سرتا پا محبت.....

کیسے، کس طرح وہ فہد کو اپنی محبت دان کرے..... کیسے، کس عمل سے ظاہر کرے اپنی بے

پایاں محبت.....

آپا نے سنا تو بے حد ہنسیں۔

”جی مہر تم بالکل بالکل ہو۔ تم اس کی بیوی ہو، تم یہ سب نہ بھی کرو تب بھی.....“

”تب بھی کیسے آپا، کیسے ظاہر ہو کہ میں نے اس کی محبت میں کیا کیا..... نہ اس کا گھر

سنوارا کہ وہ پہلے ہی سجا سنوارا ہے، نہ کبھی کچھ پکایا کہ کک انگلش، چائیز، پاکستانی، ہندوستانی ہر

طرح کے کھانے بنانے میں ماہر ہے۔ نہ کبھی کپڑے استری کیے نہ.....“

میں بھی بھلا کیا شک تھا۔

اتنی دولت کے ہوتے اگر کہیں کوئی غریب گھر تک چلا آئے تو کہیں نہ کہیں کوئی کمی ضرور

ہوتی ہے..... لیکن یہاں تو کوئی کمی تھی ہی نہیں، فہد مرزا ہر لحاظ سے ایک بہترین انسان تھا۔

خوبصورت، اسماٹ، اعلیٰ تعلیم یافتہ، نہ کوئی عیب..... نہ برائی۔ آفس سے آ کر سیدھے گھر میں

بیٹھے مختلف چینلوں دیکھتے رہتے۔ سگریٹ تک تو نہیں پیتے تھے۔

آپا کو حیرت ہوتی۔ ”سچ گل مہر، اتنے دولت مند ہو کر بھی۔“

”ہاں آپا، بالکل سچ۔“

”وہ کتنی خوش قسمت ہے مہر، ایک وہ منیر تھا، پیٹ بھرنے کو پیسہ نہ تھا لیکن سگریٹ پر

سگریٹ پیسے جاتا تھا۔ مجھے تو شک تھا نہ بھی کرتا تھا۔ تب ہی تو مار پیٹ کرتا تھا۔“

”پر آپا، شروع شروع میں منیر بھائی بڑے داری صدقے جاتے تھے۔ یاد ہے نا، آپ

ذرا کچن میں میرے پاس آ کھڑی ہوتی تھیں تو وہ بھی چلے آتے تھے۔“

”ہاں جھوٹے چو نچلے۔“ آپا نے بیزاراری سے ہونٹ سیکڑے۔ ”شکر کرو فہد مرزا ایسا

چھچھورا نہیں ہے۔“

اس نے مڑ کر کمرے کی طرف دیکھا جہاں فہد اماں کے پاس بیٹھے تھے اور آپا کی بات کا

کوئی جواب نہ دیا۔ بس چپ چاپ آپا کو دیکھتی رہی تھی۔

کیا تھا اگر فہد مرزا بھی تھوڑا سا چھچھورا ہو جاتا منیر بھائی کی طرح، من کی پیاس تو بجھ

جاتی.....

”اور سب ٹھیک ہے نا؟“ آپا کو اس کا اترا چہرہ دیکھ کر پریشانی ہوئی۔

”سب ٹھیک ہے۔“ وہ ہولے سے ہنسی۔

”ساس تو ٹھیک ہے تا تیرے ساتھ؟“

”ہاں آپا بالکل ٹھیک۔“

ڈھونڈے سے بھی کوئی خرابی کہیں نہ تھی پھر بھی پتا نہیں کیوں دل تھا کہ لمحہ بہ لمحہ اس پر

برف گرتی جا رہی تھی حالانکہ شادی سے پہلے تو دل میں ہمہ وقت پھلجھڑیاں سی چھوٹی رہتی تھیں۔ یہ

احساس کتنا مغرور کر دینے والا تھا کہ اسے فہد نے پسند کیا تھا اور اپنی می سے خود کہا تھا کہ فریج کے

بجائے وہ اس پر بل کاٹن کے سوٹ والی لڑکی کو پروپوز کر دیں جو ملک گلریز کی یتیم بھتیجی ہے۔

اسے تو بچپن سے ہی محبت کی بہت ہوک، بہت حرص تھی۔ سعدیہ عزیز آفریدی کی

کہانیوں کی طرح وہ بھی گویا آدھی سانس لیتی تھی اور آدھی محبت کے لیے بچار کھتی تھی۔ زبردستی اماں

”تم شکر نہیں کرتیں اپنی خوش قسمتی پر کہ تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑتا۔“ آپ کہتیں۔

پھر ہفتوں وہ خود کو یہ یاد رکھتی رہتی کہ وہ تو بڑی خوش قسمت ہے۔

ان چھ ماہ میں فہد نے کتنی ہی بار اس کے لیے شاپنگ کی تھی۔ کتنے گفٹ دیئے تھے اسے۔ جیولری، پرفیوم، ڈریس..... حالانکہ پہلے ہی اتنا کچھ تھا اس کے پاس..... کئی بار وہ فہد کے ساتھ باہر کھانا کھانے گئی تھی۔ خوابناک ماحول میں اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے وہ بڑی پرامید نظروں سے فہد کو ٹکا کرتی۔ ان کہے جملے اس کے دل میں ٹھن ٹھن بجتے ہوئے گرتے رہتے اور فہد مرزا بڑی نفاست سے چھری کا ثنا ہاتھ میں لیے کھانا کھاتے ہوئے گاہے گاہے اسے دیکھتا۔

”ارے مہر آپ نے سوپ تو لیا ہی نہیں.....“

”یہ نوڈلز دو پران، یہاں کی خاص ڈش ہے.....“

اور وہ ان کہے جملے کی چاہ میں چپ چاپ پلیٹ میں وہ سب ڈالتی چلی جاتی جو فہد مرزا

کہتا۔

پھر ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کر کے کولڈ ڈرنگ پیتے ہوئے وہ بتاتا کہ اسے یہاں کا کھانا بہت پسند ہے، وہ دنیا کے کئی ملکوں میں گیا ہے لیکن ایسا ٹیسٹ کہیں نہیں ہے..... اور یہ کہ وہ یہاں اس ہوٹل میں کتنی بار پہلے اپنے دوستوں کے ساتھ آیا ہے۔

لیکن اس کی ساری باتوں میں وہ ایک جملہ کہیں نہ ہوتا جسے سننے کی اسے بہت چاہ تھی۔

”ایسی قابل رشک زندگی ہے تیری۔“ آپا سنتیں اور کہتیں۔ ”پھر تو کیوں روز بروز

مرجھاتی جا رہی ہے؟“

”پتا نہیں۔“

اسے تو خود بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ ہرگز رتا دن اسے برف کے تودے میں کیوں تبدیل

کرتا جا رہا ہے۔ کیا کمی ہے اسے

اس شاندار گھر میں، ایک شاندار مرد کے ساتھ.....

کمی تو کسی چیز کی نہ تھی، پھر بھی پتا نہیں کیوں اب تو دم گھٹنے لگا تھا اس کا.....

”کیا خیال ہے ایک ٹرپ یورپ کا نہ لگالیں؟“ ایک روز آفس سے آ کر بیڈ پر بیٹھے

ہوئے فہد مرزا نے کا۔

”جی۔“

”پانی کا گلاس لیوں تک لے جاتے ہوئے کسی قدر حیرت سے فہد مرزا نے اسے دیکھا۔

”میں نے جو کہا، آپ نے اس پر سر ہلا دیا۔ کیا آپ کی کوئی اپنی مرضی نہیں ہے؟“

”میری مرضی؟“ اس نے سوچا اور اپنی طرف دیکھتے فہد مرزا کو دیکھا۔

”میں..... میں کب رہی، میں تو کب سے تم ہو گئی ہوں۔“

جانے کب کا پڑھا جملہ ذہن کی زمین سے اڑ کر لیوں پر آ گیا۔

فہد مرزا نے ایک لمحہ کو اس کے جملے پر غور کیا اور پھر اسے اتنے زور سے ہنسی آئی کہ اچھو لگ گیا اور پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر رومال اسے آنکھوں سے بہتے پانی کو صاف کرتے ہوئے بھی بے تحاشا ہنس رہا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ! گل مہر آپ کوئی تیرہویں چودھویں صدی کی شوہر کی محبت میں ڈوبی خاتون نہیں ہیں۔ یہ اکیسویں صدی ہے اور آپ کی گردن پر دھرے اس بڑے سے سر میں آخر کچھ اپنی مرضی اور خواہش بھی تو ہوگی نا۔“

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس کی اپنی مرضی اور خواہش کیا ہے۔ وہ خود بھی ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پاتی تھی۔ بس کبھی کبھی شدت سے جی چاہتا تھا کہ وہ اس کے چھوٹے چھوٹے کام کرے۔ وہ سر درد کی شکایت کرے تو اس کا سر دبائے اور.....

”میرا خیال تھا ایک سی روٹین لائف نے بور کر دیا ہے تو ذرا چیلنج ہو جائے گا لیکن اگر آپ کی مرضی نہیں تو.....“

”نہیں نہیں، میں خود بور ہو گئی ہوں۔“

”او کے پھر آپ تیاری کریں۔“

اس روز وہ کئی بار اس کا جملہ دہرا کر محفوظ ہوا تھا۔ بھیکے من کے ساتھ وہ سارا وقت سوچتی رہتی تھی کہ اکیسویں صدی میں کوئی ”میں“ ”تم“ نہیں ہو سکتا.....

کیا اکیسویں صدی محبت سے خالی ہے..... تو پھر یہ کہانیوں میں صرف محبت ہی محبت کیوں ہے؟

شاید ہمارے اندر اس جذبے سے خالی ہو گئے ہیں۔ اس لیے ہم نے اپنے باہر لفظوں کے ڈھیر لگا رکھے ہیں تاکہ اندر کے خالی پن کا احساس نہ ہو۔

اس کے یورپ جانے کا سن کر سب نے ہی ایک بار پھر اس کی خوش قسمتی پر رشک کیا تھا، آپا نے مارے خوشی کے بے اختیار اسے چوم ہی لیا تھا۔

”دیکھ اللہ نے تیرے سارے خواب پورے کر دیئے۔“

”سارے خواب کہاں آپا۔“ اس کی آنکھوں میں مرجیں سی چھینے لگیں اور دل پر کن من بارش برسنے لگی۔ اگر وہ آپا کو بتائے کہ اس کا کون سا خواب پورا نہیں ہوا تو آپا اس کی احقانہ بات

ن کر سچ مچ سر ہی پیٹ لیں۔
برستی بارش میں فہد کے ساتھ مل کر بھینگنا..... یا ایک ہی پیالی سے باری باری چائے سب کرنا.....

چھوٹی سی بات پر بے تحاشا ہنسنا.....

ساتھ مل کر بیٹھنا.....

لڑنا جھگڑنا، روٹھنا.....

ہاتھ اس کا ہاتھ میں ہو اور یوں ٹہلنا، گھومنا.....

ٹھنڈے بخ موسم میں بارش میں بھینگتے آئیں کریم کھا کر واپس پر سرخ ناک کے ساتھ سوں سوں کرتے ہوئے آنا.....

اور فہد کے حرارت بھرے ہاتھ کی گرمی کو اپنے ہاتھ میں منتقل ہوتے محسوس کرنا..... اور پھر فہد کے کندھے پر سر رکھ کر، آنکھیں موند کر اس کے گلون کی خوشبو کو اپنے اندر بساتے ہوئے اس کی محبت بھری سرگوشیاں سننا.....

اس کی شرٹ کے بنٹوں سے کھیلنے ہوئے سرخ ہوتے رخساروں کے ساتھ اپنی محبتوں کا اعتراف کرنا.....

تب نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کچلتے ہوئے اس نے بمشکل ان آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا تھا جو دل کی دھرتی سے اٹھے، کب سے بادل بنے آنکھوں میں تیر رہے تھے۔
وہ اپنا یہ احمقانہ خواب کسی کو نہیں بتا سکتی تھی حتیٰ کہ آپا کو بھی نہیں..... اور شاید اس لیے وہ اب تک خود کو یقین نہیں دلا سکی تھی کہ وہ واقعی خوش قسمت ہے۔

پھر جب مختلف جگہوں سے ہوتے ہوئے واشنگٹن میں وہ فریجہ باجی کے گھر پہنچے تھے تو اسے لگتا تھا جیسے تھکن اس کے پورے وجود میں اتر چکی ہو جبکہ فہد بہت فریش تھے۔ اگر تائی اماں نے اتنی تاکید نہ کی ہوتی تو وہ نیو یارک سے ہی واپس چلی جاتی لیکن انہوں نے کہا تھا کہ فرجی سے ضرور مل کر آنا۔ اماں اور آپا نے بھی اصرار کیا تھا۔ آخر تائی کی وجہ سے ہی اسے اتنی شاندار زندگی جینے کو ملی تھی۔ پر یہ کیسا جیون تھا جس کی ابتدا میں ہی وہ تھک کر چور ہو گئی تھی۔

فریجہ باجی اس سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں اور عام سی شکل و صورت والے حماد صفر نے بھی خوش دلی سے ان کا استقبال کیا تھا۔

وہ حماد کو پہلی بار دیکھ رہی تھی جب فریجہ باجی کی شادی ہوئی تھی تو وہ فہد کے ساتھ شمالی علاقہ جات گئی ہوئی تھی۔ بس اچانک ہی ان کی شادی طے پا گئی تھی کیونکہ حماد کو مزید تعلیم کے لیے

امریکہ آنا تھا۔ پھر شادی کے بعد حماد تو امریکہ آ گیا تھا اور چند ماہ بعد فریجہ باجی بھی آ گئی تھیں۔
حماد کو دیکھ کر ایک بار پھر اس نے بڑی شد و مد کے ساتھ خود کو یاد کر لیا تھا کہ وہ یعنی گل مہر واقعی بڑی خوش قسمت ہے اور شاید پہلی بار وہ کچھ کچھ اپنے آپ کو یقین دلا پائی تھی کہ وہ واقعی خوش قسمت ہے کہ فہد مرزا جیسا شخص اس کا شریک حیات ہے۔ کیا ہوا جو وہ تیرہویں صدی کی محبتوں پر یقین نہیں رکھتا اور کیا ہوا جو آج تک اس نے گل مہر سے یہ نہیں کہا کہ تم میری محبت ہو اور میں تمہیں چاہتا ہوں۔ لیکن پھر بھی وہ خوش قسمت تو ہے نا.....

تب وجود میں اتری تھکن اسے کم ہوتی محسوس ہوئی اور لاؤنج میں بیٹھے فہد کو جس کا سارا دھیان ٹی وی کی طرف تھا، بتا کر کہ وہ ذرا فریجہ باجی کے پاس کچن میں جا رہی ہے۔ وہ ٹی وی لاؤنج سے نکل آئی۔

فریجہ باجی جلدی جلدی ڈش واشر سے برتن نکال رہی تھیں اور حماد کا ڈنٹر کے ایک کونے میں کھڑا سلا دینا رہا تھا۔

وہ تھکی اسے لگا جیسے اس کا کوئی خواب اس کے دل کی دہلیز پار کر کے فریجہ باجی کے کچن میں آ گیا ہو۔

پھر وہ آگے بڑھی۔ ”حماد بھائی آپ جانیں میں باجی کی ہیلپ کرواتی ہوں۔“
”اوہ نہیں بھئی، آپ مہمان ہیں۔“ حماد مسکرایا۔
”میرا خیال ہے حماد تم جا کر فہد کو کچنی دو میں اور مہر و باتیں بھی کریں گے اور کام بھی کر لیں گے۔“

”اوکے، جو مزاج یار میں آئے۔“ اس نے ہاتھ صاف کیے اور کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر پھر اسے مخاطب کیا۔ ”پھر گلہ نہ کرنا فرجی کہ تمہارے میکے سے مہمان آئے اور میں نے تمہاری ہیلپ نہیں کی۔“

”اب جاؤ بھئی فہد اکیلا بور ہو رہا ہوگا۔“

فریجہ نے اسے ہلکا سا دھکا دیا اور جواب میں اس نے اس کا ہاتھ مروڑ دیا۔

”سمجھ لوں گی تم سے۔“

گل مہر چپ چاپ سے اپنے دل میں برف اترتی محسوس کرتی رہی۔

”ہاں تو یہ تم ذرا چاول نکال کر بھگو دو اور بتاؤ، امی ابو گڑیا بنو کیسے ہیں سب؟“

”سب اچھے ہیں اور تائی اماں نے آپ کے لیے کچھ کپڑے وغیرہ بھی بھیجے ہیں۔ یہ

حماد بھائی.....“

”دراصل!“ جلدی جلدی کام کرتے ہوئے فریجہ نے بتایا۔ ”حماد کو جانا ہوتا ہے یونیورسٹی اور میں اس کے ساتھ ہی کام پر نکل جاتی ہوں تو بس مل جل کر کام کر لیتے ہیں دونوں۔“

”لیکن گھر میں تو آپ نے بھی کام نہیں کیا تھا فریجہ باجی۔“ گل مہر کو حیرت ہوئی۔

”ہاں لیکن محبت میں تو سب کچھ کر لیتا ہے بندہ۔ خیر تم سناؤ کیسے گزر رہی ہے؟ ویسے فہد بہت ناکس آدمی ہے۔ پتا ہے جب فہد کا پروپوزل آیا تو میں بہت پریشان ہو گئی۔ میں اور حماد ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن حماد ابھی اسٹینڈلش نہیں ہوا تھا اور اسے مزید تعلیم کے لیے اسٹینڈلش آنا تھا، یہ اس کا خواب تھا اور ہمارا خیال تھا کہ جب حماد سیٹل ہو جائے گا تو پھر پروپوزل کرے گا لیکن یہ فہد کا پروپوزل کوڈ پڑا۔ امی ابو تو بالکل تیار ہو گئے تھے اس پروپوزل کو اوکے کرنے کے لیے تب میں نے فہد سے مل کر اسے بتایا کہ میں حماد کو پسند کرتی ہوں اور اسے کبھی خوش نہ رکھ سکوں گی۔ تب فہد نے..... یعنی یہ تجویز میں نے ہی رکھی تھی فہد کے سامنے.....“

گل مہر کو لگا جیسے وہ جو ایک چھوٹا سا مان تھا اندر کہیں دل میں، جس کے سہارے وہ کبھی بھی خود کو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتی تھی کہ وہ خوش قسمت ہے..... وہ مان کہ شاید فہد مرزا کو اس سے محبت ہو گئی ہو.....

وہی پہلی نظر والی محبت.....

کہانیوں اور افسانوں والی.....

لیکن بس وہ اظہار کے لفظ اس کی جھولی میں نہ ڈالتا تھا.....

اسے تیرہویں اور چودھویں صدی کے محبتوں پر ہنسی آتی تھی۔ وہ ایک پریکٹیکل آدمی تھا لیکن اس نے اس نے گل مہر سے محبت تو کی تھی تب ہی فریجہ باجی پر اسے ترجیح دی تھی۔ اسے پسند کیا تھا۔ بس وہ لفظ برتنے کے معاملے میں کنجوس تھا۔

یہ احساس، یہ مان یکدم کرچی کرچی ہو گیا.....

وہ ساکت کھڑی تھی۔ وہ معمولی سا خیال، معمولی سا احساس جس پر پورے یقین کی عمارت کھڑی تھی..... اور جس کے سہارے اس نے اپنے سارے خوابوں کی موت کا دکھ برداشت کر لیا تھا.....

اندر ایک دم دل نے ان سارے خوابوں کی موت پر بین کیا اور محبت نے آنسو بہائے۔

”ویسے تم بہت خوش قسمت ہو مہر، فہد بہت اچھا ہے بہت نفیس انسان ہے۔ سچ اگر میں حماد سے محبت نہ کرتی ہوتی تو فہد جیسے شخص کا ساتھ پا کر خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی۔“

اور وہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی..... دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے ننگے فرش پر

بیٹھتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

بھلا وہ شخص جو محبت کو تیرہویں اور چودھویں صدی کی حماقت سمجھتا ہو.....

اور جو ”میں“ ”تم“ اور ”تم“ ”میں“ کے فلسفے پر قہقہہ مار کر ہنستا ہو.....

اور جس نے آج تک اپنی بیوی سے یہ نہ کہا ہو کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور کبھی اس کے سر کو کندھے سے لگا کر محبت بھری سرگوشیاں نہ کی ہوں.....

کبھی ایک ساتھ بارش میں نہ بھیگا ہو..... بلکہ بارش میں بھیگنے کے نقصان پر آدھ گھنٹہ لپکچر دیا ہو۔

کبھی لڑا جھگڑا نہ ہو.....

کبھی روٹھا نہ ہو..... کبھی منایا نہ ہو.....

بھلا اس کے ساتھ زندگی بتانے والی لڑکی کیسے خوش قسمت ہو سکتی ہے..... بھلے اس کے سامنے آسائشوں کے ڈھیر لگے ہوں..... اور بھلے اس نے اسے سونے چاندی سے لاد دیا ہو..... اور بھلے اس نے کبھی اسے ایک سخت لفظ تک نہ کہا ہو اور اس کے آرام کا بہت خیال رکھا ہو۔

بتائیں نا فریجہ باجی، وہ بھلا خوش قسمت ہو سکتی ہے۔“

اس نے روتے روتے چہرے سے ہاتھ ہٹایا۔ ”خوش قسمت تو آپ ہیں نا فریجہ باجی

آپ۔“

فریجہ ساس پین ہاتھ میں تھاے حیران سی اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

بھلا خالی خالی محبت بھرے لفظوں سے زندگی گزرتی ہے..... احق لڑکی نہیں جانتی کہ خوش قسمت تو وہ ہے، میں نہیں.....

اس نے اسٹور اور گھر پر مسلسل کام کر کر کے کھر درے ہو جانے والے ہاتھوں کو دیکھا۔

جب زندگی کی ضرورتیں منہ پھاڑے سامنے کھڑی ہوں تو محبت خود بخود در جاتی ہے۔ یا کہیں دبیز تہوں تلے دب جاتی ہے اور لفظ، صرف محبت بھرے لفظ کتنے کھوکھلے لگتے ہیں۔

اس نے ساس پین ایک طرف رکھا اور اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھتے ہوئے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔

”تم سچ کچی ہو گل مہر، بلیومی۔“

گل مہر سوسو کرتے ہوئے مسلسل سرنفی میں ہلائے جا رہی تھی۔

”نہیں فریجہ باجی میں نہیں، آپ..... آپ خوش قسمت ہیں۔“

اسے پورا یقین تھا اور اس یقین کو اس وقت اور تقویت ملی جب باؤ جی کی سب سے چھوٹی بیٹی سلمانہ نے اس کے کان میں آ کر سرگوشی کی۔

”شاہ جی آپ کی شادی کر رہے ہیں۔“

یہ خبر تو ابھی ابھی بی جان نے اسے سنائی تھی مگر کس کے ساتھ، یہ انہیں بھی علم نہ تھا۔

”آپ میری بھابی بنیں گی، عبدالقدوس بھائی کی دلہن۔“

”میں!“ مارے حیرت کے اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا..... ”باؤ جی کا وہ بے ڈول سردالاکم

عقل بیٹا۔“

اس نے مدد طلب نظروں سے بی جان کی طرف دیکھا جن کا سر جھک گیا تھا۔ اور

آنکھیں بے اختیار آنسو بہانے لگی تھیں۔ اور بی جان تو ہمیشہ کی بزدل تھیں، وہ بھلا کیا کر سکتی تھیں۔

تب وہ بی جان کو روتا چھوڑ کر یونہی تبتاتی ہوئی شاہ جی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”شاہ جی! میں کل صبح لاہور جا رہی ہوں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کے لیے۔“

”یہ خود سری ہے شاہ جی۔“ پاس بیٹھی بی بی جی نے کہا۔ ”ہمارے خاندان کی لڑکیوں نے

پہلے کہاں اتنا پڑھا ہے۔ اس نے ضد کی چودہ جماعتیں پڑھ لیں۔ بس بہت ہے۔ اب ہاتھ پیلے

کریں۔“

”ہاں یہی سوچا ہے۔“ شاہ جی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”خوش جمال ہم نے

تمہاری شادی عبدالقدوس کے ساتھ طے کر دی ہے۔ اگلے جمعے کو نکاح.....“

”مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔“ اس نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔

”اے ہے خوش جمال، پڑھ لکھ کر تو تیری مت ماری گئی ہے۔ کیسے پڑ پڑ بول رہی ہے

تو۔ کیا خرابی ہے عبدالقدوس میں؟ سیدھا سادہ معصوم تیرے چاچا کا بیٹا ہے۔ گھر والے ہی اسے ٹھکرا

دیں گے تو باہر سے کون رشتہ دے گا۔“

”وہ اتنا ہی اچھا اور سیدھا سادا ہے تو آپ کیوں نہیں بنت سکتی اس رشتہ اس سے طے کر

دیتیں، آخر کو وہ سلی آپا کے چاچا کا بھی بیٹا ہے۔“

اس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے سر اٹھا

کر شاہ جی کی طرف دیکھا جو سر جھکا کر تسبیح کے دانے گرا رہے تھے۔

”شاہ جی!“ اس نے مدد طلب نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے پکارا۔

مگر شاہ جی نے سر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا کیونکہ وہ اس سے نظر ملا کر بات نہیں کرتے

تھے جیسے ان کے دل میں چور ہو۔

نارسا

”عورت بھی گھاس کی طرح ہوتی ہے۔“

کشور ناہید نے کہیں لکھا تھا۔

”اور گھاس جب سر اٹھانے کے قابل ہوتی ہے تو کاٹ دی جاتی ہے۔“

برسوں پہلے خوش جمال نے پڑھا تھا مگر اسے یقین نہیں آیا تھا۔

”لو بھلا عورت اور گھاس کا کیا مقابلہ۔“ اس نے وہ وقت روزہ اخبار بی جان کے سامنے

پھینکتے ہوئے کہا تھا۔ ”گھاس تو پاؤں تلے روندی جاتی ہے اور بڑے شاہ جی کہتے ہیں کہ ہمارے

پیارے نبی ﷺ نے فرمایا تھا..... عورتیں آگینہ ہوتی ہیں۔“

تب اسے کشور کی بات کتنی غلط لگی تھی۔ لیکن جب اس نے سر اٹھا کر جینے کی کوشش کی تو

اسے احساس ہوا تھا کہ کتنے بے شمار ہاتھ ایک ساتھ اسے کاٹنے کے لیے بڑھ آئے تھے اور یہ تو اس

کا حوصلہ اور ہمت تھی کہ وہ پھر بھی سر اٹھائے کھڑی تھی اور جینے کی کوشش کر رہی تھی ورنہ یہ سب جو

برسوں سے اس کا استحصال کر رہے تھے، اسے مار ڈالتے۔ آج صبح ہی تو بی جان نے اسے بتایا تھا

کہ شاہ جی نے اس کے لیے کیا سوچا ہے۔

”وہ کون ہوتے ہیں میرے لیے کچھ سوچنے والے؟“

”وہ تیرے تایا ہیں۔ تیرے قانونی وارث۔“ بی جان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی

تھی۔ ”تیرے لیے بہتر ہی سوچیں گے۔“

”آج تک انہوں نے ہماری بہتری کے لیے کیا سوچا ہے۔ بی جان۔ جو آج.....؟“

”نہیں، آج بھی انہوں نے جو کچھ سوچا ہے، یقیناً اس میں انہوں نے اپنی ہی بہتری

سوچی ہوگی۔“

اس کی جائیداد ہڑپ کرنے کا چور۔

اس کا حق غضب کرنے کا چور

اور اس کے ساتھ زیادتی کرنے کا چور

تب ایک لمحہ انہیں دیکھنے کے بعد وہ واپس پلٹ آئی بی جان اسی طرح بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ اس نے آتے ہی سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ تو ان کے آنسو اور بھی تیزی سے بہنے لگے اور رنگ زرد پڑ گیا۔

”شاہ جی تو ناراض ہو گئے ہوں گے؟“ انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو وہ جھنجلا گئی۔

”تو آپ ساری زندگی ان کی ناراضی سے ڈرتی رہیں، چاہے وہ ہمیں ٹکڑے ٹکڑے

کر کے ہمارا گوشت کدوں کے آگے ڈال دیں۔ کیا دیا ہے آج تک انہوں نے ہمیں؟“

”تو تو ناشکری ہے خوش جمال۔“ انہوں نے اپنے آنسو پونچھے۔ ”شاہ جی نے پناہ دے

رکھی ہے ہمیں۔ یہ گھر اور اپنا تحفظ دیا ہے۔“ نکال دیتے تو کیا کر لیتی میں۔“

”اس گھر پر ہمارا حق نہیں تھا کیا۔ کیا میرا باپ بڑے شاہ جی کی اولاد نہیں تھا؟“

”تیرے ساتھ بحث کون کرے خوش جمال! حق والا ہی نہ رہا تو حق کیسا۔“

”تو پھر۔“ آنسو اس کی بھی پلکوں کا بند توڑ کر باہر نکل آئے۔ شکر گزاری کے طور پر کر

دیجئے اپنی بیٹی کو قربان۔ اس عبدالقدوس کی دلہن بنانے سے تو بہتر ہے کہ آپ خود ہی مجھے زہر دے دیجئے۔“

اور بی جان نے لپک کر اسے گلے لگا لیا۔

”میں کیا کروں میری جان مجھے بتا؟“

”آپ کچھ بھی نہ کریں بی جان، میں خود سب کچھ کر لوں گی۔ بس آپ اتنی بزدل نہ

ہیں۔ بس تھوڑی سی اور تکلیف ہے۔ میں نوکری کر لوں گی اور آپ کو یہاں سے لے جاؤں گی۔

میں آپ کے دل میں چھپے دکھوں کے ایک ایک کانٹے کو چن لوں گی، بس آپ مجھے بے حوصلہ نہ کیا کریں۔“

”اور وہ تیرے شاہ جی اور باؤ جی.....“

”میں ان سب سے خود دبٹ لوں گی۔“

”وہ تیرے چاچا اور تایا ہیں۔“

”جاتی ہوں۔“

اور اس نے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے اور فوراً چائے کی پیالی بنا لائی۔

”بی جان آپ کچھ نہ سوچیں۔“ اس نے التجا کی۔

لیکن پھر بھی ان کی پیشانی پر تردد تھا اور وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ بچپن سے

ہی جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اس نے بی جان کو یونہی گہری سوچوں میں ڈوبے

ہوئے دیکھا تھا۔ وہ صبح سے شام تک کام میں لگی رہتی تھیں۔ اتنا بڑا خاندان تھا اور اتنے بڑے

خاندان کا ناشتا کھانا سب وہ خود تیار کرتی تھیں۔ صبح سویرے جب وہ ابھی سو رہی ہوتی تھی تو بی

جان اٹھ کر اندر حویلی میں آ جاتی تھیں۔ وہ خود ہی اٹھ کر منہ ہاتھ دھوتی تھی اور پھر چلیں گھسیٹتی ہوئی

حویلی کے باورچی خانے میں پہنچ جاتی تھی جہاں بی جان پراٹھے پکاتے پکاتے ایک نظر اسے دیکھتی

تھیں۔

”تو اٹھ گئی؟“

وہ سر ہلا کر وہیں دہلیز پر بیٹھ جاتی تھی۔ اور بی جان پھر اس کی طرف سے منہ موڑ کر ناشتا

بنانے لگتی تھیں۔ اور پھر سب کو ناشتا دے کر آخر میں وہ دونوں ماں بیٹی وہیں باورچی خانے میں بیٹھ

کر ناشتا کر لیتیں۔ اسی طرح دوپہر اور رات کا کھانا بھی وہ الگ اپنے کمرے میں بیٹھ کر کھاتی تھیں،

جب کہ باقی سب لوگ بڑے کمرے میں اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔ درمی پر دسترخوان بچھا دیا جاتا تھا

اور پھر بی جان کھانا لگا کر گرم گرم پھلکے بنائے جاتی تھیں اور سب سے آخر میں ایک پلیٹ میں سالن

ڈال کر اور دو پھلکے دسترخوان میں لپیٹ کر وہ اپنے کمرے میں آ جاتیں۔

”ہم ادھر کھانا کیوں نہیں کھاتے سب کے ساتھ بڑے کمرے میں بیٹھ کر؟“ باشعور

ہوتے ہی اس نے بی جان سے پوچھا تھا۔ ”کیا ہم ان کے نوکر ہیں؟“

”نہیں۔ نوکر ایسے ہوتے ہیں۔ شاہ جی تیرے سگے تایا ہیں اور باؤ جی چچا ہیں تیرے۔“

”پھر ہم..... ہم کیا ہیں، بتائیے بی جان۔ ہم کیا ہیں؟“ وہ بدستور الجھن کا شکار تھی۔

”جب کر خوش جمال۔ زیادہ سوال نہ کیا کر۔“ بی جان اس کے سوالوں سے اور اس کی

ذہانت سے ڈرتی تھیں۔ ”لڑکیوں کو زیادہ ذہین نہیں ہونا چاہیے۔“

”کیوں؟“ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر پوچھتی۔

”بس کہنا ذہین لڑکیاں زیادہ دکھ اٹھاتی ہیں۔“

”یہ کوئی کلیہ نہیں ہے اور میں تو اپنے بابا کی طرح ذہین ہوں اور اپنے بابا کی طرح بہت

سارا پڑھوں گی اور پھر ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ اپنا گھر الگ بنائیں گے اچھا سا۔ اور وہاں آپ کو

دور درجن لوگوں کے لیے روٹیاں نہیں پکانا پڑیں گی، ہم ایک نوکر رکھ لیں گے۔“

بہت چھوٹی عمر میں ہی اس نے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے اور بہت سی باتوں کی

آگہی اسے ہوگئی تھی۔

اس اتنی بڑی حویلی کے ایک کونے میں بنا ایک کمرے والا یہ کوارٹر جو شاید کسی زمانے میں نوکروں کے لیے بنایا گیا ہوگا، اب ان کی رہائش گاہ تھا اور اسے وہ انکیسی کا نام دیتی تھی۔ ایک کمرہ چھوٹا سا برا آمدہ اور محض، ایک غسل خانہ اور باورچی خانہ۔

”کیا بابا کے حصے میں اتنی ہی جگہ تھی؟“ کئی بار اس نے بی جان سے پوچھا تھا، اور بی جان نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

”چپ کر، یہ بھی شاہ جی کی مہربانی ہے۔“

اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ بی جان اتنی بزدل کیوں ہیں اور وہ سر اٹھا کر اپنا حق کیوں نہیں مانگتیں۔ اور جب وہ کوئی ایسی بات کرتی تھی تو بی جان رونے لگتیں اور وہ ان کی خاطر چپ کر جاتی تھی ورنہ اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی دن شاہ جی کا گریبان پکڑ لے اور پوچھے کہ کیا اس کے بابا کا کوئی حق تھا۔ اس نے شاہ جی سے تو کچھ نہ پوچھا تھا لیکن بی بی جی اور چاچی اور گھر کے دوسرے افراد خود ہی اسے احساس دلاتے رہتے تھے کہ اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ کبھی وہ جو بی جان کی مدد کے لیے اندر حویلی میں چلی جاتی تو بڑے سرخ پایوں والے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے چھالیا کرتے ہوئے بی بی جی چاچی سے کہتیں۔

”صبر کو تو ہمیشہ سے شوق تھا پڑھنے کا، اپنی ساری جائیداد فروخت کر کے تعلیم پر خرچ کر دی اور شاہ جی نے کتنا سمجھایا تھا کہ پڑھ لکھ کر وقت ضائع مت کرو۔ پر صبر تو ہمیشہ کا ضدی تھا۔ آج جائیداد ہوتی تو بیوی بیٹی کے کام آتی۔“

”ہاں۔“ چاچی ہاں میں ہاں ملائیں۔ ”یہ تو شاہ جی کی مہربانی کہ انہوں نے سر چھپانے کو ٹھکانا دے دیا۔“

”یوں نہ دیتے بھی۔“ بی بی جی کن انکھیں سے اسے دیکھتیں۔ ”آخر بھائی کی اولاد کو دھکے کھاتے بھی تو نہیں دیکھ سکتے تھے نا۔“

اور وہ چڑ کر سوچتی کہ لاکھوں کروڑوں کی جائیداد کیا بابا کی تعلیم پر خرچ ہوگئی تھی۔ اور بابا نے کون سے غیر ممالک سے تعلیم حاصل کی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگلش لٹریچر میں ایم اے ہی تو کیا تھا اور پھر وہاں ہی کسی کالج میں لیکچرر شپ اختیار کر لی تھی۔ وہ تو لٹریچر آدی تھے۔ انہیں زمینوں جائیدادوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ اور شاہ جی اور باؤ جی نے مل کر یہ جائیداد ہتھیالی تھی۔ مگر وہ یہ بات شاہ جی سے کہہ نہیں سکتی تھی کیونکہ بی جان کو یہ پسند نہ تھا۔ سو وہ چپ چاپ بی جان کا ہاتھ بٹائے جاتی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ اتنے بڑے کنبے کا کھانا پکانا اب بی جان کے بس میں نہیں

رہا تھا، وہ تھک جاتی تھیں۔ اگرچہ ظاہر نہیں کرتی تھیں۔

اس حویلی میں شاہ جی تھے، اس کے بڑے تایا۔ بی بی جی تھیں، شاہ جی کی بیوی اور پھر ان کی چھ اولادیں، چار بیٹے دو بیٹیاں اور باؤ جی تھے۔

اس کے چچا اور چاچی تھیں اور ان کے سات بچے تھے۔ سب سے بڑا عبدالقدوس جو اینارمل تھا اور پھر بے جی تھیں۔ اس کی پھوپھی جو جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں اگرچہ ان کی ذاتی جائیداد تھی اور بے شمار زمینیں تھیں مگر اپنے تینوں بچوں کے ساتھ وہ ادھر ہی رہتی تھیں اور ان کی زمینوں اور جائیداد کی دیکھ بھالی شاہ جی اور باؤ جی ہی کرتے تھے۔ اور پھر اوپر کا اور باہر کا کام کرنے والے دو چار نوکر تھے۔

اسے یہ گھر اور اس کا ماحول پسند نہ تھا۔

اس گھر کے سارے لڑکے نکلے اور بے کار تھے۔

کچھ پڑھ رہے تھے، کچھ نے پڑھائی چھوڑ رکھی تھی۔ اور جو پڑھ رہے تھے ان کے مشاغل بھی وہی تھے۔ پتنگ بازی اور کبوتر بازی۔ شاہ جی اور باؤ جی نے انہیں کبھی منع نہیں کیا تھا۔ اس گھر کے لڑکوں کو کام کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ زمینوں سے اتنا کچھ آجاتا تھا کہ سب عیش کرتے تھے۔ گھر میں دو دو گاڑیاں تھیں، لڑکوں کے پاس اسکوٹر تھے۔

لڑکیاں بھی ان پڑھ اور جاہل تھیں۔ سلمیٰ آپا نے پانچ جماعتیں پڑھی تھیں، جبکہ ہاجرہ نے چھٹی میں اسکول چھوڑ دیا تھا اور صالحہ نے بڑی مشکل سے آٹھویں تک اپنی گاڑی کھینچی تھی۔ اور پھر امتحان سے چند دن پہلے بیمار پڑ کر جان چھڑا بیٹی تھیں۔ چھوٹی لڑکیاں ابھی دوسری تیسری میں پڑھ رہی تھیں۔ سلمیٰ آپا، ہاجرہ، صالحہ دن میں چار سوئی اور دو سوئی کی چادروں پر کڑھائی کرتیں اور دنیا جہان کے فضول قصے سناتی رہتیں۔ خوش جمال کا دل ان کی محفل میں نہیں لگتا تھا۔

بی بی جی اور چاچی جی کے پاس وقت بے وقت محلے کی عورتوں کا جھکھار ہوتا۔ کسی کو اپنی ساس کا وجود ٹھکنا تھا اور کسی کو نندیں زہر لگتی تھیں۔ اور کوئی دیور سے شامی تھی۔ تو کسی کو شوہر پر قابو پانے کے لیے تعویذ چاہیے ہوتا تھا۔

اور بی بی جی لکڑی صندوچی سے تعویذ نکال نکال انہیں دیتی رہتی تھیں۔

اور وہ حیرت سے بی جان سے پوچھتی۔

”یہ ساری عورتوں کو اپنی ساس اور نندوں سے اتنی شکایتیں کیوں ہوتی ہیں؟“ اس ایک شخص کے طفیل، اس ایک شخص کے صدقے میں کیا وہ اس سے منسلک اس کی ماں اور بہنوں کو قبول نہیں کر سکتیں؟“

”خوش جمال! خوش جمال مت سوچا کر زیادہ۔“ بی جان اس کے سوالوں سے جھنجھلا جاتیں اور وہ بی جان کو ”سگ لیلیٰ“ کا فلسفہ نہ سمجھا پاتی۔

”خوش جمال تو بھی کچھ کڑھائی سلائی سیکھ لے۔“ بی جان نے کئی بار میز پوش اور سوئی دھاگا دے کر سلائی کے پاس بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ وہاں سے اٹھ آتی تھی۔ اسے سلائی کڑھائی سیکھنے سے نفرت نہ تھی، بس اسے تو سلائی، ہاجرہ اور ان کی سہیلیوں کی باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ پتا نہیں کیسی باتیں کرتی تھیں وہ عجیب عجیب۔ اور وہ میز پوش اور سوئی دھاگا پھینک کر کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی۔ اسے پڑھنا تھا بہت اور ماں کو اس عذاب سے نکالنا تھا۔ ان کے جھکے ہوئے سر کو وہ اٹھا ہوا دیکھنے کی متمنی تھی۔ اتنی بڑی حویلی نہ سہی ایک جھوٹا سا خوبصورت گھر بنانے کی خواہش اس کے دل میں ہمہ وقت ہلکورے لیتی رہتی تھی۔ اور اسی خواہش نے تو اسے منہ زور بنا دیا تھا۔ جب بی جان نے آٹھویں کے بعد اسے شاہ جی کا حکم سنایا کہ بس اب وہ گھر بیٹھے تو وہ پھر گئی۔

”مجھے پڑھنا ہے۔“

”کیا کرے گی پڑھ کر تو.....؟“ بی جان بے بس ہو کر کہتیں۔

وہ ابھی صرف چودہ برس کی تھی لیکن اس کے اندر اعتماد تھا اور بی جان جانتی تھیں کہ وہ شاہ جی سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوتی اور وہ وہی کرے گی جو کہہ رہی ہے۔

”دیکھ، تیرے شاہ جی کے پہلے ہی ہم پر بہت احسان ہیں۔ وہ کب تک تیری تعلیم کا خرچ برداشت کریں گے۔ میں ان پر اتنا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی۔“

”تو مت ڈالیں بوجھ، میں کب کہہ رہی ہوں کہ میری تعلیم کا خرچ وہ برداشت کریں۔ اسکول میں یتیم بچیوں کے لیے خصوصی فنڈ موجود ہے، میں وہاں درخواست دے دوں گی۔“

”تو تو وہاں سے پیسہ لے گی، لوگ کیا کہیں گے، شاہ جی کی بھتیجی اور“ بی جان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”کہتے رہیں مگر بی جان، میں نے پڑھنا ہے۔ اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو شام کو میں ایک دو گھروں کے برتن دھو لوں گی۔ لیکن میں پڑھوں گی ضرور۔“

اور یہ دونوں باتیں ہی قابل قبول نہ تھیں۔

”بچی ہے شاہ جی۔“ بی جان نے روتے روتے کہا۔ ”خند پر اڑ گئی ہے۔ باپ کی طرح

اسے بھی علم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔“

اور شاہ جی کو اس کے شوق سے زیادہ اپنی عزت کا خیال تھا۔ اور اس سے تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ چار گھروں کے برتن ہی دھونے لگتی۔ سوانہوں نے اجازت دے دی اور یوں اس نے میٹرک

کر لیا۔ اور اس گھر میں یہ اعزاز صرف عبدالعلی کو حاصل تھا کہ اس نے پچھلے برس تین سال مسلسل فیل ہونے پر تھرڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا۔ اور اس نے ضلع بھر میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ اسکول کی طرف سے اسے گولڈ میڈل دیا گیا تھا۔

اور ایک بار پھر اس کی پڑھائی کا مسئلہ گھر میں عراق ایران جنگ کی طرح طول پکڑ گیا تھا۔

”کیا کرے گی اتنا پڑھ لکھ کر؟“ بی جان اسے سمجھاتیں..... ”لڑکیوں کے لیے دس جماعتیں بہت ہیں۔ پڑھی لکھی لڑکیوں کی زندگی کامیاب نہیں ہوتی۔ جاہل لڑکیاں زیادہ کامیاب زندگی گزارتی ہیں۔ انہیں کم دکھ ملتے ہیں۔“

شاہ بی جان سچ کہتی ہوں، ان کے سامنے ان کی اپنی زندگی کے تجربے تھے لیکن وہ ان کا فلسفہ ماننے کو تیار نہ تھی۔ یہ صحیح کہ جاہل لڑکیاں گھریلو سیاست کے جو داؤ پیچ جانتی ہیں، پڑھی لکھی لڑکیاں تو ان کا عشر عشر ہی نہیں جانتیں۔ اس نے خود دیکھا تھا بی بی جی کے پاس جو عورتیں آتی تھیں وہ ان پڑھ ہوتی تھیں۔

لیکن ان کی باتیں..... تو بہ شوہر کو قابو میں کرنے کے گریڈ کو ماں سے اور بھائی کو بہنوں سے بدظن کرنے کے طریقے انہیں ازبر ہوتے تھے۔

وہ گھریلو سیاست کی ماہر سیاست داں ہوتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ پڑھنا چاہتی تھی کیونکہ اسے کچھ بننا تھا لہذا اسے بہت جنگ کرنا پڑی۔

بی بی جی اور چاچی کے طنز۔

سلائی اور ہاجرہ آپا کے وار۔

عبدالعلی اور عبدالغفور کی تمسخر اڑاتی نظریں۔

شاہ جی اور باؤ جی کا غصہ۔

اور سب سے بڑھ کر بی جان کے آنسو۔

مگر اس نے ان سب کو شکست دی تھی۔

اور اب جب وہ بی بی جی کی طرح تھی تو جانے شاہ جی کے دل میں کیا خوف آسایا تھا کہ وہ اس کے پر کاٹنا چاہتے تھے اور آج ہی کشورناہید کی اس بات کا مطلب جو اس نے برسوں پہلے پڑھی تھی، اس پر واضح ہوا تھا۔ وہ سر اٹھانے کے قابل ہو گئی تھی۔ اس لیے اسے کانٹے کی تدابیر کی جارہی تھیں لیکن وہ کسی کو اس کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

”بی جان۔“ اس نے گہری سوچوں میں ڈوبی بی جان کی طرف دیکھا۔ ”آپ فکر کیوں کرتی ہیں؟“

”ارے کیسے فکر نہ کروں، طوفان آ جائے گا۔“

”آئے دو بی جان۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

اسے آنے والے طوفان کی پروا نہیں تھی کیونکہ اسے اپنے حوصلوں پر فخر تھا لیکن جب طوفان آیا تو اس کے قدم بھی ذرا کی ذرا ڈگمگائے مگر پھر اس نے اپنے پاؤں زمین پر مضبوطی سے جماتے ہوئے سہلی سے کہا۔

”سہلی آپا، شاہ جی سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ زمین کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں تو مجھے کسی چیز کی چاہ نہیں۔ میں اپنے ہر حق سے دستبردار ہوتی ہوں اور انہیں تحریر دے دیتی ہوں کہ میرا کوئی حق نہیں ہے ان پر یا کسی بھی چیز پر لیکن مجھے عبدالقدوس سے شادی نہیں کرنا ہے اور اگر میرے ساتھ زبردستی کی گئی تو میں عین نکاح کے وقت انکار کر دوں گی یا پھر زہر کھا لوں گی اور لکھ جاؤں گی کہ مجھے شاہ جی نے زہر کھانے کے لیے مجبور کیا ہے۔“

”عبدالقدوس نسبی تو عبدالعلی۔“ شاہ جی نے اس مسئلے کا حل یوں نکالا۔ وہ ہر صورت میں اس کی پروا ختم کرنا چاہتے تھے۔

”نہیں، اس گھر کے کسی لڑکے سے بھی مجھے شادی منظور نہیں۔“ اس نے گویا فیصلہ سنا دیا۔ ”مجھے یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہے، میں اپنے بابا کی طرح انگلش میں ایم اے کروں گی اور پھر کالج میں پڑھاؤں گی۔“

”کیا کچھ نہ ہوا، کیسے کیسے اسے روکنے کی کوشش نہ کی گئی۔ اور کتنا دباؤ اس پر ڈالا گیا۔“

مگر آخر میں جیت اسی کی ہوئی۔

شاہ جی نے اس پر لعنت بھیج دی۔

بی بی جی نے اسے آوارہ، مرتد اور نہ جانے کیا کیا خطاب دے ڈالے۔

”وہ تو عبدالقدوس اور عبدالعلی کے قابل ہی نہ تھی۔“

چاچی جی نے کہا۔

”وہ تو شاہ جی، عبدالصمد کی بیٹی سمجھ کر اس پر ترس کھا رہے تھے۔“ بے جی کہاں چپ

رہنے والی تھیں۔

”تو بے سید گھرانے کی لڑکی اور لڑکوں کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھے گی۔“ بی بی ہر آئے

گئے کے سامنے کھڑا رہیں۔

شاہ جی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی مزید تعلیم کے لیے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کر سکتے اس طرح شاہ جی نے اپنا تحفظ کا ہاتھ اس کے سر سے اٹھالیا تھا۔

بی جان کانپ کانپ کر روتیں اور اس کے آگے ہاتھ جوڑتیں۔

”سوچ لے خوش جمال، اب بھی سوچ لے۔ عبدالعلی میں کیا برائی ہے۔ عبدالقدوس تو دیوانہ تھا کم عقل تھا، پر عبدالعلی تو دس جماعت پاس ہے۔“

”بس بی جان، آپ کچھ نہ کہیں۔“ وہ ان کے جڑے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتی، ہونٹوں سے چھوتی۔

اور پھر بی جان نے اس کے پختہ ارادوں کے آگے ہار مان لی۔

اور اس کی شادی کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا اپنا زیور فروخت کر کے پیسہ پیسہ اس کے نام بینک میں جمع کرادیا اور وہ یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے لاہور چلی آئی۔

”میں نے کہیں پڑھا تھا کہ عورت گھاس کی طرح ہوتی ہے اور گھاس جب سرائھانے کے قابل ہوتی ہے تو کاٹ دی جاتی ہے۔ اور میں نے اس بات کو غلط ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کی ہے حالانکہ میرے راستوں کو کانٹوں اور پتھروں سے پاٹ دیا گیا تھا لیکن میں نے خود کو کٹنے نہیں دیا۔“

”اور میں نے بھی۔“ سومیہ حیات نے پیکنگ کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے لوگوں نے بھی مجھ پر زندگی کے دروازے بند کرنے کی پوری کوشش کی۔ تمہیں پتا تو ہے سب۔“

”ہاں۔“ خوش جمال نے ہاتھوں کی کٹوریوں میں ٹھوڑی ٹیکتے ہوئے سومیہ کو دیکھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر لوگ، ہمارے رشتے دار اور عزیز یہ کیوں چاہتے تھے کہ ہم چاروں بہنیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہیں اور ہم لوگ بھوکے مریں۔“

”ہاں، پتا نہیں، لوگوں کو اور خاص طور پر عزیزوں اور رشتے داروں کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے، یہ کسی حال میں بھی خوش نہیں رہتے۔ تم لوگ کچھ بھی نہ کرتے تب بھی یہ لوگ باتیں کرتے

کہ چار جوان بیٹیاں ہیں، محنت کیوں نہیں کرتیں اور اب تم لوگ جدوجہد کر رہی ہو تو بھی۔“

”اور میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ میں کبھی ہمت نہیں ہاروں گی۔ مجھے اپنے ابا کا سہارا بننا ہے، ان کا بیٹا بن کے دکھانا ہے۔“ سومیہ نے بیک کی زپ بند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا

”اور اب مشکل وقت گزر گیا ہے۔ بالآخر یہ دو سال خوش جمال میں بتا نہیں سکتی تمہیں؛ میں نے کتنی اذیت اٹھائی ہے اور کیسی کسی باتیں برداشت کی ہیں۔ جب کبھی چھیٹیوں میں گھر جاتی تھی تو میری

پھوپھیاں اور میرے چچا، میری خالائیں اور میری ممانیاں ایسی ایسی باتیں کرتی تھیں کہ کبھی کبھی تو

میں ہمت ہارنے لگتی تھی۔“

اور وہ خود..... اس نے کچھ کم اذیت اٹھائی تھی۔ شاہ جی اور باؤ جی تو اس سے کلام ہی نہیں کرتے تھے۔ بے جی، چچی جی اور بی بی جی کی باتیں اس کا جی جلاتی تھیں۔ اور عبدالحی کی طنزیہ نظریں اور تسخر اڑاتی باتیں اور پھر صالحہ اور سلمیٰ آپا کی کھوج لگاتی نظریں اور ان کے فضول سوال۔

”کس کس لڑکے سے دوستی ہوئی؟“ سلمیٰ آپا پر سے نیچے تک اسے کھوجتی نظریں سے دیکھتی تھیں۔

”کسی سے نہیں۔“ وہ تخل کا مظاہر کرتی۔

”جھوٹ نہیں بولو۔“ صالحہ اس کے قریب کھسک آتی۔ ”بچی بتاؤ نا۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی۔“

”میں وہاں لڑکوں سے دوستیاں کرنے نہیں گئی، پڑھنے گئی ہوں۔“

”سب پڑھنے ہی تو جاتے ہیں مگر دوستی تو ہو جاتی ہے۔“ صالحہ وی سی آر پر دیکھی جانے والی فلمی معلومات کا رعب جھاڑتی۔

”ایسے ہی تو ہوتا ہے۔ کتنا مزہ آتا ہوگا تمہیں اپنے کسی کلاس فیلو کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھ کر سیر کو جانے میں۔“ سلمیٰ آپا چٹخا رالیتیں تو وہ جھنجلا کر ان کے پاس سے اٹھ آتی تھی۔

اور پھر سب سے بڑھ کر بی جان کے آنسو تھے جو اس کے قدموں کی زنجیر بن جاتے تھے لیکن وہ ہمت کر کے ہر بار آنسوؤں کی یہ زنجیر توڑ کر واپس آ جاتی تھی۔

”لیجئے جناب، ہماری تیاری تو ہو گئی۔“ سومیہ اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ ”خوش جمال، بہت یاد آؤ گی۔ یہ دو سال جو تمہارے ساتھ گزارے ہیں، بہت اچھے گزارے۔“ سومیہ نے اداسی سے کہا۔ تو وہ بھی اداس ہو گئی۔

”ہاں، تم بھی مجھے بہت یاد آؤ گی۔“

ان دو سالوں میں سوائے سومیہ کے اس کی کسی سے دوستی نہیں ہوئی تھی۔ سومیہ اس کی روم میٹ بھی تھی۔ تاہم شروع میں تو بہت دن تک علیک سلیک سے آگے بات نہیں بڑھی تھی مگر پھر جلد ہی خوش جمال کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ اور سومیہ ایک جیسی ہیں۔ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ دونوں ایک ہی مشکل راستے پر چل کر یہاں تک پہنچی ہیں۔

سومیہ کا باپ سینئر کلرک تھا۔ اس کی چار بہنیں تھیں اور ایک بھائی جو ابھی صرف سات سال کا تھا اور بہت مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اس کی بڑی بہن نے میٹرک کے بعد پی۔ ٹی سی

کر کے ایک سکول میں نوکری کر لی تھی کیونکہ کمانے والا ایک ہی تھا اور کھانے والے آٹھ۔ رشتے داروں نے بہت باتیں کیں۔ بیٹی کی کمائی کھانے کے طعنے دیئے اور اب سومیہ تھی جو تعلیمی منازل طے کرتی ہوئی یہاں تک آ پہنچی تھی۔ رشتے داروں نے اس کے راستے میں رکاوٹوں کی دیواریں نہیں، پہاڑ کھڑے کیے لیکن اس کی آنکھوں میں ایک روشن مستقبل تھا۔ وہ اپنے گھر کو خوش حال دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ ان ساری رکاوٹوں کو پھلانگ کر یہاں تک آ پہنچی تھی۔ سودوئوں میں بہت گہری دوستی ہو گئی تھی۔

وہ سومیہ کے علاوہ کسی سے دوستی نہ کر سکی تھی۔ حالانکہ ہر طرح کی لڑکیاں تھیں۔ پڑھا کو لڑکیاں بھی اور وہ بھی جو صرف انجوائے کرنے آتی تھیں۔ ایک دو پیریڈ انینڈ کیے، کوک یا چائے پی اور ہنس کھیل کر چلی گئیں۔ ہر طرح کے طالب علم تھے۔ خود اس کے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بہت اچھے لڑکے اور لڑکیاں تھیں لیکن وہ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ البتہ یہاں آ کر اس کے تجربات اور علم میں بہت اضافہ ہوا تھا اور اس نے بی جان کو لکھا تھا۔

”بی جان۔ دنیا بہت وسیع ہے اور اس وسیع دنیا میں بھانت بھانت کے لوگ بستے ہیں۔“

اور انہی بھانت بھانت کے لوگوں میں راغب ارمان بھی تھا۔ یونیورسٹی میگزین کے اردو حصے کا ایڈیٹر۔

پہلی بار سفیر رحمن نے اسے اس سے متعارف کرایا تھا۔ سفیر انگلش حصے کا ایڈیٹر تھا اور اس نے نوٹس پڑھنے کے بعد ایک آرٹیکل اور دو نظمیں

سفیر کو چھپنے کے لیے دی تھیں، جنہیں سفیر نے بے حد پسند کیا تھا۔ ”یہ خوش جمال ہے۔“ اس روز لاہریری سے نکلتے ہوئے سفیر اسے مل گیا تھا اور اس نے اپنے ساتھ موجود راغب سے اس کا تعارف کروایا تھا۔

”آپ واقعی خوش جمال ہیں۔“ راغب نے زیر لب کہا تھا لیکن اس نے سن لیا اور آہستگی سے تھینک بولا۔

”یہ اردو حصے کے انچارج ہیں۔“ سفیر نے گویا پورا تعارف کرایا۔ ”میں نے آپ کی نظمیں پڑھی ہیں، بہت خوبصورت ہیں، آپ اردو میں کیوں نہیں لکھتی؟“

”کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”کوئی غزل، کوئی نظم، کوئی کہانی یا مضمون۔“

”کوشش کروں گی۔“ اس نے آہستگی سے کہا تھا اور باہر چلی آئی تھی۔

اور پھر کئی دن گزر گئے۔ ایک روز سفیر نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا تو اس نے ایک نظم اور غزل لکھ کر سفیر کو دے دی تو دوسرے دن راغب اس کے پاس چلا آیا۔

”یقین نہیں آتا کہ یہ آپ کی پہلی کاش ہے۔ اتنی چٹکتی اگر آپ لکھتی رہیں تو مجھے یقین ہے، بہت جلد صف اول کے شعراء میں آپ کا نام بھی ہوگا۔“

”اچھا!.....!“ اسے حیرت ہوئی۔

”غزل میں ایک دو شعر وزن سے گرے ہوئے ہیں لیکن معمولی سے رد و بدل کے بعد خوبصورت غزل ہے۔“

”دراصل۔“ وہ شرمندہ ہو گئی۔ ”مجھے کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ میں نے تو بس یونہی اپنے وجدان کے سہارے لکھ دی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے قافیہ ردیف کا بھی کوئی صحیح پتا نہیں۔“

”آپ اچھے ادب کا مطالعہ کریں۔“ اس نے مشورہ دیا۔ اور اگر کچھ اور بھی لکھا ہو تو مجھے دیں، میں دیکھ لوں گا۔“

”جی بہتر۔“

اور اس کے بعد پھر طویل عرصے تک اس کی راغب سے ملاقات نہ ہوئی اور نہ ہی اس نے کچھ لکھا۔

اور ایک سال یونہی گزر گیا۔ اگلے سال جب میگزین ترتیب دیا جا رہا تھا تو راغب ایک بار پھر اس کے پاس آیا۔

”آپ میگزین کے لیے کچھ دیں گی نا؟“

”جی کوشش کروں گی۔“

”آپ نے کچھ لکھا؟“

”نہیں۔ دراصل میں زیادہ وقت پڑھائی کو دیتی ہوں۔“

اور یوں ان دو سالوں میں چھ سات دفعہ سے زیادہ اس کی راغب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی کل..... ہاں کل ہی تو جب وہ سب کلاس فیلوز کو خدا حافظ کہہ کر ہوٹل آ رہی تھی کہ وہ بالکل اچانک نظر آ گیا۔

”خدا حافظ!“ اخلاقیات اس نے اسے بھی خدا حافظ کہا تھا۔

”میں اس وقت خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ کاش، جانے سے پہلے آپ سے ملاقات ہو جائے۔“

”جی۔“ اس نے پلکیں اٹھائیں۔

”میں آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہا تھا۔ دو سال پہلے آپ کو دیکھ کر میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی تھی۔ لیکن.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر گویا ہواں ”میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے..... ہمارے ہاں غربت اور جہالت دونوں کی فراوانی ہے۔ میں اپنے خاندان کا واحد اور پہلا فرد ہوں جو یہاں تک پہنچا ہوں۔ مجھے اس غربت اور جہالت کے خلاف جنگ کرنا ہے اور اپنے خاندان کو اس چنگل سے نکالنا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ابھی ایسی خواہشوں کو انورڈ نہیں کر سکتا۔ پھر بھی آپ کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش، زندگی کا سفر آپ کی ہمراہی میں کٹ سکتا۔ آج جب آپ جا رہی ہیں تو میرا دل چاہا کہ میں اپنی خواہش آپ تک منتقل کر دوں۔ پلیز، آپ مائنڈ نہ کیجئے گا، کاش، میں اس پوزیشن میں ہوتا کہ آپ کو پروپوز کر سکتا۔“

اور اپنی بات مکمل کر کے وہ بڑی تیزی سے پلٹ گیا تھا۔ اور وہ حیران سی کھڑی سوچتی رہ گئی تھی کہ یہ راغب ارمان..... یہ دلکش آنکھوں والا رومانی شاعر، ابھی ابھی کیا کیا کہہ گیا ہے۔

”کیا میں بھی کسی کو انٹریکٹ کر سکتی ہوں؟“

اس نے اپنے سادہ سے سوتی لباس اور پینتیس روپے والے جوتوں پر نظر ڈالی۔

”شاید.....“ اس کے اندر ایک خوشی، ایک تفر کا سا احساس لمحہ بھر کو جاگا۔ اور پھر اس نے ہولے سے اپنے کندھوں کو جھٹکا۔

اور میں بھی..... میں بھی راغب ارمان، فی الحال اسے انورڈ نہیں کر سکتی ایسے کسی بھی پروپوزل کو.....

”اور وہ واپس ہوٹل چلی آئی جہاں سومیہ اپنا سامان باندھ رہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ سومیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”اپنا سامان تو باندھ لو اب آئے ہی والے ہوں گے۔“

راولپنڈی تک وہ اور سومیہ اکٹھے ہی آتے تھے اور پھر راولپنڈی سے اس کے گھر تک ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ تھا۔ سومیہ کے والد اسے وگن پر بٹھا دیا کرتے تھے۔

”ہاں۔“ وہ چونک کر اٹھی اور اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

ان دو سالوں میں حویلی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہی سلٹی آ پا اور صالحہ آپا دوپہر میں بیٹھ کر کڑھائی کرتیں اور محلے کی لڑکیاں ان کے پاس اکٹھی ہوتیں اور ان لڑکیوں کے بارے میں جو موجود نہ ہوتیں، باتیں کرتیں۔ اور صالحہ آپا اور سلٹی آپا چٹکتی آنکھوں کے ساتھ ان کی باتیں

سنئیں۔

”ہائے..... سچ۔“ سلمیٰ آپا کی سرگوشیاں وقفے وقفے سے سنائی دیتیں۔
 ”تو پھر وہ خط لکھتا ہے رانی کو۔ اور یہ خط لاتا کون ہے۔“
 ”اچھا کھڑکی میں سے دونوں دیکھتے ہیں اللہ۔“
 صالحہ تجسس ہو جاتی۔

یہ اور ایسی ہی باتیں۔
 وہی محلے کی عورتوں کا جھگڑا بی بی جی کے پاس لگا رہتا۔
 وہی ساس نندوں کی شکایات۔

اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان خواتین کی شکایات ختم نہیں ہوئی تھیں۔
 وہ سوچتی۔ پتا نہیں بہوؤں کو اتنے گلے شکوے کیوں ہوتے ہیں۔
 وہی چچی جی کے طنز تھے۔

اور وہی عبدالعلی کی تمسخر اڑاتی نظریں تھیں۔
 اور شاہ جی کا جلاالی غصہ۔

اور یہاں اس ماحول میں زندگی بسر کرنا بہت مشکل تھا۔ اور بی جان چاہتی تھیں کہ وہ
 یہیں رہے۔ شاہ جی کے زیر سایہ۔

”انہیں بی جان، نوکری ملتے ہی میں یہاں سے چلی جاؤں گی اور آپ میرے ساتھ
 چلیں گی۔ بہت دکھ سہ لیے آپ نے۔“

”نہ، نہ خوش جمال، ایسا نہ سوچ۔ تجھے پڑھنے کی چاہ تھی، تو نے پڑھ لیا۔ اب یہیں رہ،
 شاہ جی کے زیر سایہ۔ یہاں جو تحفظ ہے، وہ کہیں اور نہیں۔“

’خاک تحفظ ہے‘ وہ سوچتی۔ ’صبح سے شام تک عبدالقدوس‘ عبدالعلی، اور عبدالوحید کی میلی
 نظریں، جب سے وہ یونیورسٹی سے آئی تھی اس نے محسوس کیا تھا کہ عبدالعلی اور عبدالوحید کی نظریں
 بدل گئی ہیں۔ عجیب نظروں سے وہ اسے دیکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ بے ڈول سر والا عبدالقدوس بھی بھوکی
 نظروں سے اسے دیکھتا۔ سلمانہ نے اسے بتایا تھا کہ ایک بار پھر گھر میں اس کی شادی کی باتیں ہو
 رہی ہیں۔ اور شاہ جی کا خیال ہے کہ اسے عبدالعلی کے ساتھ بیاہ دیا جائے۔

”اوہ نہیں۔“

اسے یہ بات بالکل پسند نہ تھی۔ چنانچہ وہ ہر روز اخبار میں ”ضرورت ہے“ کے کالم
 پڑھنے لگی۔ اور پھر ایک چھوٹے سے پرائیویٹ کالج میں لیکچررز کی خالی آسامی کے لیے اس نے

اپلائی کر دیا۔

اور جب اس کی انٹرویو کال آئی تو وہ بی جان کو بتا کر سومیہ کے پاس چلی گئی۔ اور وہاں
 سے سومیہ کو ساتھ لے کر انٹرویو دے آئی۔ پرنسپل اچھی خاتون تھیں۔ خوش اخلاق اور ہنس مکھ۔
 رہائش کا بھی کوئی پرالہم نہ تھا۔ تنخواہ بھی مناسب تھی۔ کالج سے ملحق لیکچرر کے لیے دو کمروں کے
 کوارٹرز تھے۔

”دراصل ہمارے چھوٹے سے شہر میں لڑکیوں کے لیے تعلیم کا بڑا مسئلہ تھا۔ بہت سے
 والدین اپنی لڑکیوں کو میٹرک کے بعد گھر بٹھا لیتے تھے۔ دوسرے شہروں میں ہوٹل میں بھیجنا انہیں
 پسند نہ ہوتا تھا۔ سو میں نے یہ کالج بنایا ہے۔“ پرنسپل نے اسے بتایا تھا۔

خوش جمال کو کالج پسند آیا تھا اور پرنسپل بھی اچھی لگی تھیں، پھر سومیہ کے شہر سے صرف
 پچیس منٹ کا راستہ تھا۔ اس نے اس کالج میں جاب کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اور پرنسپل سے چند روز
 بعد آنے کا وعدہ کر کے چلی آئی۔

یہاں بہت سی خبریں اس کی منتظر تھیں۔ سلمانہ نے اسے بتایا، سلمیٰ آپا اور صالحہ کا خیال
 ہے کہ وہ کسی بوائے فرینڈ سے ملنے گئی ہے۔ اور بی بی جی اور چچی جان بھی ان کی ہم خیال ہیں۔
 ’اوہو! یہ سلمیٰ آپا اور صالحہ آپا کے ذہن کتنے زرخیز ہیں‘ اس نے دکھ سے سوچا۔ ”منٹوں
 میں کہانیاں تخلیق کر لیتی ہیں۔“

اس کا دل چاہا، وہ پورے خلوص سے انہیں مشورہ دے کہ وہ کہانیاں لکھنا شروع کر
 دیں۔ مفت میں کہانی نگار بن جائیں گی۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار انہوں نے سامنے والی ننھی کے
 بارے میں کیسی بزرگوار کہانی تخلیق کی تھی۔ وہ بے چاری سلائی سینئر میں سلائی سیکھنے جاتی تھی اور
 چونکہ اس کا سینئر دور تھا۔ اس لیے وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتی تھی مگر سلمیٰ آپا نے ہاجرہ سے کہا۔
 ”دراصل یہ سویرے گھر سے اس لیے نکلتی ہے کہ اسے ایک لڑکے سے ملنا ہوتا ہے۔“

”تمہیں کیا پتا؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”میں نے خود دیکھا، کنڑ پر ایک لڑکا اس کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔“

اور ہاجرہ تو تھی ہی چلتا پھرتا ریڈیو اس نے پورے محلے میں نشر کر دیا کہ ننھی صبح ایک
 لڑکے کے اسکوٹر پر بیٹھ کر سلائی سینئر جاتی ہے اور واپس بھی اسی کے ساتھ آتی ہے۔ سلائی سینئر
 جانے کا تو بہانہ ہے دراصل وہ.....“

شام کو عبدالعلی آیا تو سیدھا ان کے کمرے میں چلا آیا۔

”کس سے مل کر آرہی ہو؟“

”کیا..... کیا چاہیے تمہیں؟“

”میں سر اٹھا کر اعتماد کے ساتھ جینا چاہتی ہوں شاہ جی۔ اور میں اپنی ماں کو اس غلامی سے نجات دلانا چاہتی ہوں۔ جو میرے باپ کے مرنے کے بعد اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔“

”لڑکی!“ شاہ جی کی آواز کانپنے لگی۔ ”تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ تمہارے باپ کے مرنے کے بعد ہم نے تمہیں اور تمہاری ماں کو چھت دی۔ تحفظ دیا۔ سائبان مہیا کیا اور تم.....“

”سوری شاہ جی، شاید میں نے کچھ غلط کہا ہے۔ لیکن میں اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔ آپ کا بہت شکریہ، آپ نے اتنا عرصہ ہمارا خیال رکھا۔“

”تم حد سے زیادہ خود سر ہو چکی ہو۔ اور یہ سارا تصور ہمارا ہے کہ ہم نے تمہیں کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن اب..... اب یہ ناممکن ہے..... ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔“

”آپ مجھے روک بھی نہیں سکتے شاہ جی۔“

وہ تیزی سے مڑی اور باہر نکل گئی۔

شاہ جی غصے سے تھر تھر کانپنے لگی جان کو آوازیں دے رہے تھے۔

اور اس چھوٹے سے صاف ستھرے گھر میں زندگی کتنی سہل ہو گئی تھی۔ سفید دوپٹہ اوڑھے قرآن شریف کی تلاوت کرتی بی جان کو دیکھ کر خوش جمال نے بڑی طمانیت محسوس کی۔ ایسا ہی تو سوچا تھا اس نے کہ ایک چھوٹا سا گھر ہو، جہاں صالحہ آ پا اور سلمیٰ آپا کی تنقیدی نظریں نہ ہوں۔ عبد القدوس اور عبد العلی کی میلی نظریں نہ ہوں۔ جہاں بی جان کو صبح سے لے کر رات تک کچن میں کام نہ کرنا پڑے۔ جہاں وہ اپنی مرضی سے ہنس سکے۔ اور اپنی مرضی سے رو سکے۔ بلاشبہ زندگی کی بہت سی سہولتیں ابھی وہ حاصل نہیں کر سکتی تھی لیکن پھر بھی وہ یہاں اس چھوٹے سے شہر کے چھوٹے سے کالج میں بہت خوش اور بہت مطمئن تھی۔ اگرچہ رزلٹ آنے کے بعد وہ گورنمنٹ سرویس کے لیے اپلائی کر سکتی تھی لیکن اسے یہ جگہ پرنسپل اور ماحول پسند آ گیا تھا، پھر تنخواہ بھی پرکشش تھی، سودہ تین سال سے اسی کالج میں تھی۔ ان تین سالوں میں شاہ جی کے گھر سے کوئی بھی ادھر نہیں آیا تھا۔ نہ ہی وہ واپس گئی تھیں کیونکہ شاہ جی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس گھر کے دروازے اب ان پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے ہیں۔ بی جان شروع شروع میں تو بہت پریشان رہی تھیں۔ لیکن اب مطمئن تھیں، البتہ آج کل انہیں اس کی شادی کی فکر ہو رہی تھی۔

بی جان نے قرآن شریف کو چوستے ہوئے جز دان میں لپیٹا اور مڑ کر اس کی طرف

”تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟“ اسے غصہ آ گیا۔ جب سے آئی تھی، سب کی اوٹ پٹانگ باتیں سن سن کر تھک گئی تھی۔

”میں اس گھر کا مالک ہوں جس میں تم رہتی ہو اور میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ تم.....“

”تمہاری غیرت۔“ خوش جمال نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ گوارا کرتی ہے کہ تم چھت پر کبوتروں کے بہانے چڑھ کر محلے کی لڑکیوں کو دیکھو۔“

”بی جان، دیکھیں یہ خوش جمال حد سے بڑھ رہی ہے۔“

بی جان جو نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں، انہوں نے خوش جمال کو ڈانٹا۔

”مت بولا کرو، مت بولا کرو، خوش جمال!“

”کیا اسے خود پر غلط الزام لگانے دوں؟“ اس نے بے بسی سے بی جان کی طرف

دیکھا۔

”یہ الزام ہے یا حقیقتیں یہ تو رات کو شاہ جی تم سے پوچھیں گے۔“

”ٹھیک ہے تو میں شاہ جی کو جواب دے لوں گی۔“

اور عبد العلی پاؤں پختا ہوا باہر نکل گیا۔

حسب توقع شاہ جی نے گھر آتے ہی اسے بلایا۔

”کہاں گئی تھیں تم خوش جمال؟“ وہ نگاہیں جھکائے تسبیح کے دانے گرا رہے تھے۔ اور یہ

ان کی ہمیشہ سے عادت تھی، وہ مخاطب سے نگاہیں ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔

”میں انٹرویو دینے گئی تھی۔“

”کیا ہم اس گھر کے بڑے نہیں ہیں۔ کیا تمہارا فرض نہیں تھا کہ ہم سے اجازت لے کر

جاتیں؟“

”جی مگر میں نے بی جان کو بتا دیا تھا۔“

”یہ انٹرویو کس سلسلے میں تھا؟“

”میں نوکری کرنا چاہتی ہوں اور مجھے کالج میں لیکچرر شپ مل گئی ہے۔ رہائش کا

بندوبست بھی ہے۔ میں بی جان کو لے کر ایک دو روز میں چلی جاؤں گی۔“

”کیا؟“ شاہ جی کے تسبیح پر چلتے ہاتھ رک گئے..... ”تم اب نوکری کرو گی۔ کیا تمہیں

روٹی کپڑا نہیں ملتا؟“

”روٹی کپڑے کے علاوہ بھی زندگی کی کچھ ضروریات ہوتی ہیں۔“

دیکھا۔

”آج کالج نہیں جانا کیا؟“

”نہیں بی جان فنکشن کی وجہ سے آج چھٹی ہے۔“

”تو پھر ناشتا بھی دیر سے کرو گی؟“

”جی، بی جان۔“

اس نے آنکھیں موند لیں۔ کل کے فنکشن نے بہت تھکا دیا تھا۔ کئی دنوں سے کالج میں فنکشن ہو رہے تھے۔ اردو مباحثہ، انگلش مباحثہ، پنجابی مباحثہ، وہ بہت مصروف رہی تھی۔ باہر سے آنے والی طالبات کے کھانے اور رہائش کا خیال رکھنا۔ ڈسپلن کا خیال کرنا اس پر بہت سی ذمہ داریاں تھیں۔

کل رات مشاعرہ تھا۔ مسز پراچہ اس کی انچارج تھیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ مہمان خصوصی کون ہے اور ججز کون لوگ ہیں۔ پرنسپل نے اس کے ذمے ڈنر کا انتظام رکھا تھا۔ جب وہ ٹیبل وغیرہ لگوا کر اور اپنا کام مکمل کر کے ہال میں آئی تو مشاعرہ شروع ہو چکا تھا اور ججز اپنی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ ججز میں راغب ارمان بھی ہے۔ وہ تو مشاعرہ ختم ہونے سے پہلے ہی ڈائیننگ ہال میں چلی گئی تھی..... اور ڈائیننگ ہال میں ہی اس نے راغب کو دیکھا تھا۔

”خوش جمال!“ وہ اپنی پلیٹ اٹھائے اس کے قریب چلا آیا تھا۔ ”اتنے سالوں بعد تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔“

اور وہ بھی اچانک اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔

”آپ یہاں کیسے؟“

”شاید تمہاری خوشبو یہاں لے آئی ہے۔“

اس کے رخسار تپ اٹھے۔ اور نگاہیں جھک گئیں۔

”چند ماہ ہوئے۔“ راغب نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ”یہاں انٹر کالج فار بوائز

میں میرا ٹرانسفر ہوا ہے۔“

”تو آپ ٹیچنگ کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کا مقصد تو کچھ اور تھا۔“

”ہاں لیکن جب ضرورتیں سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہوں تو پھر مقصد، خواہشیں سب

پس منظر میں رہ جاتے ہیں۔ اور جو دسترس میں ہو آدمی اسی پر قناعت کر لیتا ہے۔ میں نے شاید تمہیں بتایا تو تھا کہ میرے اوپر بہت ذمہ داریاں ہیں۔ بہت بڑا کنبہ ہے میرا اور مجھے انہیں غربت اور جہالت کے اندھیرے سے نکالنا ہے۔ سو جب مطلب کی جاب نہیں ملی تو یہی کر لی اور

آپ.....؟“

”میں..... میں بھی یہیں جاب کرتی ہوں۔“ خوش جمال نے بتایا۔

تب ہی مسز پراچہ ان کے پاس چلی آئیں۔

”مس شاہ! میں آپ کو تلاش کر رہی تھی۔“

”دراصل یہ راغب صاحب اچانک نظر آ گئے۔ یونیورسٹی میں ہم اکٹھے تھے۔“ خوش

جمال نے بات بنائی۔

”اچھا۔“ مسز پراچہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور بولیں۔ ”آپ کی شاعری خوبصورت

ہے، خالص رومانی شاعری۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اختر شیرانی کے بعد ایسی رومانی شاعری کی جھلک

آپ کے ہاں ہی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ میری شاعری پڑھتی ہیں۔“

”دراصل میرے میاں بہت مداح ہیں آپ کے۔ آپ کی کوئی کتاب اب تک منظر عام

پر نہیں آئی؟“

”دراصل کچھ رکاوٹیں ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی میرا پہلا مجموعہ کلام آپ کے ہاتھوں میں

ہوگا۔“

”آپ اپنی بیگم کو نہیں لائے؟“

راغب نے کن آنکھوں سے خوش جمال کی طرف دیکھا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے

ابھی شادی نہیں کی۔“

”کیوں بھی کوئی پرانی محبت.....“

مسز پراچہ نے ابھی بات مکمل نہیں کی تھی کہ پرنسپل نے خوش جمال کو بلالیا۔ اور وہ اس

سے معذرت کرتی ہوئی پرنسپل کی طرف چلی گئی۔ اور پھر وہ بہت مصروف ہو گئی۔ راغب کب گیا،

اسے پتا نہیں چلا۔

کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ جاتے سے۔ راغب کو خدا حافظ کہہ دیتی۔

یوں ہی آنکھیں موندے موندے اس نے سوچا۔ اتنے سالوں بعد یونیورسٹی کے ایک

پرانے ساتھی کو دیکھ کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ اور وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ اس کی

دلکش آنکھوں میں اب بھی اسے ایک لپک سی محسوس ہوئی تھی۔

اور یونہی سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ یونیورسٹی میں آخری روز اس نے کہا تھا کہ:

”وہ اگر اس پوزیشن میں ہوتا تو اسے پروپوز کرتا۔“

”کیا اب بھی..... اب بھی وہ ایسا سوچتا ہوگا۔“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اور پھر سر جھٹک کر اٹھ بیٹھی۔

”میں بھی بس یونہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہتی ہوں۔ بھلا ان بیٹے سالوں میں اسے کوئی اور نہیں ملا ہوگا کیا۔ یوں بھی وہ شاعر آدمی ہے۔ نو جوان لڑکیاں اس کی شاعری کو پسند کرتی ہیں اور کیا خبر..... کیا خبر..... وہ مسز پراچہ بھی تو کہہ رہی تھیں کہ وہ خالص رومانی شاعر ہے۔ اور شاعری میں یہ رومانس.....

منہ ہاتھ دھو کر وہ کچن میں چلی آئی۔

”ارے تم اٹھ گئیں۔ میرا تو خیال تھا کہ تم دیر تک سوؤ گی۔“ بی جان نے سنک میں چائے کی خالی پیالی رکھتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔

”بس نیند نہیں آرہی تھی۔ چائے ہے؟“

”ہاں قبوہ بنا رکھا ہے، میں بنا دیتی ہوں۔“

چائے پی کر وہ صحن میں آگئی اور ایک کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ ابھی اس نے چند ورق ہی پلٹے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”شاید کام والی مائی ہوگی۔“ اس نے سوچا اور پھر سے نگاہیں کتاب پر جمادیں۔ کیونکہ بی جان دروازہ کھولنے جا رہی تھیں۔

”خوش جمال، تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔“

”مجھ سے!“ اس نے حیرت سے بی جان کی طرف دیکھا۔

”ہاں، میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے..... کوئی راغب ارمان ہے۔“

”نہیں۔“ بے یقینی کے عالم میں چلتی ہوئی وہ ڈرائنگ روم میں آئی۔

”آپ!“

”سوری۔ آپ کو ڈسٹرب کیا۔“ راغب نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ”لیکن کل آپ سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی تھی، آپ سے ملنے کو دل چاہا تو بے اختیار چلا آیا۔ آپ نے برا تو نہیں مانا؟“

”نہیں۔ آپ بیٹھیے۔“ وہ مسکرائی۔

کل وہ کس قدر بے تکلفی سے بات کر رہا تھا اور آج..... اس کے اتنے تکلف سے بات کرنے پر اسے ہنسی آگئی۔

”تم..... سوری۔ آپ یہاں اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہیں۔“

”جی اور آپ مجھے تم کہہ کر بلا سکتے ہیں۔“

”ادو، تھینک یو۔“ وہ کھل اٹھا۔ ”مجھے واقعی مشکل پیش آرہی تھی۔ دراصل خوش جمال،

تصور میں تم میرے اتنے قریب رہی ہو کہ کل جب اچانک تمہیں دیکھا تو مجھے ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ میں تمہیں اتنے سالوں بعد دیکھ رہا ہوں یا یہ کہ میں تم سے کبھی اتنا بے تکلف نہیں رہا بلکہ مجھے یوں ہی لگا جیسے.....“

”پلیز.....“ خوش جمال کا چہرہ تپ اٹھا۔

”یقین کرو خوش جمال، میں نے ان بیٹے سالوں میں تمہیں بہت سوچا اور بار بار یہ سوچ کر بچھڑایا کہ میں نے تم سے تمہارا ایڈریس کیوں نہ لے لیا۔ تمہیں اپنی بے تابیوں اور محبتوں کی داستان سنا کیوں نہ دی۔ تم سے انتظار کرنے کو کیوں نہ کہا۔ تمہیں خوبصورت وعدوں کی زنجیروں میں جکڑ کیوں نہ لیا۔ کل جب تمہیں دیکھا تو صبر نہ ہو سکا۔ اور صبح ہوتے ہی بے اختیار چلا آیا۔“

خوش جمال سر جھکائے حیرت سے اس کی باتیں سن رہی تھی اور اس کے رخسار گل رنگ ہو رہے تھے۔ یہ کتنی خوشی کی بات تھی کہ کوئی اسے سوچتا رہا، چاہتا رہا اور..... اور اگر صالحہ آ پیا سملی آپا کو پتا چلے کہ اس طرح کوئی یونیورسٹی فیلو تو وہ کتنی خوش ہوں، اپنی کہانیوں کے سچ ہونے پر۔

”خوش جمال! کیا سوچنے لگی ہو تم۔ میری باتیں بری تو نہیں لگیں؟“ اسے خاموش دیکھ کر راغب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”اور شاید یہ محبت کا اثر ہے جو میرے دل میں تمہارے لیے تھی کہ تم..... تمہاری ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ میری طلب شاید سچی تھی خوش جمال!

میری پکار میں اثر تھا۔

کہ میں تم تک پہنچ گیا۔“

وہ حیران حیران سی اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس روز وہ بہت دیر تک بیٹھا۔ بی جان سے بھی ملا۔ ان سے بھی دیر تک باتیں کیں۔ بی جان کو وہ اچھا لگا۔

”کسی اچھے خاندان کا لگتا ہے۔“ اس کے جانے کے بعد انہوں نے تبصرہ کیا۔

وہ کون تھا۔ کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ سب کچھ تو وہ نہیں جانتی تھی لیکن اسے اتنا پتا تھا کہ اس شخص نے اسے سوچا ہے۔ اسے چاہا ہے۔ اس سے محبت کی ہے۔

سو جب کچھ عرصے بعد اس نے بی جان سے اسے مانگا، اس کا ساتھ چاہا تو وہ انکار نہ کر سکی۔

تھی کہ شادی کے بعد وہ جاب نہیں کرے گی۔ اور اس کا اظہار اس نے کئی بار راغب سے بھی کیا تھا۔ اور راغب کے بھی کچھ ایسے ہی خیالات تھے کہ اگر مجبوری نہ ہو تو عورت کو گھر سے نہیں نکلتا چاہیے۔ لیکن اب اس نے خود ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے جاب کرنا ہے، سو چھٹیاں ختم ہوتے ہی وہ کالج جانے لگی تھی۔

اور وہ جو برسوں پہلے میں نے پڑھا تھا۔

کہ عورت بھی گھاس کی طرح ہوتی ہے اور گھاس جب سر اٹھانے کے قابل ہوتی ہے تو کاٹ دی جاتی ہے..... کتنا صحیح تھا

بی جان کی گود میں سر رکھتے ہوئے خوش جمال سے سوچا۔

بی جان کے بوڑھے ہاتھ ہاتھ ہو لے ہو لے اس کے سر کو سہلا رہے تھے۔ اس کا جی چاہا، وہ یونہی آنکھیں موندے بی جان کی گود میں پڑی رہے۔ بی جان کی انگلیاں اس کے بالوں میں لرزتی رہیں اور وقت یہیں کہیں تھم جائے، رک جائے۔

”تو تو خوش نہیں ہے خوش جمال؟“ بی جان نے کانٹنی آواز میں پوچھا۔

”نہیں۔ خوش ہوں۔ خوش ہوں بی جان۔“ اس نے یونہی بی جان کی گود میں سر

چھپائے چھپائے کہا۔

”یہ راغب آج کل بہت دیر سے آنے لگا ہے۔“

”روز تو نہیں، کبھی کبھی جب اسے کسی مشاعرے وغیرہ میں شرکت کرنی ہو تو دیر ہو جاتی

ہے۔“

”اچھا۔“ بی جان نے جیسے اس کے جھوٹ پر یقین کر لیا۔ ”تو خیال رکھا کر اس کا خوش

جمال۔“

”کیا میں نے اس کا خیال نہیں رکھا ہے؟“ خوش جمال نے اپنے آپ سے پوچھا۔

ان بیٹے ہوئے دس سالوں میں کس کس طرح اس نے اس کا خیال نہیں رکھا تھا۔ معاشی

جدوجہد میں قدم قدم اس کے ساتھ رہی تھی۔ کس طرح اپنی خواہشوں کو مار مار کر وہ پیسہ بچاتی تھی۔

اس کی بہنوں کی شادیاں، بھائیوں کی تعلیم، باپ کا علاج۔ ان ساری ذمے داریوں کو اس نے خوش

اسلوبی سے نبھایا تھا۔ اپنے پھول جیسے بچوں کو اس نے کبھی کوئی قیمتی کھلونا خرید کر نہیں دیا کبھی کوئی

فضول خرچی نہیں کی۔ محض اس لیے کہ وہ راغب کے مسائل کو حل کرنا چاہتی تھی۔ اس کے معاشی

پر اہم کو شیر کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا تھا جب مسائل اور ذمے داریوں کا بوجھ اس کے کندھوں

سے اتر جائے گا تو پھر وہ زندگی کو انجوائے کرے گی۔

”ٹھیک ہے بی جان!“ اس نے گویا اقرار کر لیا۔

وہ عبدالقدوس اور عبدالعلی سے بہر حال بہتر تھا۔

لیکن بی جان متردس تھیں۔

”شاہ جی نے سنا تو وہ کیا کہیں گے؟“

”کیا کہنا ہے بی جان! ان سالوں میں انہوں نے ہماری خبر لی۔ جواب لیں گے۔“

وہ پسند تو بی جان کو بھی بہت تھا۔ سلجھا ہوا خوش شکل اور..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ

ان کی بیٹی کو پسند کرتا تھا اور انہوں نے خوش جمال کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے پسندیدگی کی جھلک دیکھی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے راغب سے کہا۔ ”تم اپنے والدین کو لاؤ۔ ماں باپ کی مرضی

کے بغیر جو شادیاں ہوتی ہیں، وہ سکھ نہیں دیتیں۔“

”میرے ماں باپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ تو میری خوشیوں میں خوش ہیں۔ میں

جلد ہی اپنی والدہ کو لاؤں گا۔“

اور پھر کچھ ہی دنوں بعد انتہائی سادگی کے ساتھ خوش جمال اور راغب کی شادی ہوگئی۔

بی جان کے بلانے کے باوجود شاہ جی کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔ بی جان کو اس بات کا دکھ تھا لیکن

خوش جمال کو پروا نہ تھی۔

وہ راغب کا ساتھ پا کر بہت خوش، بہت مطمئن تھی۔ چھٹیاں گزار کر راغب جو کالج کے

ہوسٹل میں رہتا تھا اس کے کوارٹر میں ہی آ گیا تھا۔ گاؤں سے اس کی ایک بہن بھی ساتھ آئی تھی اور

پھر چند دن رہ کر واپس چلی گئی تھی۔

گاؤں میں راغب کا گھر بہت چھوٹا سا تھا۔ چھ بہنیں، چار بھائی اور بوڑھا بیمار باپ۔

واقعی راغب سچ کہتا تھا کہ اس پر ذمے داریوں کا بہت بوجھ تھا۔ بھائی پڑھ رہے تھے۔ بہنیں گھر میں

بیٹھی تھیں اور راغب کی تنخواہ بھی زیادہ نہ تھی کہ وہ ان کی تعلیم کا خرچ برداشت کرتا۔ سو صرف بھائی

اسکول اور کالج جاتے تھے۔ گھر کا ماحول بھی انتہائی جاہلانہ تھا۔ دن بھر ہاتھ پائی، گالی گلوچ۔ وہ تو

چند دن میں ہی گھبرا گئی تھی لیکن راغب نے اسے تسلی دی کہ کون سا اسے ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔ اس

کی ماں اور بہنوں کو فکر تھی کہ اب راغب نے شادی کر لی ہے تو کہیں ان کا خرچ بند نہ کر دے لیکن

اس نے انہیں تسلی دی کہ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ خوش جمال خود جاب کرتی ہے۔ اور خوش جمال نے بھی

دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ غربت اور جہالت کے خلاف راغب کی اس جنگ میں اس کی

مدد کرے گی۔ سو اس نے جاب نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ شادی سے پہلے وہ اکثر سوچا کرتی

وہ شانی مانی اور راغب سب مل کر زندگی کو بھرپور طور پر انجوائے کریں گے۔
ان بیٹے ہوئے دس سالوں میں تو اسے سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ ٹیوشنز، گھر
کا کام اور پھر شانی مانی کی مصروفیات، ان کے چھوٹے چھوٹے کام اور رات گئے جب وہ تھک کر
چور ہو کر بستر پر لیٹی تو راغب کا کوئی محبت بھرا جملہ کوئی خوبصورت بات اس کے تھکے ہوئے نڈھال
جسم میں جان ڈال دیتا، وہ ایک دم سے پھر تروتازہ ہو جاتی، اگلے دن کی مشقت کے لیے ایک
خوش آئند مستقبل کا تصور۔

’جب کندھوں پر ذمے داریوں کا بوجھ نہیں ہوگا۔‘
اسے تھکنے نہیں دیتا تھا۔

اور اب جب ذمے داریاں ختم ہو گئی تھیں، وہ تھکنے لگی تھی۔
راغب کی چار بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بھائی سب کام کر رہے تھے۔ گھر میں
خوش حالی ہو گئی تھی اور راغب کو اپنی مرضی کی پوسٹ مل گئی تھی اور اس کی شاعری عروج پر تھی۔
نوجوان نسل کا مقبول شاعر۔

راغب ارمان۔

یہ دس سال کتنی بے تحاشا مصروفیت میں گزر گئے تھے۔ اسے سانس لینے کی بھی مہلت
نہیں ملی تھی۔

اور اب فراغت ملی تھی تو اس نے کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے سوچا تھا۔

’اب زندگی اپنی مرضی سے گزرے گی۔‘

اس کے اندر بھی تو ایک شاعرہ چھپی ہوئی تھی۔

ٹیوشنز چھوڑیں تو فارغ بیٹھنا اسے مشکل لگنے لگا۔ اس نے قلم سنبھال لیا۔

اور چند ماہ ہی میں اس کا نام ادبی حلقوں میں پہچانا جانے لگا۔ اسے تو خود خبر نہ تھی کہ اس
کے اندر اتنا ٹیلنٹ چھپا ہوا ہے۔ لوگوں کی حوصلہ افزائی نے اس کے چھپے ہوئے ٹیلنٹ کو اور
ابھارا۔ مگر راغب کے تیور بدلنے لگے۔

اسے یہ سب پسند نہ تھا۔

وہ بات بے بات غصے ہونے لگا۔

’یہ سب کیا ہے بھئی۔ بچوں کو سنبھالو۔ ان کا دھیان رکھو۔ یہ کیا قلم کا غدلے کر بیٹھ جاتی

ہو۔‘

اب تو بچے بڑے ہو گئے تھے۔ اب تو ان کا دھیان رکھنے کی اتنی ضرورت بھی نہ تھی۔ اور

جب انہیں سچ سچ اس کی ضرورت تھی تب..... تب تو راغب نے ایسا کبھی نہیں کہا تھا۔ بچے روتے
رہتے تھے۔ بی جان انہیں بہلاتی رہتی تھیں اور وہ ٹیوشن پڑھنے کے لیے آنے والی لڑکیوں کے
ساتھ سر کھپاتی رہتی تھی۔ اور جب اچھی پرکشش پے کے لالچ میں اس نے اسلام آباد میں جاب
کر لی تھی تو شروع میں جب تک وہاں رہائش کا بندوبست نہ ہوا تھا، کتنی مشکل ہوئی تھی۔ اسے
ہوسٹل میں رہنا پڑا تھا اور بچے بی جان کے پاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ کیسے کیسے ہر چھٹی پر بھاگ
بھاگ کر آتی تھی۔ بچوں کے لیے کیسا کیسا ترپتی تھی۔ تب بھی راغب نے کچھ نہیں کہا تھا۔

اور اب اچانک ہی اسے بچوں کا خیال آ گیا تھا۔ اب جب وہ بڑے ہو گئے تھے اور اس
سے زیادہ بی جان سے مانوس تھے تو راغب کا رویہ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

خود وہ راتوں کو دیر سے آنے لگا تھا۔

گھر ہوتا تو فون آتے رہتے۔

لڑکیاں آٹو گراف بکس اٹھائے گھر تک چلی آتیں۔

کم عمر لڑکیاں

بڑی عمر کی لڑکیاں۔

خوبصورت اور شوخ و چنچل لڑکیاں۔

لیکن اس نے تو کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔

الٹا فخر ہی محسوس کیا تھا۔

وہ اتنا بڑا شاعر تھا۔

لوگ اسے پڑھتے تھے۔ اسے چاہتے تھے۔ اور یہ لڑکیاں بھی تو اس کی شاعری سے متاثر
ہو کر اس سے ملنے چلی آتی تھیں۔

مگر راغب کو اس کا لکھنا پسند نہیں آیا تھا۔ اس کی شہرت اسے اچھی نہیں لگی تھی۔

پتا نہیں کیوں، وہ چڑنے لگا تھا۔

کوئی تعریف کرتا تو اسے غصہ آتا۔

اور اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا اس کے لیے..... اس کی خاطر۔

اس کی تھکن بانٹتی رہی تھی۔

اس کے پاؤں میں چھبے کانٹوں کو اپنی انگلیوں سے نکالتی رہی تھی۔

اور آج جب وہ سر اٹھا کر جینا چاہتی تھی تو راغب اسے جھکانا چاہتا تھا۔

وہ اس کا اٹھا ہوا سر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

اپنی خامیوں کو ڈھونڈنا چاہا لیکن کہیں کوئی جھول نظر نہ آیا۔
دراصل وہ اپنے احساس کسری کو چھپانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔
”دیکھ خوش جمال!“ بی جان نے اس کی پیشانی کو چوما تو وہ چونکی۔ ”اپنا بھی خیال رکھا
کر، کیسی اجڑی اجڑی لگ رہی ہے اپنی عمر سے بڑی۔“

ان دس سالوں نے تو اس کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔ اور اب جو اپنے اندر توانائی پیدا
کرنے کے لیے گلوکز کی بوتل اس نے لگائی تھی تو راغب نے اس کی سوئی کھینچ لی تھی۔ وہ یونہی زرد
زرد سی پڑی تھی۔

”مرد بہت حسن پرست ہوتا ہے خوش جمال اور عمر کے ہر دور میں اپنی بیوی کو خوبصورت
دیکھنا چاہتا ہے۔“ بی جان بھی معلوم نہیں اسے کیا سمجھانا چاہتی تھیں۔
”آپ پتا نہیں، کیا سوچ رہی ہیں بی جان۔ میں تو یونہی، یونہی ذرا تھک سی گئی تھی۔“ وہ
ہولے سے ہنسی۔

”یہ تھکن اچھی تو نہیں ہے خوش جمال! چلو اٹھو منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلو، کنگھی کرو۔“
”نہیں بی جان، مجھے یونہی کچھ دیر پڑا رہنے دیں، بڑا سکون مل رہا ہے۔“ اس نے
آنکھیں موندے موندے کہا۔

”خوش جمال!“ بی جان نے اپنے بازو اس کے گرو لپیٹ لیے۔ ”گھر قائم رکھنے اور
اسے بنانے کے لیے عورت کو اپنی انا ماری پڑنی ہے۔ پھر تیرے تو شہزادے جیسے بیٹے ہیں..... ان
کی خاطر جو وہ کہتا ہے، مان لے۔“

”ارے بی جان تو سب کچھ جانتی ہیں۔ اس نے حیرت سے سوچا۔
”اور وہ جو کچھ کہتا ہے، کیا وہ صحیح ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا ”کیا مجھے یہ حق
نہیں ہے کہ میں سر اٹھا کر اپنی مرضی سے جی سکوں۔“

”غلط یا صحیح کی بات نہیں خوش جمال۔“ اس نے خود کو سمجھایا۔ ”بات تو یہ ہے کہ عورت کی
ترقی مرد کو خائف کر دیتی ہے اور وہ بھی خائف ہو گیا ہے۔ اور عورت تو ہمیشہ سے نارسا ہے۔“
بند آنکھوں کے اندر آنسو بجل اٹھے۔

”اور مجھے بھی بہر حال گھر کو قائم رکھنا ہے۔ چاہے وہ پانی پر ہی کیوں نہ قائم ہو۔ اور
نارسائی تو عورت کا نصیب ہے، اس کا مقدر ہے۔ وہ مر کر مٹ کر فنا ہو کر بھی نارسا ہی رہتی ہے۔
مرد کا ایک بول اسے آسمان سے زمین پر پٹخ دیتا ہے۔“

”تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے تو ایک عام عورت کی طرح رہو۔“ راغب کے الفاظ اس

کل شام ہی تو اسے ٹی وی کی طرف سے مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا۔
”کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔“

راغب نے دعوت نامہ پھینک دیا اور رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی اس کی تازہ غزل کے
نکڑے نکڑے کر دیئے۔

”سنو خوش جمال! مجھے یہ تمہارا لکھنا لکھنا بالکل پسند نہیں ہے۔ اور ایسی عورتیں گھر لگاڑ
دیتی ہیں۔ جنہیں گھر سے باہر.....!“

”پلیز راغب“ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”میں نے صرف تمہارے گھر
کو ہی نہیں، تمہارے پورے خاندان کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔“

”فضول باتیں نہیں کرو خوش جمال! بس میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے تمہارا مشاعروں میں
جانا قطعی پسند نہیں ہے۔“

اور یہ کیا شخص تھا۔

خود شاعر تھا۔

شاعری کو سمجھتا تھا، جانتا تھا کہ اندر سے کچھ نکلنے کو بیتاب ہو اور لفظوں کو برتنے اور
پرکھنے کا سلیقہ آتا ہو تو اچھی شاعری جنم لیتی ہے۔ اور وہ اچھی شاعرہ تھی۔ لفظوں پر اس کی گرفت
مضبوط تھی اور اس کے اندر خزانے پوشیدہ تھے۔

باہر نکلنے کو بے تاب اور وہ اس پر بند باندھ رہا تھا۔ کیا وہ اس سے جلیس ہو گیا تھا۔

کیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے برابر اس کے ساتھ سر اٹھا کر کھڑی ہو۔

شاید وہ اسے اپنے پاؤں تلے رکھنا چاہتا تھا۔ اس صدی کی پیداوار کے باوجود اندر سے
شاید وہ وہی دقیق نوی فرد تھا۔

عورت کو پاؤں کی جوتی بنا کر رکھنے والا۔

اسے پاؤں تلے کچلنے والا۔

”تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے تو ایک عام عورت کی طرح رہو۔ گھر کی چار دیواری کے
اندر۔ جس عورت کو شہرت کی ہوا کا چمکا لگ جاتا ہے جس کی اڑان اونچی ہو جاتی ہے، وہ شوہر کی
اچھی ساتھی نہیں رہتی۔ وہ اچھی ماں بھی نہیں ہوتی اور مجھے اچھی بیوی اور اچھی ماں کی ضرورت
ہے۔“

وہ کب اچھی بیوی یا اچھی ماں نہیں تھی۔

اس نے اپنا چہرہ لٹایا۔

کے کانوں میں گونجے۔

وہ اس کے پرکاٹ دینا چاہتا ہے۔

تاکہ وہ پرواز نہ کر سکے۔

اور وہ اپنے پرکاٹ دے گی۔

اپنے گھر کو بچانے کے لیے۔

اپنے بچوں کی خاطر۔

اس نے سراٹھا کر بی جان کی طرف دیکھا۔ ان کے بوڑھے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا

اور مسکرائی۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں بی جان۔“

اور ہولے ہولے چلتی ہوئی اپنی رائٹنگ ٹیبل کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور دراز میں

سے اپنی فائل نکال کر لمحہ بھر اسے دیکھا، پھر کاغذوں کو پھاڑ کر پھینکنے لگی۔



اندھا قرض

لوگ میاں ایم۔ این۔ خان کے بارے میں کتنی بھی متضاد رائے کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن ایک بات پر سب کو اتفاق تھا کہ وہ بڑے دریا دل، بڑے فیاض اور بڑے ہمدرد ہیں۔ یوں بھی وہ اپنے علاقے کے سب سے بڑے سماجی کارکن تھے۔ اخبار میں آئے دن ان کے بارے میں خبریں آتی رہتی تھیں کبھی افغان مہاجرین کے لیے چندہ دے رہے ہیں اور کبھی اپوا میں لاوارث لڑکیوں کی شادی کا خرچ اٹھا رہے ہیں۔ ملک کے سماجی حلقوں میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا پھر بھی نجی حلقوں میں لوگ اکثر ان کی بے تحاشا دولت کے متعلق قیاس آرائیاں کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جس اور انیون کی اسمگلنگ کرتے ہیں اور کچھ اس بات پر متفق تھے کہ وہ ہیروں کے سمگلر ہیں۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ نو دولت تھے بلکہ ان کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ منہ میں سونے کا چمچا لے کر پیدا ہوئے تھے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اگرچہ ان کے والد نے کافی روپیہ اپنی عیاشیوں میں لٹا دیا تھا پھر بھی ایک ماچس فیکٹری بنچ رہی تھی اور انہوں نے ہولے ہولے اپنی محنت سے چمڑا رنگنے اور چمڑے کی مصنوعات تیار کرنے کا ایک کارخانہ بھی بنالیا تھا۔

ان دنوں وہ سماجی حلقوں میں اتنے معروف نہیں ہوئے تھے اور اپنی مصنوعات بیرونی ملکوں میں روشناس کرانے کے لیے اکثر باہر کے چکر لگایا کرتے تھے۔ اسلام آباد، لاہور، کراچی، ہر بڑے شہر میں ان کی جائیداد تھی۔ خان پلازہ، خان بلڈنگ، خان کامپلیکس، خان فلیٹس، غرض روز بروز ان کی جائیداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ابتداء میں جب انہوں نے چمڑے کا کارخانہ بنایا تھا تو ان کا خیال تھا کہ وہ اسے بہت وسعت دیں گے حتیٰ کہ ایک دن ان کا یہ کارخانہ ملک کا سب سے بڑا چمڑے کا سامان تیار کرنے والا کارخانہ ہوگا لیکن پھر جوں جوں ان کا تجربہ وسیع ہوتا گیا، ان کا فلسفہ اور خیالات بدلتے گئے اور

اپنے فالتو سرمائے کو انوسٹ کرنے کا سب سے بہتر طریقہ انہیں یہ لگا کہ وہ عمارتیں بنالیں۔ اس میں کئی فائدے تھے ایک تو ان کے قومیائے جانے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ دوسرا زکوٰۃ بھی واجب نہیں تھی۔ اور یہ کہ اس میں گھائے کا بہت کم امکان تھا جو فلیٹ دو سال پہلے انہوں نے اسی ہزار میں بیچا تھا وہ اب ڈیڑھ دو لاکھ میں بک رہا تھا۔

میاں ایم۔ این۔ خان نے یہ عزت و شہرت یونہی یکا یک حاصل نہیں کر لی تھی بلکہ وہ بے شمار تدریجی مراحل سے گزرے تھے۔ جب وہ صرف ایک ماسٹر فیکٹری کے مالک تھے تو انہیں صرف اپنے شہر کے کچھ لوگ اور ملازمین وغیرہ جانتے تھے۔ جب انہوں نے کارخانہ قائم کیا تو انہیں کچھ مزید لوگ جاننے لگے لیکن ملک گیر پیمانے پر شہرت حاصل کرنے کا خیال اخبار میں ایک سماجی کارکن کی تصویر دکھ کر ان کے دل میں آیا تھا۔ اور اسی شام اپنے ہی شہر کے ایک رفاہی ادارے کو انہوں نے پانچ ہزار کا چیک بطور عطیہ دے دیا اور پھر ہولے ہولے ملک بھر میں ان کی شہرت پھیلتی چلی گئی۔ لوگ انہیں جاننے پہچاننے لگے۔ خود صوبے کے گورنر نے کئی بار اپنے اخباری بیانات میں ان کے سماجی اور رفاہی کاموں کو سراہا تھا اور ان کے نیک جذبے کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ جس طرح اچانک ایک دن ان کے دل میں سماجی کارکن بننے کا خیال آیا تھا اسی طرح ایک دن اچانک ان کے دل میں حج کرنے کا سودا سامیا تو وہ ہر سال باقاعدگی سے حج پر جانے لگے اب تک وہ گیارہ حج کر چکے تھے۔ ڈھوک مراد شاہ والے بڑے پیر جی کی بیعت بھی کر لی تھی اور ان کے قریبی مریدوں میں ان کا شمار ہونے لگا تھا۔ وہ ہر جمعہ کو شہر سے تیس میل دور بڑی باقاعدگی سے پیر جی کے استانے پر ڈھوک مراد شاہ جایا کرتے تھے اور جمعہ کی نماز وہیں پیر جی کے استانے پر باجماعت ادا کرتے تھے جب سے وہ پیر جی کے مرید ہوئے تھے وہ اور بھی معتبر ہو گئے تھے اور لوگوں نے ان کے متعلق قیاس آرائیاں کرنا چھوڑ دی تھیں کہ وہ جس اور ایفون کی اسمگلنگ کرتے ہیں بلکہ اکثر لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ حضرت صاحب اپنی گلدی انہیں ہی دے جائیں گے۔ یوں گزرتے دنوں کے ساتھ ان کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

محمد کریم عرف کریم بہت اچھا لک تھا۔ اس لیے وہ صاحب اور بیگم صاحبہ دونوں کا منظور نظر تھا۔ یوں تو وہ ہمیشہ ہی اچھے کھانے پکاتا تھا لیکن جمعہ کے روز وہ خاص احتیاط سے کھانا تیار کرتا۔ یوں بھی جمعہ کی رات کو کھانے پر خاص اہتمام ہوتا تھا۔ کیونکہ جمعہ کی شام کو صاحب گھر اکیلے نہیں آتے تھے بلکہ ان کے ساتھ ایک خوبصورت مہمان بھی ہوتا تھا۔ جب سے کریم نے یہاں نوکری کی تھی کوئی جمعہ ایسا نہیں گزرا تھا جس کی شام صاحب اکیلے واپس آئے ہوں۔ اس

معاملے میں اس کے صاحب بڑے با اصول آدمی تھے۔ جمعہ کے علاوہ عام دنوں میں وہ کبھی کسی لڑکی کے ساتھ گھر نہیں آئے تھے۔ صاحب ہی نہیں بیگم صاحبہ بھی بڑی با اصول تھیں۔ انہوں نے صاحب کے ان معاملات میں بھی دخل نہیں دیا تھا بلکہ جمعہ کی صبح ہی وہ اپنے الگ بیڈروم میں منتقل ہو جایا کرتی تھیں اور کریم کو صبح ہی صبح رات کے کھانے پر خاص اہتمام کی ہدایت دیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی کریم کو بڑی حیرت ہوتی تھی کہ یہ بیگم صاحبہ آخر کس مٹی کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ جو صاحب ان کی آنکھوں کے سامنے گھر میں بنی بنی لڑکیاں لاتے ہیں تو کچھ نہیں کہتیں اور تب بوا بھی جو اس گھر کی بہت پرانی ملازمہ تھیں، رازدارانہ لہجے میں اسے بتاتیں۔

”شروع شروع میں بیگم صاحبہ بھی بڑا دوا دیا پچایا کرتی تھیں مگر پھر یہ نہیں ان کے دل میں کیا آیا کہ انہوں نے خود ہی خاموشی اختیار کر لی۔ آپ ہی سمجھوتا کر لیا۔ شاید اپنی سماجی سلامتی کے لیے۔“ یہ سمجھوتے والی بات کریم کو کچھ زیادہ پسند نہ آتی تھی۔ بھئی بیویاں تو شور مچایا ہی کرتی ہیں اور پھر ایسی باتوں پر تو انہیں دوا دیا کرنا ہی چاہیے۔ بیویاں شوہروں سے نہیں لڑیں گی تو کیا شوہر والے آکر لڑیں گے مگر بیگم صاحبہ لڑنا تو کجا جب تک وہ اجنبی لڑکی صاحب کے ساتھ رہتی ان کے بیڈروم کی طرف دیکھتی تک نہ تھیں۔

جمعہ کے روز کریم سر شام ہی مصروف ہو جاتا تھا۔ کبھی شامی کبابوں کے لیے قیمہ تیار کر رہا ہے اور کبھی کڑا ہی گوشت پکا رہا ہے اور کبھی مرغ روست کر رہا ہے جوں ہی صاحب کی گاڑی پورچ میں داخل ہوتی وہ سارے کام چھوڑ کر ٹرائی میں سامان سجانے لگتا۔ کاجو، نمکین، پستہ، بادام، دالیں، بسکٹ وغیرہ کی پلیٹیں رکھتے تھے وہ کچن کی کھڑکی سے باہر بھی جھانکتا رہتا صاحب ادھر ادھر دیکھے بغیر اپنی خوبصورت مہمان کے ساتھ اپنے بیڈروم میں چلے جاتے تو وہ جلدی جلدی چائے دم دے کر ٹرائی دھکیلتا ہوا ان کے بیڈروم میں پہنچ جاتا۔ صاحب اس کی اس مستعدی پر بہت خوش ہوتے تھے اور اکثر انعام و اکرام سے بھی نواز دیتے تھے۔

صاحب نے اپنے بیڈروم میں ہی ایک چھوٹا سا خوبصورت سا بار بنا رکھا تھا۔ بیڈروم کی مشرقی دیوار میں خوبصورت سیپیوں کے کام والی منقش الماریاں تھیں اور ان کے اندر درازیں تھیں جن میں ملک ملک کی سینکڑوں اقسام کی شرابیں موجود تھیں۔ صاحب جس قسم کی شراب پینا چاہتے تھے بٹن دباتے اور ان کی مطلوبہ شراب دراز کے ساتھ باہر آ جاتی۔ یہ مختلف اقسام کی شرابیں خوبصورت بوتلوں میں بند تھیں۔ ٹیرھی سیدھی، بل کھاتی، موٹی، خوبصورت نازنین کی شہبہ میں ادا سے بیٹھی ہوئی، عقاب کی صورت سنہری ڈھکنوں والی، سنہری زنجیروں میں بندھی ہوئی یہ شیشیاں اتنی خوبصورت تھیں کہ ان میں سے کچھ بیگم صاحبہ نے ڈیکوریشن پیزر کے طور پر ڈرائنگ روم میں سجا رکھی

تھیں۔ کارز کے پاس سے گزرتے ہوئے جہاں یہ بوتلیں تکی تھیں کئی بار کریے کا جی لپکایا تھا کہ وہ ان خوبصورت بوتلوں کے اندر موجود مشروب کو چکھ کر دیکھے مگر ان کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی اسے ابکائی آ جاتی اور وہ تو بہ استغفار کرتا ہوا باہر آ جاتا۔

صاحب کو چائے بنا کر دیتے ہوئے وہ بڑے دھیان سے ان کی خوبصورت مہمان کو بھی دیکھتا رہتا اور واپس آ کر یہ ضرور کہتا۔

”اپنی بیگم صاحبہ کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں۔ ایکدم ہنڈل مال ہے۔“
بواجی ایک ٹھنڈی آہ بھرتیں۔ انہوں نے کبھی اس پر تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن کریے کو باتیں کرنے کا چمکا تھا۔ کام کرتے ہوئے بھی اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہتی۔

”دیکھیے بواجی یہ پیاز ذرا باریک باریک کاٹ لیں۔ اور ہاں دقتیے میں مرچیں زیادہ نہ ہوں۔“
شامی کہاؤں کے لیے مسالہ تیار کرتے ہوئے بھی وہ بولتا رہتا۔

”اور پتا ہے بواجی آج ہمارے صاحب نے ایک غریب لڑکی کی شادی کے لیے دس ہزار روپیہ دیا ہے اور افغان مہاجرین کے لیے پانچ سو کمبل بھجوائے ہیں۔ اپنا صاحب بھی بادشاہ آدمی ہے۔ بس یہ ایک ذرا پینا پلانا اور چھوڑ دے تو ایک دم گریٹ آدمی ہے۔“
بواجی ٹھنڈی آہ بھرتیں۔ انہیں بات بات پہ ٹھنڈی آہیں بھرنے کی عادت تھی۔ وہ کہتیں۔

”یہ دنیا بھی اور وہ دنیا بھی دونوں ہی امیروں کے لیے ہیں۔ ہم غریبوں کا تو نہ یہ جہاں نہ وہ جہاں۔“

”وہ کیسے بواجی؟“ کریم پوچھتا۔

”اے لو تجھے نہیں پتا! بواجی پھر ٹھنڈی آہ بھرتیں۔“

”یہ جو امیر آدمی مٹھیاں بھر بھر دولت لٹاتے ہیں، خیرات کرتے ہیں، غریبوں کو دیتے ہیں اور ہر سال حج کرتے ہیں تو وہ جہان ان کا ہوا یا نہ ہوا۔ پیسہ ہو تو دونوں جہان اپنے بچپن سے سنتے آئے ہیں جس نے تین بار حج کر لیا اس پر جہنم کی آگ حرام ہوگئی۔ پیسہ ہو تو آدمی اپنے صاحب جی کی طرح تین بار چھوڑ دس بار حج کر لے۔ غریب بیچارہ اپنے پیٹ کی آگ بجھائے یا راہ خدا میں خیرات دے۔“

پر بواجی اپنی مسجد کے مولوی صاحب تو کہتے تھے کہ غریب آدمی اپنے دل میں دس بار خدا کی شاکر کر لے تو اسے امیر آدمی کے دس ہزار روپے خیرات کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اور غریب آدمی کا حج تو یہی ہے کہ وہ.....“

لیکن بواجی اس کی بات سننے بغیر اپنی ہی کہے جاتیں۔

”کیسے کیسے ابال اٹھتے ہیں دل میں، کیسا کیسا۔ جی چلتا ہے کہ درحیب پہ جاؤں، پلکوں سے وہ زمین چوموں اور آنکھوں سے لگاؤں۔ دس سال سے حج کے لیے پیسے جمع کر رہی ہوں، پر ہر سال کچھ نہ کچھ کمی پڑ جاتی ہے۔ اور صاحب ہیں جو مزے سے ہر سال حج کر آتے ہیں۔“

☆☆☆

کریم کڑا ہی گوشت میں چجج ہلاتے ہوئے اپنی بھاری آواز میں گنگٹانے لگتا۔

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، یہ بڑے نصیب کی بات ہے

جسے چاہا در پہ بلالیا، جسے چاہا اپنا بنا لیا

اندر صاحب کے بندروم سے ملے جلے قہقہوں اور دبی دبی ہنسی کی آوازیں آتی رہتیں۔
وقفے وقفے سے گلاسوں کی کھٹکھٹاہٹ گونجتی رہتی اور کریم کام کرتے ہوئے اپنی بھاری آواز میں عجب سوز سے گنگٹاتا رہتا۔

جسے چاہا در پہ بلالیا جسے چاہا اپنا بنا لیا

یہ بڑے نصیب کی بات ہے

نعت کے بولوں کے ساتھ ساتھ بواجی کا دل گداز ہو کر پکھلتا رہتا اور وہ پیاز کاٹتے ہوئے سوچتی رہتیں کہ یہ جب میاں جی گاڑی سے اترے تھے تو ان کی پیشانی کیسے جگمگاتی تھی اور پیر جی کے پیچھے نماز پڑھنے سے چہرے پر کیسا نور اتر آیا تھا۔

دس کنال کے رقبے پر پھیلی ہوئی کوشی کی عقبی سمت بنے ہوئے سروٹ کو ارٹروں کے ایک کمرے میں بارہ سالہ ناصر اپنی وکیل چیر کو ادھر ادھر گھماتے ہوئے بڑی بے چینی سے ماسٹر اللہ بخش کا انتظار کیا کرتا ایک بجتے ہی اس کی نگاہیں دروازے کی طرف لگ جاتیں تھیں کیونکہ ایک بچے سکول بند ہوتا تھا اور ماسٹر اللہ بخش اسکول سے چھٹی کر کے سیدھے اسی کی طرف آتے تھے۔ ناصر کے لیے ماسٹر اللہ بخش کا وجود ایک ایسے روزن کی مانند تھا جس سے باہر کی ہوا اور روشنی اس کی زندگی میں آتی تھی اگر وہ نہ ہوتے تو اس کا دم گھٹ جاتا۔ ان کے بغیر ناصر کی زندگی ایک ایسے بند کمرے کی سی تھی جس میں نہ دروازے تھے، نہ کھڑکیاں اور نہ روشندان۔ ماسٹر اللہ بخش اس کے لیے دروازے، کھڑکیاں اور روشندان تھے۔ اگر ان کے آنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو وہ نہ جانے کتنی بار مضطرب ہو کر کھڑکی تک جاتا پھر لوٹ کر کام کرتی آمنہ بی بی سے پوچھتا۔

”ماسٹر صاحب ابھی تک نہیں آئے۔ اماں کیا وہ آج نہیں آئیں گے؟“

”آئیں گے بیٹا ضرور آئیں گے۔ اسکول میں کوئی کام پڑ گیا ہوگا۔“

”لیکن اگر وہ نہ آئے تو.....؟“ وہ بے چین سا ہو کر پوچھتا۔
آمنہ بی بی ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھتی اور پھر نگاہ جھکا لیتی۔
”تو ان کی مرضی بیٹا۔ ان کا یہی کرم کیا کم ہے کہ وہ تمہیں پڑھانے آ جاتے ہیں بغیر کسی
لاچ کے۔“

لیکن خواہ کتنی بھی دیر کیوں نہ ہو جاتی۔ ماسٹر اللہ بخش ضرور آتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ان کا انتظار کر رہا ہوگا۔ انہیں اس بچے سے ہمدردی تھی جسے پولیو نے معذور کر دیا تھا۔ وہ اسے پڑھاتے۔ اس کے لیے لائبریری سے کتابیں لاتے اور اسکول میں آنے والا اخبار بھی وہ اس کے لیے لائبریرین سے مانگ لاتے تھے اور دوسری صبح اسکول جاتے ہوئے وہ اخبار واپس لے جاتے تھے۔ ان کا گھر نزدیک ہی تھا۔ ناصر کا کوئی بہن بھائی نہیں تھا اور ماسٹر اللہ بخش کے بعد یہ اخبار ہی باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ ماسٹر اللہ بخش اسے پڑھاتے، اس سے باتیں کرتے اور وہ اپنی عمر سے کئی گنا بڑے بچوں کی طرح ان سے ملکی مسائل اور سیاست پر بحث کرتا۔ فالٹو وقت میں کاغذ پر پینسل سے جو اسکیچ بناتا رہتا وہ انہیں دکھاتا اور اس پر ان کی رائے لیتا۔ اس کا ہاتھ بے حد صاف تھا لکیریں، زاویے اور قوسیں ابھی ہوئی نہیں بلکہ صاف اور واضح تھیں۔ اس نے مشہور لیڈروں کے جو اسکیچ بنا رکھے تھے ان میں بھی ان کے فیکر بہت صاف اور واضح تھے۔

ماسٹر اللہ بخش اس کا کام دیکھ کر بڑے دکھ سے سوچتے اگر وہ کسی اچھے آرٹ اسکول میں پڑھتا تو یقیناً ایک دن نام پیدا کر سکتا تھا۔ اس کی دونوں ہتھیلیوں کے وسط میں پھیلی ہوئی باریک، گہری، نفیس، روشن دماغی لکیر جس کے اختتام پر تین شاخیں نکل رہی تھیں، اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ یہ لڑکا بیک وقت کئی شعبوں میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ اس کے مڈل کے داخلے کے لیے فارم بھر کر بھیج دیں اور جب وہ کامیاب ہو جائے تو اسے میٹرک کی تیاری کروادیں۔ کیونکہ ان کا اپنا خاندان نو افراد پر مشتمل تھا اور وہ صرف گریڈ ۱۲ کے ملازم تھے۔

ماسٹر اللہ بخش اسے پڑھا کر چلے جاتے تو وہ اخبار میں کھو جاتا لیکن ساتھ ساتھ آمنہ بی بی سے باتیں بھی کرتا جاتا۔

”میں باہر جانا چاہتا ہوں اماں، کسی دوسرے شہر میں۔ جہاں کوئی آرٹ اسکول ہو۔
لاہور یا کراچی۔ میں باہر جا کر پڑھنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن بیٹا یہ ماسٹر صاحب جو تمہیں پڑھاتے ہیں۔“
”جو کچھ ماسٹر صاحب مجھے پڑھاتے ہیں وہ سب تو میں جان چکا ہوں۔ میں کچھ اور جاننا

چاہتا ہوں اماں وہ جو ماسٹر صاحب نہیں جانتے۔ میں مصور بننا چاہتا ہوں اماں۔ دیکھنا ایک دن میں ملک کا سب سے بڑا مصور بنوں گا۔ ماسٹر صاحب کہتے ہیں میرے ہاتھ بالکل فنکاروں جیسے ہیں۔“
وہ اپنی لابی لابی نازک انگلیوں والے نرم گلابی ہاتھ کو دیکھتا۔ ”اماں مجھے کچھ رنگ، برش، کینوس اور ایک ایزل لا دو۔“

اور اماں ہر بار سوچتی کہ اپنے بیٹے کی خواہش ضرور پوری کرے گی مگر وہ جتنا کماتی تھی سارا اس کی دواؤں اور کھانے پینے کی چیزوں پر خرچ ہو جاتا تھا۔ اس سے سلائی کرانے والے نچلے طبقے کے غریب لوگ تھے جو دو دو چار چار روپے کر کے اسے اجرت دیتے تھے اماں کو خاموش دیکھ کر وہ پھر اخبار پڑھنے لگتا اور اخبار دیکھتے دیکھتے ایک دم اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں اور وہ اپنی وہیل چیئر کو ماں کے قریب لے آتا۔

”اماں یہ دیکھو۔“ وہ اخبار اس کے سامنے پھیلا دیتا ”یہ رہی خان انکل کی تصویر..... انہوں نے آج فلاں ادارے کو اتنا چندہ دیا ہے۔“ وہ ہلچلی نظروں سے اماں کی طرف دیکھتا۔ ”اماں تم بھی کبھی جاؤ نا خان انکل کی طرف انہیں بتاؤ کہ میں پڑھنا چاہتا ہوں باہر جا کر۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں ضرور اتنی رقم دے دیں گے کہ میں کسی اچھے آرٹ اسکول میں داخل ہو سکوں اور ابھی پرسوں ہی تو انہوں نے اندھے اور گونگے بچوں کے اسکول کے لیے پانچ ہزار روپے دیئے ہیں اور پھر میں ان کا اپنا ہوں ان کا سگا بھتیجا۔“

اور آمنہ بی بی سوچتی۔ اگر انہیں اتنا ہی اپنے سگے بھتیجے کا خیال ہوتا تو بھائی کے مرنے کے بعد وہ اسے اپنی وسیع کوٹھی کا ایک کمرہ نہ دے دیتے۔ اس کا ماہانہ نہ مقرر کر دیتے..... لیکن وہ ناصر سے کچھ نہ کہتی۔

”ہاں بیٹے کسی دن جاؤں گی لیکن ماسٹر صاحب کہتے ہیں پہلے تم میٹرک کر لو پھر تمہیں کسی اچھے سے آرٹ اسکول میں داخل کرا دیں گے۔ ٹھیک ہے نا۔“

اور ناصر اپنی چیئر کو کھڑکی تک لے جاتا اس کھڑکی سے کوٹھی کا عقبی گیٹ نظر آتا تھا اور خان انکل جب کبھی دوپہر کو فیکٹری سے کھانے کے لیے گھر آتے تھے۔ تو گاڑی کو عقبی سمت میں کھڑی کرتے تھے اور ناصر کھڑکی پر جھکا بڑے احترام، عقیدت اور محبت کے طے جلتے جذبات سے انہیں دیکھتا رہتا کیونکہ اس کے سارے خواب اور ساری امیدیں وہی پوری کر سکتے تھے۔

ناصر نے کئی دنوں بعد آج اخبار دیکھا تھا۔ آج صبح سے اس کی طبیعت کچھ بہتر تھی۔ ورنہ پچھلے کئی دنوں سے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں شدید تکلیف تھی جس سے بخار بھی ہو گیا تھا اور سانس بھی بار بار سینے میں انک جاتا تھا۔ اماں کئی دنوں سے اس کی پٹی سے لگی ہوئی تھی۔ ماسٹر اللہ

جانور کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ وہ بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”آپ بیٹھیں ماسٹر جی، میں ذرا خان صاحب کے ہاں جا رہی ہوں۔“ وہ بڑی بیقراری سے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکلی لیکن لوہے کے بڑے سے گیٹ کے پاس جہاں میاں۔ ایم۔ این خان کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی، وہ ٹھٹھک کر جھجک کر کھڑی ہو گئی۔

”یہ بچوں کا عالمی سال تھا اور پورے جوش و خروش سے منایا جا رہا تھا۔ سال تو اسی طرح منائے جاتے ہیں عورتوں کا سال، بچوں کا سال، معذوروں کا سال، بڑے بڑے پلان اور منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ فنکشن ہوتے ہیں۔ پارٹیاں آرینج کی جاتی ہیں..... اور پھر سال گزر جاتا ہے۔ نیا سال آ جاتا ہے اور نئے سرے سے، نئے منصوبے، نئے پلان بنائے جاتے ہیں..... اور بڑے بڑے عہد کیے جاتے ہیں..... سو یہ بچوں کا سال تھا اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے بڑے بڑے پلان اور منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ مختلف ادارے بچوں کے لیے خصوصی پروگرام اور دھڑا دھڑ فنکشن کر رہے تھے۔ اور ان فنکشنز کی آرڈر میں مفت کی پمپلیٹی ہو رہی تھی۔ مشہور سماجی کارکن میاں ایم۔ این خان نے بھی بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک ادارے کے قیام کا اعلان کیا تھا جس میں بچوں کی فلاح و بہبود کے کاموں کے علاوہ ذہین بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دیے جانے تھے۔ تاکہ مالی مجبوریوں کی وجہ سے ذہین بچوں کی صلاحیتیں ضائع نہ ہوں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اخباری رپورٹرز کو بڑا جذباتی بیان بھی دیا تھا جو بڑی بڑی سرخیوں اور ان کی تصویر کے ساتھ اخبار میں چھپا تھا۔ انہوں نے اس ادارے کا عارضی دفتر اپنی دس کنال پر پھیلی ہوئی وسیع کونٹری میں مہمانوں کے لیے بنائی گئی انیکسی میں قائم کیا تھا اور ادارے کے افتتاح کے سلسلے میں ایک تقریب بھی منعقد کر ڈالی تھی۔ کونٹری کورنگن قلعوں سے سجایا گیا تھا۔ لان میں ایک اسٹیج بھی بنایا گیا تھا کیونکہ سامعین کی دلچسپی کے لیے ایک درائی پروگرام بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ ٹی وی اور اسٹیج آرٹسٹ بلائے گئے تھے۔ معززین شہر کے علاوہ اخباری رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی موجود تھے۔ بچے، رنگ برنگے کپڑے پہنے تیلیوں کی طرح ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ میاں صاحب نے اس افتتاحی پروگرام پر چار ذہین طلباء کو وظائف دینے کا اعلان بھی کرنا تھا۔

سفید وردیوں میں ملبوس بیرے ٹرے میں مختلف مشروب سجائے مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔ پروگرام شروع ہوا تو سب سے پہلے دو کامیڈین مایک ہاتھ میں لیے اسٹیج پر آئے اور اپنی دلچسپ باتوں سے سامعین کو ہنسانے لگے۔ لوگ دل کھول کر ہنس رہے تھے..... اور گیٹ کے ساتھ بنے ہوئے عورت کے خوبصورت سنگی مجسمے کے پیچھے کھڑی آمنہ بی بی یہ ساری کارروائی دھندلی دھندلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اس نے میاں

بخش بھی دن میں دو بار اسے دیکھنے آتے تھے۔ آمنہ بی بی نے بچت کر کے جو تھوڑی بہت رقم اکٹھی کی تھی وہ سب ڈاکٹر کی فیسوں اور دوائیوں میں اٹھ گئی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ ناصر کے پاس ہونے کی خوشی میں وہ ماسٹر صاحب کو کینٹی کا سوٹ دے گی۔ آخر وہ اسے بغیر کسی لالچ کے پڑھاتے تھے لیکن ناصر کی اچانک بیماری میں سب کچھ خرچ ہو گیا تھا۔ ناصر نے بستر پر لیٹے لیٹے اخبار آمنہ بی بی کی طرف بڑھایا۔

”ماں یہ دیکھو۔ خان انکل نے غریب بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظائف دینے کا اعلان کیا ہے۔ میں بھی ماسٹر جی سے ایک درخواست لکھوا کر خان انکل کی طرف بھجوا دوں گا تم تو ان کے پاس جاتی نہیں ہو۔“

”جاؤں گی بیٹا جاؤں گی۔“

”مجھے پتہ ہے تم کبھی نہیں جاؤ گی۔“ ناصر نے شکوہ کیا تو آمنہ بی بی نے منہ موڑ کر اپنے آنسو چھپا لیے۔ وہ اسے نہ بتا سکی کہ ابھی کل ہی ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے اس کی اچانک خان انکل سے مڈبھڑ ہو گئی تھی اور اس نے انہیں بتانے کی کوشش کی تھی کہ ناصر بہت بیمار ہے لیکن انہوں نے ذرا دھیان نہ دیا تھا۔

ناصر یونہی لیٹے لیٹے پرانے اخبار دیکھتا رہا اور آمنہ بی بی مٹھین لے کر بیٹھ گئی۔ لیکن شام ہوتے ہوتے ناصر کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس کے سینے میں ناقابل برداشت درد تھا اور بخار بھی تیز ہو گیا تھا۔ آمنہ بی بی ماسٹر اللہ بخش کو ناصر کے پاس بٹھا کر بھاگی بھاگی ڈاکٹر کے پاس گئی..... ڈاکٹر نے اسے آکر دیکھا۔

”میرا خیال ہے اس کے دل کے والیوم صحیح طرح سے کام نہیں کر رہے جیسا سانس ٹھیک نہیں ہو رہا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اسے لاہور لے جائیں۔ یہاں اس چھوٹے شہر میں علاج ایک ساری سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ وہاں ڈاکٹر نور ہیں ہارٹ اسپیشلسٹ۔ ان کے نام میں خط لکھ دیتا ہوں۔ صحیح تو وہی بتا سکیں گے کہ کیا تکلیف ہے۔“

لیکن آمنہ بی بی تو بالکل تہی دامن تھی۔ اس نے بے بسی سے ماسٹر اللہ بخش کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”بہن حوصلہ رکھیں..... آپ خان صاحب سے مدد کیوں نہیں مانگتیں۔ آخر ناصر ان کا اپنا ہے۔“

”ہاں۔“ آمنہ بی بی نے ناصر کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کیے پڑا تھا جس کی سانس کی آواز بڑی عجیب و غریب سی ہو رہی تھی۔ اس کے حلق سے یوں خرخر کی آواز آرہی تھی جیسے کسی

کھڑکی اس کے بستر کے قریب ہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول دی۔ آج عقی گیت کھلا ہوا تھا۔ کیونکہ انیسویں عقی سمت تھی۔ ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی اور ناصر کے کانوں سے ٹکرائی۔ ننھی بچیاں آواز ملائے گیت گارہی تھیں۔

In the name of God

In the name of human being save our soul.

سانس اس کے سینے میں اٹکنے لگا۔ اس نے بے چینی سے اپنے سینے کو مسلا لیکن سینے میں کہیں درد کی ایک شدید لہر اٹھی۔ وہ کھڑکی پر اوندھا ہو گیا۔ سانس اب بھی اس کے سینے میں الجھ رہا تھا۔ انگ رہا تھا اندر بچیاں گارہی تھیں۔

In the name of truth.

In the name of love.

میاں صاحب کسی کام سے اٹھے تو آمنہ بی بی نے مجسمے کی آڑ سے نکل کر بے چینی سے انہیں بلایا۔

”میاں جی۔“

”تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟“ وہ جھنجھلائے اور اپنے پیچھے آتے کریمے سے کہا۔ ”اس خاتون کو باہر نکال کر گیٹ بند کر دو۔“

امیدوں کے سارے پھول جو آمنہ بی بی بنجر زمین میں اگانے کی کوشش کر رہی تھی..... مر گئے..... وہ لڑکھڑاتے قدموں سے مڑی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی بے چین نظروں نے ناصر کو کھڑکی کی دہلیز پر اوندھا پڑے دیکھا۔ بے قراری سے اسے پکارتے ہوئے لپک کر اس نے اسے سیدھا کیا۔ اس کے ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔

”ناصر، ناصر۔“ ماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہیں ناصر نے آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا۔ اور اس کا آخری سانس اندر ہی کہیں الجھ کر ٹوٹ گیا..... ناصر جس کی گلابی پوروں والی نرم ہتھیلی کے وسط میں لمبی سی سہ شاخہ بے حد گہری۔ باریک روشن دماغی لکیر تھی..... اور اسٹیج پر مائیک ہاتھ میں لیے بے پناہ تالیوں کی گونج میاں ایم۔ ان۔ خان چار ڈہین طلباء کو وظائف دینے کا اعلان کر رہے تھے۔ فضا میں ابھی تک گیت کے بولوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔

In the name of love

In the name of God.

Save our soul. Save our soul.

اور آمنہ بی بی ناصر کی بند آنکھوں، بند ہونٹوں اور سر چہرے کو بے تحاشا چوم رہی تھی۔

صاحب کو ناصر کی کیفیت بتا کر مدد طلب کی تھی تو انہوں نے اسے کتنی بری طرح دھتکار دیا تھا۔ ”اگر تم یہ سمجھتی ہو بی بی کہ میری دولت پر تمہارا بھی کوئی حق ہے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ یہ ساری دولت میں نے اپنے قوت بازو سے حاصل کی ہے۔ ورٹے میں تو مجھے قرضوں کے بوجھ سے لدی ہوئی ماسٹر فیکٹری ملی تھی اور تمہارا خاوند ان قرضوں کو دیکھ کر بھاگ گیا تھا۔“

”میں جانتی ہوں میاں صاحب لیکن ناصر بہت بیمار ہے اور ڈاکٹر نے.....“

”میں نے سارے شہر کے قییموں کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے جیسے میں نے روپے بنانے کی مشین لگا رکھی ہو۔“

وہ غصے میں دندانے ہوئے اندر چلے گئے تھے اور وہ وہیں نگلی مجسمے پر ہاتھ دھرے کھڑکی کی کھڑی رہ گئی تھی..... اس خوش فہمی میں کہ شاید میاں صاحب پھر ادھر سے گزریں تو اس کی بات سن لیں۔ اندر جانے کی تو اس میں ہمت نہ تھی لیکن آج وہ بھی اپنے بیٹے کی طرح بنجر زمین میں امیدوں کے بیج ڈالے بیٹھی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس سے ضرور کوئیل پھوٹے گی اور اس میں پھول لگیں گے۔ کیا پتہ میاں صاحب کا دل پکھل جائے، موم ہو جائے۔ یہ جو اخبار والے آئے دن ان کے متعلق لکھتے رہتے ہیں تو جھوٹ تھوڑا ہی لکھتے ہوں گے۔ یہ تو میں نے خود ہی فضول کی خودداری میں اپنا دامن کھینچ لیا تھا ورنہ کیا پتہ میاں جی..... انہیں ناصر کے ابا پر غصہ بھی تو ہے نا۔ وہ لاکھوں روپے کا قرض دیکھ کر ڈر گئے تھے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پروفیسری کرنے لگے تھے۔ اگر وہ میاں صاحب کے ساتھ ہی رہتے تو آج ناصر کا حصہ بھی ہوتا فیکٹری میں.....“ وہ میاں جی کا انتظار کرنے لگی..... ہنسانے والے فنکار جانے کب کے اسٹیج سے جا چکے تھے۔ اور اب دو بچیاں آ کر گیت گارہی تھیں۔

ناصر نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا ماسٹر صاحب، نہ ماں جی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ماسٹر صاحب یہیں تھے..... انہوں نے اسے بتایا کہ ماں میاں صاحب کے گھر گئی ہے اور شاید انہوں نے پوچھا تھا کہ اگر طبیعت ٹھیک ہو تو وہ چلے جائیں؟ اور اس نے انہیں اجازت دے دی تھی..... ماں نے پتا نہیں میاں صاحب سے کیا کہا ہوگا۔ ماں کو چاہیے تھا میری بی بی ہوئی کچھ تصاویر بھی اپنے ساتھ لے جاتی..... خان انکل بہت خوش ہوتے۔“ میں نے سوچا اور کہنیوں پر زور ڈال کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کونٹھی سے آنے والی مدھم مدھم آوازوں کا شور اس کے کانوں میں آیا۔ وہ چونک پڑا۔

”ارے آج تو خان انکل کے ہاں بڑا زبردست فنکشن ہے۔ ماسٹر صاحب نے اسے بتایا تو تھا۔ اگر ماسٹر صاحب ہوتے تو وہ ان سے کہتا ڈرا دیر کے لیے اسے بھی ساتھ لے جائیں۔“

کل دلہن پر نور تو کیا بر سے گا الٹا نحوست برستی ہے۔“

”ہاں بی دیدوں میں کوئی شرم حیا ہو تو نور بھی اترے۔“ صالحہ بی بی نے کتری ہوئی چھالیہ میں سے سڑی ہوئی چھالیہ الگ کرتے ہوئے حسب معمول اماں کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”اے میں کہتی ہوں یہ اچھن میاں منع نہیں کرتے اپنی لاڈلی کو۔“ اماں بی بی نے پاندان کا ڈھکن بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”لو بھلا اچھن میاں بے چارے کیا کریں گے۔ وہاں تو پورا آوے کا آواہی بگڑا ہوا ہے۔ لونڈیا کی بات تو تم رہنے دو۔ جو رو بیٹا سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ اس عمر میں خضاب لگا کر اور ہونٹوں پر لالی جما کر جوان بن رہی ہیں۔“

”آں.....“ اماں بی بی نے بات کرنے کی کوشش کی لیکن منہ میں اکٹھا ہو جانے والی پان کی پیک ہونٹوں سے بہہ نکلی تو انہوں نے جلدی سے ہاتھوں کی پشت سے ہونٹوں کو صاف کرتے ہوئے صالحہ بی بی کی طرف دیکھا۔

”رہنے دو بی بی۔ یہ اچھن میاں ہی بس جو رو کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں منع نہیں کر سکتے کیا بیٹیا رانی اور بیگم صاحبہ کو۔“

”لوجی وہ کیوں منع کرنے لگے الٹا خوش ہوتے ہیں۔ آخر بیوی انہی کے لیے تو سنگھار کرتی ہے۔“

اور اماں بی بی حیرت سے صالحہ بی بی کی طرف دیکھنے لگیں۔ یہ خوش ہونے والی بات انہیں کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔

”لو بھلا اس میں خوش ہونے والی کیا بات ہے۔ ڈوب مریں اچھن میاں چلو بھر پانی میں۔“ اب وہ بے چاری کیا جانیں۔ ساری زندگی انہوں نے انتہائی سادگی میں گزاری تھی۔ میاں پر بہت ٹوٹ کر پیار آیا تو کانوں میں مویجے کے دو پھول اڑس لیے اور دنداسہ لگا کر اوپر سے پان کھا کر ہونٹوں کو لال کر لیا لیکن اب تو دنیا ہی بدل گئی تھی لمحہ بھر وہ یونہی حیرانی سے صالحہ بی بی کی طرف دیکھتی رہیں اور پھر بڑے رازدارانہ لہجے میں سرگوشی کی۔

”سچ کہنا بہن، زیتون بانو تم سے یہ کوئی دو برس ہی چھوٹی ہوں گی۔ اب بھلا یہ کوئی عمر ہے بننے سنورنے کی؟ اس عمر میں تو آدی بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا ہے۔“

صالحہ بی بی منہ کھول کر نہیں اور بولیں۔

”تم اللہ اللہ کرنے کی بات کرتی ہو۔ وہ تو ہر ہفتے بیٹی کے ساتھ بیوٹی کلینک میں ہاں

بیوٹی کلینک

”اے ہے میں نے کہا تم نے اچھن کی لونڈیا کو دیکھا۔“ اماں بی بی نے چھالیہ پھاٹکتے ہوئے صالحہ بی بی کی طرف دیکھا۔ جن کے ہاتھ میں سروتہ تیزی سے چل رہا تھا پھر باری باری کٹھا چونا چاٹتے ہوئے ان کے بولنے کا انتظار کیے بغیر خود ہی بولیں۔

”اے میں تو کل اکبر میاں کے ہاں میلاد میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ توبہ ہے ہونٹوں پر بھر بھر کے سرخی، منہ پر لالی، پوڈر اور نہ جانے کیا کیا الٹا بھلا تھا ہوا۔ اور بالوں کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا یہ کاکھونسلہ لگ رہے تھے اور دانت بات بے بات نکل رہے تھے۔ لو بھلا کنواری لڑکیاں بھی یوں بھری محفل میں اس طرح منہ پھاڑ کر ہنستی ہیں اور یوں بن سنور کر رہتی ہیں؟“

”ہاں بی۔“ صالحہ بی بی نے ہونٹوں تک بہہ آنے والی پان کی پیک کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”اللہ بخشے میری اماں کو کہا کرتی تھیں کہ لڑکیاں کنوار پنپنے میں ہی یوں بننے سنورنے لگیں تو دلہن بن کر ان پر روپ نہیں آتا۔“

”اور کیا۔“ اماں بی بی نے صالحہ بی بی کے ہاتھ سے سروتہ لے کر چھالیہ کترنے کا شغل جاری رکھا۔ ”ہمارے وقتوں میں تو لڑکی مہینہ بھر پہلے مایوں بٹھا دی جاتی تھی۔ مہینہ بھر لڑکی نہ کپڑے بدلتی تھی اور نہ نہا دھو کر سرمہ کا جل لگاتی تھی۔“

”توبہ ہے۔“ عفو نے ہال سلجھاتے ہوئے سوچا۔ ”پورا ایک ماہ ایک ماہ ایک ہی جوڑے میں، پاگل نہ ہو جاتی ہوگی وہ لڑکی۔ اور جو جون جولائی کا مہینہ ہو تو پھر تو غضب ہی ہو جاتا ہوگا یہاں تو جب تک اس شدید گرمی میں دن میں دو بار نہانہ چکو چین نہیں پڑتا۔“

”ہائے کیسا روپ آتا تھا دلہن بننے پر۔ آسمانی نور برستا تھا دلہن کے چہرے پر اور یہ آج

رنگوانے جاتی ہیں اور وہ کیا کہتے ہیں زیتون نے بتایا تو تھا وہ چہرے کا ماسک لینے فیٹیل کرانے اور پتا نہیں کیا کیا۔“

”یہ موا بیوٹی کلینک کیا ہوتا ہے؟“ اماں بی نے رفو کی طرف دیکھا جو آئینے میں اپنے سیاہ بالوں کی اوٹ میں سے جھانکتے سفید بالوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

”خوبصورتی کا اسپتال سمجھ لیں اماں۔ جس طرح آدمی بیمار ہو تو اسپتال جاتا ہے بس اسی طرح یہ بیوٹی کلینک بھی ہوتے ہیں حسن میں کہیں کوئی کمی محسوس ہو تو لوگ اس کی کو دور کرنے یا چھپانے کے لیے بیوٹی کلینک چلے جاتے ہیں۔“ رفو نے تفصیل بتائی۔

”کیا؟“ اماں بی کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹ سی گئیں۔

”ہاں ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ یہ زیتون کو ہی دیکھ لو چہرے پر ایک جھری تک نہیں اور پیٹو بیٹی رفو کی ہم عمر ہی ہوگی۔ پر دس سال چھوٹی ہی نظر آتی ہے۔“

”ہاں ہاں۔“ اماں بی نے پر خیال انداز میں پھر رفو کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں کی جوت بھی ہوئی تھی اور چہرے پر ایک مایوس کن سی سنجیدگی نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔

اماں بی نے ہمیشہ اسے سادگی کا سبق دیا تھا۔ وہ ہمیشہ سیدھی مانگ نکالے بڑا سادہ پٹہ اوڑھے رکھتی تھی۔ کیا مجال جو کبھی اونچی آواز میں بات ہی کر جائے۔ شکر ہے انہوں نے رفو کو باہر کی ہوا نہیں لگنے دی ورنہ وہ بھی اچھن میاں کی بٹیا کی طرح بھری محفل میں بن سنور کر پڑ پڑ زبان چلاتی۔ انہوں نے فخر سے مسکرا کر صالہ بی بی کی طرف دیکھا اور بولیں۔

”قیامت کے آثار ہیں بی۔ اب بھلا خدائی کاموں میں کیوں دخل دیا جائے۔ اللہ میاں

نے جیسا بنا دیا بنا دیا۔ ناک چٹٹی ہے تو وہ لمبی ہونے سے تو رہی اور اب بال رنگنے سے اور وہ کیا جھریاں مٹانے سے کوئی عمر گھٹ تھوڑی ہی جائے گی۔ رہے گی تو اتنی ہی نا۔“ انہوں نے اپنی دانست میں بڑے پتے کی بات کہی اور ساتھ ہی رفو کو آواز دی۔

”ذرا پانی دینا بیٹی حلق خشک ہو گیا ہے۔ یہ چھالیہ کم بخت حلق میں جا کر اٹک جاتی ہے۔“

ہوئے کلیجہ پانی ہوتا تھا۔ حالانکہ پانوں کا ہی کیا یہاں تو ہر چیز کے بھاؤ آسمان سے باتیں کر رہے تھے پھر کتنا اور چھالیہ کیا مہنگے داموں نہ آتے تھے۔ آٹھ آنے یا روپے کا پتا خریدنے سے کون سی قیمت آجائے گی؟ پر اماں بی کی منطق نرالی تھی کہ وہ اتنا مہنگا پان کا پتا تو کبھی نہ خریدیں گی۔

رفو پانی لائی تو وہ صالہ بی بی کے کان سے منہ جوڑے ہوئے ہوئے سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ”میرے رشتے کی بات ہو رہی ہوگی۔“ رفو نے سوچا اور انہیں گلاس پکڑا کر افسردہ سی اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ کئی دفعہ اس کا جی چاہا تھا وہ اماں بی سے کہہ دے کہ اسے نہیں کرنی شادی وادی۔ پھر اس ساری تنگ دود کا فائدہ؟ یوں بھی مدت ہوئی اس کے دل میں خوبصورت تناسوں اور انجانی خواہشوں نے اپنے پر سمیٹ لیے تھے اور کچی عمر کے کچے خواب تعبیروں کا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئے تھے۔ اب نہ تو اس کے اندر انجانی خواہشیں اودھم مچاتی تھیں اور نہ ان دیکھے سنے اسے پریشان کرتے تھے۔ اسی لیے اس ساری بھاگ دوڑ سے اسے الجھن ہوتی تھی لیکن وہ چاہنے کے باوجود کبھی اماں بی سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس نے اماں بی کی بات کو رد کرنا یا ان سے بحث کرنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔ بس خاموشی سے ہر بات پر سر جھکا دیتی تھی۔ یوں اسے اماں بی پر ترس بھی بہت آتا تھا اور محض اماں بی کی خاطر کئی بار اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی تھی کہ کبھی تو صالہ بی بی اس گھر میں وہ خوش خبری لے کر آئیں جس سے اماں بی کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور وہ کھل کر ہنسیں، کھل کر مسکرائیں لیکن صالہ بی بی بھی بے چاری کیا کرتیں جبکہ خود رفو کا مقدر ہی گہری نیند سویا ہوا تھا اور اس غریب میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ اپنے سوئے ہوئے مقدر کو جگا سکتی۔ رفو کو بچپن میں پڑھی ہوئی ”غریب مجھیرے“ کی کہانی اکثر یاد آتی تھی وہ سوچتی اگر اسے پتا ہوتا کہ اس کا مقدر کہاں گہری نیند سو رہا ہے تو وہ ضرور ہیرا گن بن کر اسے کھوجنے نکل جاتی۔ مگر نگر، جنگل جنگل اسے ڈھونڈتی پھرتی اور اسے جگا کر غریب مجھیرے کی طرح اپنی کھوئی ہوئی خوشیاں دوبارہ پالیتی۔ پر یہ سب تو کہانیوں کی باتیں تھیں اور..... اور اس کا مقدر نہ جانے کہاں سویا پڑا تھا۔ اس نے ہمدردی سے اماں بی کی طرف دیکھا جواب بھی ہوئے ہوئے سرگوشیوں میں صالہ بی بی سے کچھ کہے جا رہی تھیں۔ صالہ بی بی کوئی پیشہ ور مشاطہ نہیں تھیں بلکہ محض اماں بی سے اپنی دوستی کا حق نبھائے جا رہی تھیں۔ اماں بی سے ان کی ملاقات ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرتے ہوئے گاڑی میں ہوئی تھی پھر مہینوں مہاجر کمپ میں اکٹھے رہے۔ وہیں کمپ میں ہی صالہ بی بی کے میاں جنت سدھارے تو اماں بی نے انہیں بڑا سہارا دیا۔ کمپ سے اکٹھے نکلے ایک ہی مکان میں عرصے تک رہے پھر رفو کے ابا نے کوشش کر کے اپنے ہی محلے میں الگ مکان الاٹ کروا دیا۔ اپنی تو کوئی اولاد نہیں تھی۔ سورفو

اپنی بیٹی کی طرح ہی عزیز تھی۔ انہیں سچ مچ رنو کا بہت خیال تھا اور وہ سالوں سے رشتوں کے تالاب میں اپنی مہارت کی ہنسی ڈالے بیٹھی تھیں لیکن ان کی ہر کوشش رائیگاں چلی جاتی تھی کبھی تو دولت کے ترازو میں رنو بی کا پلڑا آسانی سے جا لگتا اور کبھی جہیز کی سولی پر ان کا جسم چڑھا دیا جاتا اور کبھی وہ عمر کے میزان میں مات کھا جاتی تھیں۔ ہر بار رنو کا جی چاہتا وہ اپنی اس بے قدری اور بے وقتی پر خوب چیخ چیخ کر روئے لیکن ہر بار اس کی چیخیں اس کے اندر ہی گھٹ کر رہ جاتی تھیں اور وہ سوچتی تھی کہ اب وہ کبھی ترازو کے اس پلڑے میں کھڑی نہ ہوگی جو انصاف کے میزان پر پورا نہیں اترتا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ لڑکی کا اپنا کوئی وزن نہیں ہوتا سارا وزن تو اس کے جہیز اور بینک بیلنس کا ہوتا ہے جو وہ اپنے ساتھ لاتی ہے مگر ہر بار اماں بی کی التجا کرتی آنکھیں اس کے عزائم کی دیوار کو بھر پوری مٹی کی طرح ڈھا دیتی تھیں اور وہ ہر بار ایک نئی اذیت سہنے کے لیے پھر سے ترازو کے پلڑے میں آکھڑی ہوتی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اسے تو کوئی بن مول بھی نہ لے گا۔ اس کے ہاتھ میں تو جہیز کی وہ فہرست ہی نہ تھی جو اس کے پلڑے کو زمین سے لگا دیتی اور لینے والا ہنسی خوشی اسے لے جاتا۔ اماں بی کتنی کوشش کرتیں، کتنی بھی بچت کیوں نہ کرتیں اس کا جہیز پھر بھی شرائط پر پورا نہ اترتا۔ لڑکے والوں نے ٹیپ ریکارڈر کا مطالبہ کیا تو اماں بی نے جیسے تیسے کر کے ٹیپ ریکارڈر خریدا لیکن تب تک وقت کچھ اور آگے بڑھ آیا تھا اور فہرست میں ٹی وی اور فرج کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اماں بی بھی بے چاری کیا کرتیں؟ کہاں سے قارون کا خزانہ لاتیں؟ لے دے کے ایک مکان تھا جو بھلے وقتوں میں الاٹ ہو گیا۔ رنو کے ابا نے مرنے سے پہلے نچلے حصے میں چند دکانیں بنوادی تھیں جن سے ہزار ڈیڑھ ہزار کی آمدنی ہو جاتی تھی اور ماں بی بی عزت سے زندگی گزار رہی تھیں۔ اگر یہ آسرا بھی نہ ہوتا تو؟ رنو بی کانپ جاتیں۔

اماں بی نے تو انہیں میٹرک کے بعد ہی گھر بٹھالیا تھا کہ کون سا اس نے نوکری کرنی ہے۔ یہ تو رنو کی اپنی ہمت تھی کہ گھر بیٹھے بیٹھے ہی اس نے پہلے ایف اے اور پھر بی اے کر لیا۔ اماں بی تو بہت چڑنی تھیں۔

”انتا پڑھ لکھ کر کیا کرے گی رنو؟ ہم نے کون سا تجھ سے نوکری کروانی ہے۔“

لیکن رنو نے منت سماجت کر کے انہیں راضی کر ہی لیا تھا اور جب سے صالہ بی بی نے انہیں بتایا تھا کہ لوگ آج کل نوکری کرنے والی لڑکی سے رشتے کرنا پسند کرتے ہیں، لڑکی کی شکل و صورت اور خاندان پوچھنے کے بجائے پہلے یہ پوچھتے ہیں۔

”لڑکی نوکری کرتی ہے؟“

”کتنا کماتی ہے۔“

”کیا گریڈ ہے۔“

”ترقی کے امکانات ہیں یا نہیں؟“

تب سے اماں بی نیم رضا مند سی ہو گئی تھیں کہ رنو بی۔ ایڈ کرنا چاہے تو کر لے لیکن جب رنو نے بی۔ ایڈ کرنا چاہا تو پتا چلا کہ بی۔ ایڈ کرنے کی عمر تو گزر چکی۔ کاش وہ دو چار سال قبل ہی بی۔ ایڈ کر لیتیں۔ اب کون ان کا باپ بھائی تھا جو بھاگ دوڑ کر کے خصوصی اجازت دلواتا اور اماں بی کو کئی دنوں تک یہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی کہ بھلا پڑھنے لکھنے میں عمر کی قید کیوں؟ گویا یہ بھی کرنا ہو گیا جو یہاں بھی عمر کی قدغن لگی ہوئی ہے۔ تب رنو نے اپنے طور پر پرائیویٹ اسکول میں کوشش کی۔ کہیں سے تو نکا سا جواب مل گیا اور کہیں کچھ آس بندھی بھی، پتا چلا تنخواہ صرف سو روپے ہے۔ سو روپے تو آنے جانے کے کرائے میں ہی اڑ جاتے سورفون دنوں بنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ وہ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کا کورس کر کے کسی دفتر میں نوکری کر لے کم از کم زندہ رہنے کا کوئی تو جواز ہو۔

اماں بی ابھی تک سرگوشیاں کیے جا رہی تھیں۔

”افوہ..... اب یہ قصہ نہ جانے کب ختم ہوگا؟“ رنو نے سر جھٹک کر سوچا اور کنگھا اٹھا کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اس کے بال ابھی تک پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ باتیں کرتے کرتے اماں بی کی آواز ذرا کی ذرا بلند ہو گئی۔

”ہیں۔ کیا کہتے ہیں وہ لوگ عمر زیادہ ہے؟ اب ایسی زیادہ بھی نہیں۔ تم ہی کہو صالہ اپنی رنو زیادہ سے زیادہ آنتیں برس کی ہی ہوگی نا؟“

رنو نے چونک کر انہیں دیکھا۔ اماں بی نے بڑی صفائی سے اس کی عمر میں سے چھ سات برس اڑا لیے تھے۔ پاکستان بنا تھا تو وہ اچھی خاصی دوڑتی پھرتی تھی اور پاکستان بنے تینتیس برس بیت چکے تھے پھر بھلا صالہ خالہ سے کیا چھپانا وہ انہی کی گود میں تو پل کر بڑی ہوئی تھی۔ دکھ کا ایک تیز نوکیلا کانٹا رنو کے وجود میں اتر گیا۔ اماں بی کتنی سچی، کھری اور صاف گو تھیں اور اب..... کون یقین کر سکتا ہے کہ اماں بی جو اپنی سچی اور کھڑی فطرت کی وجہ سے اکثر عزیزوں کے سامنے بری بن چکی تھیں جھوٹ بھی بول سکتی ہیں۔ رنو کے چہرے پر سایہ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے زور سے آنکھوں کو بھینچتے ہوئے بے اختیار امد آنے والے آنسوؤں کو اندر ہی اندر لی لیا اور ادھر ادھر سے جھانکتے سفید بالوں کو سیاہ بالوں کے پیچھے چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی مگر سفید بال باوجود کوشش کے شریر بچوں کی طرح ادھر ادھر سے جھانکنے لگتے تھے۔ جھنجھلا کر اس نے کنگھی نیچے رکھ دی۔ اس کا حال

تو اس گداگر عورت کی پھٹی پرانی اوڑھنی کی طرح ہو گیا تھا جو سر ڈھانپتی ہے تو جسم عریاں ہو جاتا جسم ڈھانپنے کی کوشش کرتی تو سرنگا ہو جاتا ہے۔

”وہ اپنے اچھن میاں کے سالے بھی تو ہیں نا۔ وہاں بات چلا کے دیکھو۔ شاید کام بن جائے۔“ اماں بی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا تو رفو نے الجھ کر انہیں دیکھا۔ وہ ملتی نظروں سے صالہ بی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”میرا پور پور تمہیں دعائیں دے گا صالہ بس ایک بار میری بچی کا کہیں۔“

رفو ایک دم پھر گئی۔ یہ اماں بی اتنی چھوٹی، اتنی حقیر اور اتنی کتر کیوں ہو رہی ہیں؟ دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے وہ اندر ہی اندر بیچ و تاب کھاتی ہوئی ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”اماں بی۔“ بڑی احتیاط سے سنبھل سنبھل کر نگاہیں جھکائے جھکائے اس نے کہا۔ ”یہ ساری بھاگ دوڑ چھوڑ دیجئے۔ میں ٹائپنگ سیکھ کر نوکری کروں گی اور یہیں رہوں گی آپ کے پاس..... ہمیشہ..... مجھے کہیں شادی وادی نہیں کرنی۔“

اماں بی نے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا اور بولیں۔

”باؤلی ہوئی ہے لڑکی۔ کل کلاں کو میں مرگئی تو اکیلی جان کیا کرے گی۔“

”سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے اماں بی۔ دنیا میں بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔“ رفو کو ٹھیک طرح سے کوئی بات ہی نہیں سوجھ رہی تھی۔

”اور وہاں جا کر تیرے باوا کو کیا جواب دوں گی۔ وہ جو پوچھ لیں کہ میری رفو کو کس کے حوالے کر کے آئی ہے تو بول کیا بتاؤں گی کہ تنہا چھوڑ آئی ہوں اور جو روز قیامت انہوں نے میرا دامن تھام کر شکوہ کیا تو؟“

یہ کہتے کہتے اماں بی کی آواز بھرا گئی اور رفو جو یہ عہد کر کے اماں کے سامنے آئی تھی کہ آج وہ سارا قصہ ہی ختم کر دے گی اماں بی کی کانپتی آواز سے اس کا حوصلہ آپوں آپ دم توڑ گیا کچھ کہنے کے لیے اس نے کئی بار منہ کھولا مگر آواز حلق میں ہی پھنس گئی۔ تب وہ مزی ایک نظر اماں بی کی طرف دیکھا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆☆☆

ہے زیبا تجھے اکبری سروری
میری بار کیوں اتنی دیر کری

اماں بی پاندان گھٹنوں کے نیچے دبائے تخت پوش پر بیٹھی آنکھیں بند کیے بڑے عجز سے گنگنا رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ آنکھیں کھول کر رفو کو بھی دیکھ لیتی تھیں جو دوپٹہ تخت پر رکھے شلوار کے پانچے چڑھائے صحن دھو رہی تھی یوں ہی بے دھیانی میں رفو کو تکتے ہوئے ان کی نگاہیں اس کے ننگے سر پر الجھ کر رہ گئیں۔ رفو کا تو آدھا سر سفید ہو رہا تھا وہ انگلیوں پر اس کی عمر کا حساب لگانے لگیں۔ تینتیس چونتیس، پینتیس اور ایک دم کانپ کر گھبرا کر انہوں نے مٹھی بند کر لی اور رفو کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی جلدی گنگنا نے لگیں۔

ہے زیبا تجھے اکبری سروری

ان کے دل میں اتھل پھل ہو رہی تھی وہ دل ہی دل میں بار بار حساب لگاتیں اور پھر بیچ راہ میں ہی چھوڑ کر زیادہ جوش سے گنگنا نے لگتیں۔

مری بار کیوں دیر اتنی کری

تب ہی برقع سر پر دھرے صالہ بی بی نے صحن میں قدم رکھا۔

”آؤ آؤ صالہ بڑی راہ دکھائی تم نے صبح سے انتظار کر رہی ہوں۔“

رفو نے سرموڑ کر انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھیں اک دم لودے اٹھی تھیں اور چہرہ امید کی روشنی سے چمک اٹھا تھا ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا صالہ بی کی کو دیکھتے ہی ان کی آنکھیں یونہی چمک اٹھتی تھیں۔ چہرہ اس طرح لووینے لگتا تھا لیکن جب صالہ بی بی بے حد نادم، بے حد شرمندہ ہو کر اپنی ناکامی کی داستان سناتیں تو لمبے بھر کو ان کا چہرہ زرد پڑ جاتا تھا اور وہ کتنی ہی دیر تک یونہی گم سم بیٹھی رہتی تھیں۔ ایسے میں رفو میں اماں بی کا چہرہ دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ رفو نے جھاڑو کو ایک طرف کھڑا کیا اور صحن کے ایک کونے میں پڑے ہوئے حمام کے پاس بیٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگی۔

”بس کیا بتاؤں بی.....“ صالہ بی بی نے برقع اتار کر تخت کے ایک کونے پر رکھا۔ ”ادھر

تمہارے پاس آ رہی تھی کہ راستے میں پتو مل گئی۔“

”کون پتو۔ وہی اپنے اچھن میاں کی صاحبزادی؟“ اماں بی نے ابرو چڑھاتے ہوئے

پوچھا۔

”ہاں ہاں وہی۔ بولی خالہ میں ذرا بال کٹوانے بیوٹی کلینک جا رہی ہوں۔ بس یہیں

مارکیٹ تک جانا ہے مگر اکیلی ہوں۔ اماں بھی گھر پر نہیں ہیں۔ تم ساتھ چلی چلو۔“

”اے ہے تو کیا وہ بال بھی کٹوانے لگی۔ اماں باوا منع نہیں کرتے؟ روکتے نہیں اسے؟

اس لڑکی کے تو پر لگ گئے ہیں بچپن میں ایک بار رفو نے بال کاٹے تھے تو دھنک کے رکھ دیا تھا میں

نے۔“

رفو نے مڑ کر ایک نظر اماں بی کو دیکھا اسے ابھی تک وہ چار چوٹ کی ماریا تھی۔

”بس بہن زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے۔ وہ اسلم صاحب کی بہو ہیں نابارات والے دن بھی ”بیوٹی کلینک“ گئی ہوئی تھیں۔ اسلم صاحب نے نکاح کے لیے جلدی کی تو پتہ چلا کہ دلہن بی بی تو ابھی تک بیوٹی کلینک سے ہی نہیں لوٹیں۔“

”ہمیں اسلم اکرم صاحب سے کیا مطلب؟ جو جی میں آئے کریں۔ پراچھن میاں کوئی غیر تو نہیں ہیں نا۔ ان کی عزت اپنی عزت ہے۔ تم چاہے کچھ کہو بہن میں تو اچھن میاں سے ضرور بات کروں گی۔ آخر کو رفو کے ابا کے ماموں کے بیٹے ہیں۔ میرا کبھی کچھ حق بنتا ہے ان پر..... نہ بوا نہ۔ شریف بہو بیٹیوں کے یہ لچھن نہیں ہوتے کہ بال کٹوانے اور چہرے پر میک اپ تھپوانے صبح و شام دوکانوں کے چکر کاٹیں۔“

”کیا بتاؤں بہن زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ وہاں تو یوں لگتا تھا جیسے پورا شہر اٹھ پڑا ہو۔ گھنٹوں انتظار کرنا پڑا تب کہیں جا کر پیو کی باری آئی۔“

”لوگ روز بروز کتنے مصنوعی ہوتے جا رہے ہیں۔ مصنوعی بال، مصنوعی پلکیں، مصنوعی بھنویں اور مصنوعی رنگ۔ خالص حسن نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ جو ہے وہ بیوٹی کلینکس کا مرہون منت۔“ رفو نے سوچا۔

”خیر دو چار روز میں فرصت پاتے ہی اچھن میاں کے ہاں جاؤں گی۔ بات کرتے کون سا میری زبان گھسیتی ہے۔“

”پراچھن میاں برا نہ مان جائیں۔“ صالحہ بی بی نے دبے لہجے میں کہا۔

”اے لو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ میں تو سچ بات کہوں گی۔ کیا بگاڑ لیں گے وہ مرا.....“ اماں بی نے گھنٹوں کے نیچے دبے ہوئے پاندان کو نکال کر صالحہ بی بی کی طرف بڑھایا اور بات جاری رکھی۔ ”تو..... ہاں تو کیا بنا اس بات کا؟“

صالحہ بی بی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چپکے چپکے کہا۔ رفو نے منہ پر پانی کا چھپکا مارتے ہوئے کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ اماں بی کا چہرہ جگہ جگہ سے سچ رہا تھا۔ رفو نے فوراً آنکھیں جھکا لیں۔ اس میں اماں بی کا مایوس چہرہ دیکھنے کی تاب نہ تھی۔

”پتا نہیں اماں بی حقیقت کو ایک بار ہی تسلیم کیوں نہیں کر لیتیں؟ روز روز اذیت کا یہ کھیل کیوں کھیلتی ہیں؟ ہر روز دل کے طاق پر امیدوں کے نئے شیشے سجاتی ہیں اور پھر ان کے ٹوٹنے کا

تماشا کرتی ہیں۔ اسے یہ سارا کھیل محض مداری کا تماشا لگتا تھا۔ اب اس کے اندر نہ تو تمنائوں کی بارش ہوتی تھی نہ خواہشوں کے پھول کھلتے تھے اور نہ امیدوں کی توس و قزح اس کے چہرے پر دکھتی تھی۔ تھوڑی دیر اماں بی بالکل گم صم سی بیٹھی رہیں پھر زیر لب گنگنا نے لگیں۔

میری بار کیوں دیر اتنی کری

اب کے ان کی آواز میں اتنا کرب اور سوز تھا کہ رفو کا دل ہولا گیا لیکن پھر جیسے اچانک ہی انہیں صالحہ بی بی کی وہاں موجودگی کا احساس ہوا تو انہوں نے پلکیں جھپک کر صالحہ بی بی کی طرف دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا کر چپ ہو گئیں۔ رفو نے جلدی جلدی پانی کے دو چار چھینٹے منہ پر مارے اور اٹھ کر لگتی پر لکھے ہوئے تولیے سے منہ پونچھنے لگی۔

اماں نے اسے دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور رفو کو لگا جیسے وہ وہیں کھڑے کھڑے برف کی ہو گئی ہے۔ مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی وہ تخت پوش کے پاس آ کر رکی جھک کر دوپٹہ اٹھایا اور بغیر اماں بی کی طرف دیکھے واپس مڑ کر کچن میں چلی گئی۔

”ارے ہاں صالحہ بی بی۔“ اماں نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ اپنا عثمان آ رہا ہے۔“ ان کا لہجہ بڑا نکھر نکھرا ستھرا تھا۔ چند لمحے پہلے کی مایوسی کا کوئی تاثر ان کے لہجے میں نہ تھا۔

”شاید اماں کے دل میں پھر کوئی نئی امید اپنی کونپلیں نکال رہی ہے۔“ رفو نے چولہے پر چائے کا پانی چڑھاتے ہوئے سوچا۔

”کون عثمان؟“ صالحہ بی بی نے پوچھا۔

”لو بھول گئیں؟ وہی اپنی زہرہ کا بیٹا۔ زہرہ کہنے کو تو ماموں زاد بہن تھی لیکن ہم دونوں میں بڑی محبت تھی۔ دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے۔“ اماں بی ماضی میں جھانک رہی تھیں۔ ”ایک ہی گھر تو تھا بس بیچ میں اک ذرا سی دیوار تھی۔ جب جی چاہتا تھا ٹاپ کر ایک دوسرے کے پاس چلے جاتے تھے۔ پر بڑا رے کیا ہوئے محبتیں بھی تقسیم ہو گئیں۔ شروع شروع میں تو زہرہ نے بڑے خط لکھے پھر ہولے ہولے خط کبھی کبھار آنے لگے۔ سچ تو یہ ہے میں بھی جواب نہ دے پاتی تھی۔ عثمان، اللہ رکھے بڑا پیارا بچہ تھا۔ بڑا سمجھ دار تھا کم عمری میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا بڑی ذمہ داری سے گھر سنبھالا۔

”شادی وادی تو ہو گئی ہوگی۔“ صالحہ بی بی نے پوچھا۔

”نہیں بھئی۔“ اماں بی نے اطمینان سے چھالیہ پھانکتے ہوئے کہا۔ ”کہتا تھا پہلے بہنوں

کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں پھر اپنے متعلق سوچوں گا ابھی پچھلے برس دو چھوٹی بہنوں کو وداع کیا ہے۔ پاکستان دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اب ذمے داریوں سے فارغ ہوا ہے تو آ رہا ہے۔ رنو پیدا ہوئی تو زہرہ کہتی تھی کہ اسے میں اپنے عثمان کی دہن بناؤں گی۔ بس دو برس ہی تو عثمان رنو سے بڑا ہے۔ پر اب تو بیچ میں صدیوں کے فاصلے حائل ہیں۔“ انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

”کیا پتا عثمان میاں پرانے رشتے ہی جوڑنے آرہے ہوں۔“ صالحہ بی بی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو اماں بی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ امیدوں کے مرجھائے ہوئے پودے ایک بار پھر لہلہا اٹھے انہوں نے تو اس طرح سوچا ہی نہ تھا۔

”لو میری عقل پر بھی پتھر پڑ جاتے ہیں۔“ انہوں نے زیر لب کہا اور تخت پوش پر بھیجی درمی کا ایک کونا الٹ کر ایک لفافہ نکالا۔ ”لو یہ دیکھو عثمان کی تصویر چند روز قبل ہی زہرہ نے بھیجی ہے۔“

گھنے بالوں اور چمکتی آنکھوں والے عثمان کسی طرح بھی چالیس برس کے نہیں لگ رہے تھے۔

”ماشا اللہ جوڑی تو خوب رہے گی پر جو اللہ کو منظور ہو۔“ صالحہ بی بی نے تصویر دیکھ کر واپس اماں بی کو لوٹا دی۔ ان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے بھلا اس سے اچھی، اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ نہ خاندان کا جھگڑا اور نہ کوئی اور چکر شاید اسی لیے اب تک رنو کا نصیب نہیں کھلا تھا۔

”اچھا بی بی میں تو چلوں۔“ صالحہ بی بی برقع بغل میں دبا کر کھڑی ہو گئیں۔

”عثمان میاں کب آرہے ہیں؟“

”بس یہی پرسوں تک آجائیں گے۔“ اماں بی نے خوش دلی سے بتایا اور درمی کا کونا ہٹا کر لفافہ نیچے رکھ دیا پھر بیچ اٹھا کر یا جبار یا جبار کا ورد کرنے لگیں۔

☆☆☆

اماں بی کی بوڑھی ہڈیوں میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ ادھر سے ادھر سارے گھر میں چکراتی پھر رہی تھیں عثمان کے لیے خود اپنی نگرانی میں کمرہ صاف کرا کے اس میں نیا بستر بچھایا تھا پردے اتار کے دھوکے بھر لگائے تھے۔ سارا گھر شیشے کی طرح چمک رہا تھا لیکن پھر بھی انہیں اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔

”رنو..... اے رنو۔“

ذرا ذرا دیر بعد انہیں کوئی بات یاد آ جاتی اور وہ رنو کو پکارتیں۔
”دیکھو تو گھڑوچی کے پیچھے سے تم نے ٹھیک طرح سے فرش نہیں دھویا کیسی کاہی جی ہوئی ہے۔“

رنو کے ہاتھ فرش دھوتے دھوتے بری طرح تھک گئے تھے اور اماں کو اطمینان ہی نہیں آ رہا تھا۔

”اب کوئی عثمان ادھر ادھر تھوڑی جھانکتے پھریں گے۔“ رنو نے جل کر سوچا اور دوبارہ فرش دھونے لگی۔ اماں بی کو پھر یاد آ گیا۔

”اے رنو وہ عثمان کے کمرے میں تکیے کا غلاف تو بدلا تھا نا؟ اور ہاں وہ ٹیبل لیسپ اپنے کمرے سے اٹھا کر عثمان کے کمرے میں رکھ دینا۔“

وہ سارے گھر میں بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی تھیں۔ عثمان کے انتظار میں انہوں نے اچھن میاں کے ہاں جانے کا پروگرام بھی کینسل کر دیا تھا اگرچہ دن میں وہ کئی بار پیٹو اور زیتون بانو پر نفرین بھیجتی تھیں اور ساتھ ہی ان سب پر بھی جنھوں نے یہ بیوٹی کلینک کھول رکھے تھے۔

”موئے انگریز خود تو چلے گئے مگر اپنے پیچھے اپنے نقش چھوڑ گئے ہیں۔“ انہوں نے دی ہی دل میں عہد کر رکھا تھا کہ عثمان آجائیں تو ایک بار تو اچھن میاں کے ہاں جا کر انہیں اونچ نیچ ضرور سمجھائیں گی۔ توبہ۔ توبہ۔ جوان لڑکی سرخی پوڈر تھپوانے دکانوں پر ٹکریں مارتی پھرتی ہے۔ اپنا کام تو سمجھانا ہے۔ آگے وہ جانیں ان کا کام۔“

”مگر ہمیں دوسروں سے کیا جس کا جو جی چاہے وہ کرتا پھرے۔“ رنو کو خواہ مخواہ الجھن ہوتی تھی۔

”پاگل ہوئی ہے لڑکی۔ وہ کوئی دوسرے ہیں اور پھر تو لڑکیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔“

اب اماں کو کون سمجھائے۔ رنو تھک کر چپ ہو جاتی اور اماں پھر سے سارے گھر کا جائزہ لینے لگتیں کہ کہیں عثمان یہاں آ کر مایوس نہ ہوں۔

آخر خدا خدا کر کے عثمان آ گئے۔ وہ بالکل اپنی تصویر کی طرح تھے۔ سیاہ گھنگریالے بال، کشادہ پیشانی، شگفتہ چہرہ، ہنستی ہوئی شوخ آنکھیں۔ وہ آتے ہی اماں بی سے لپٹ پڑے۔ ذرا بھی تو اجنبیت نہ دکھائی۔ اماں بی کو وہ بڑے اچھے لگے وہ گھنٹوں انہیں پاس بٹھائے کرید کرید کر زہرہ اور بچوں کا حال پوچھتی رہیں اور عثمان بھی مزے لے لے کر سب کے بارے میں بتاتے

رہے۔ گاہے گاہے وہ رفو کی طرف بھی کوئی فقرہ اچھال دیتے تھے اور ایک دھیمی سی مسکراہٹ رفو کے لبوں پر آ کر ٹھہر جاتی۔

عثمان کو آئے کئی دن بیت گئے۔ اماں بی اس پر ثار ہوتی رہتیں اور اس سے پوچھ پوچھ کے اس کی پسند کے کھانے پکواتیں اس روز انہوں نے عثمان کی پسند پر کچے گوشت کی بریانی، شامی کباب اور شاہی ٹکڑے بنوائے تھے لیکن عثمان صبح سے گئے دو بجے تک نہ لوٹے تو انہیں گھبراہٹ ہونے لگی۔

”خدا جانے بچ کہاں رہ گیا اجنبی شہر ہے پتا نہیں۔“

”آپ تو یونہی گھبرا جاتی ہیں عثمان بھائی بچے تو نہیں۔“ رفو نے کچن کا دروازہ بند کرتے ہوئے اماں بی کو تسلی دی اور چہرے سے پسینہ پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی لیکن اماں بی کے دل کو تو پچھنے لگے ہوئے تھے۔

”ہائے خدا جانے کیا ہوا۔ اب میں عورت ذات اسے کہاں ڈھونڈنے جاؤں۔ کچھ ہو گیا تو زہرہ کو کیا جواب دوں گی۔“ طرح طرح کے وہم ان کے دل میں اٹھ رہے تھے۔ ڈھائی بجے، تین ہوئے اور پھر کلاک نے ساڑھے تین کا گھنٹہ بجایا تو وہ ہولا کر برآمدے سے صحن میں آ گئیں۔

”اللہ تو ہی بچے کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“

انہوں نے گھبرا کر دعا مانگی اور تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور عثمان کو دیکھ کر جھٹ پٹ اس کی بلائیں لے ڈالیں۔

”کہاں رہ گئے تھے بیٹا۔ میں نے تمہارے لیے کچے گوشت کی بریانی پکوائی تھی۔ کب سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔“

”کیا آپ لوگوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔“ عثمان شرمندہ ہو گئے۔ آپ نے کھانا کھالیا ہوتا۔“

”ارے بیٹا کھانے کا کسے ہوش تھا یہاں تو جان پر بنی ہوئی تھی۔“

”آپ تو بالکل اماں کی طرح ہیں خالہ بی۔ میں یہیں تو تھا اچھن ماموں کے ہاں۔ انہوں نے زبردستی کھانے پر روک لیا تھا اور پھر پروین کی دلچسپ باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ بہت مزے کی باتیں کرتی ہے۔ بڑی مشکل سے کل کے وعدے پر اجازت لے کر آیا ہوں۔“ عثمان کی آنکھیں دمک رہی تھیں۔ اماں بی سن ہی ہو گئیں۔

رفو سے کہیے گا ساری بریانی اور کباب چٹ نہ کر جائے میں اپنے جھے کی رات کو کھالوں

گا۔“

عثمان ہنستے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے اور اماں بی وہیں ساکت کھڑی رہ گئیں۔ امید کی وہ کونپل جو عثمان کے آنے سے ان کے دل میں پھوٹی تھی، لمحوں میں مرجھا گئی۔ صالحہ بی بی کی باتیں ان کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

”پتو تو اپنی رفو سے بھی دس برس چھوٹی ہی نظر آتی ہے۔“

”مرد خواہ چالیس برس کا ہو یا پچاس کا نوخیز لڑکی سے ہی شادی کرنا پسند کرتا ہے۔“ اماں بی نے سوچا۔ اور عثمان بھی آخر مرد ہی ہے۔ ایک عجیب سی بے چینی اور اضطراب نے انہیں گھیر لیا اور جلد پاؤں کی بلی کی طرح وہ کبھی صحن اور کبھی برآمدے کے چکر لگاتی رہیں لیکن اضطراب اور بے چینی کم نہ ہوئی۔ رات انہوں نے کتنی مہارت سے عثمان سے اس کی شادی کے بارے میں پوچھا تھا تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے۔

”بس خالہ بی اب تو یہاں سے شادی کر کے ہی جاؤں گا۔ کوئی لڑکی ڈھونڈیے نامیرے لیے۔“ اور ان کے اندر ایک دم ڈھیر سارے پھول کھل اٹھے تھے لیکن اب پتو کے بارے میں بات کرتے ہوئے عثمان کے چہرے پر جو رنگ چمک اٹھے تھے انہیں دیکھ کر اماں بی کا دل ڈوب گیا تھا۔

”اگر عثمان نے بھی رفو کو ناپسند کر دیا تو پھر شاید رفو کی ڈھولی کبھی نہ اٹھ سکے گی۔“ انہوں نے سوچا۔

مایوسی اور ناامیدی نے ان کے دل میں اپنے بچے گاڑ لیے اور وہ تھکی تھکی سی تخت کے کونے پر ٹپک گئیں۔

تو اب عثمان پتو سے شادی کر لیں گے لیکن اگر رفو۔“ اور ان کی پیشانی پسینے میں بھیگ گئی۔ گھبرا کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا، انہیں اور پھر بیٹھ گئیں۔ آنسو دل کے اندر ہی اندر ان کے حلق میں گر رہے تھے۔ کئی بار انہوں نے ہمت کی۔ رفو کے کمرے کی طرف دو قدم بڑھائے لیکن پھر لوٹ آئیں۔ بار بار ان کی پیشانی پسینے سے بھیگ جاتی تھی اور بار بار وہ ہمت کر کے ہار جاتیں۔

”رفو کا چہرہ کتنا پھیکا پھیکا اجڑا اجڑا اور ویران ویران لگتا ہے جبکہ پتو کے چہرے پر بڑی تازگی اور شگفتگی ہے پھر بھلا عثمان پتو کے مقابلے میں رفو کو کیسے پسند کر لیں گے؟ بہت دیر تک وہ بڑے دکھ سے سوچتی رہیں پھر آخری بار ہمت کر کے انہیں۔ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی رفو کے کمرے تک آئیں ان کی سانس یوں پھول رہی تھی جیسے میلوں لمبا سفر طے کر کے آئی ہوں۔

رفو بستر پر اونٹھی لیٹی رسالہ دیکھ رہی تھی اماں بی نے غور سے اس کے اجڑے اجڑے بے رنگ چہرے کو دیکھا۔ وہ بد صورت تو ہرگز نہیں تھی۔ موٹی موٹی غلافی آنکھیں چھوٹا سا دہانہ، گندمی رنگ، پتلی سی لمبی ستواں ناک وہ بلاشبہ پیو کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوبصورت تھی مگر اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی اور گالوں کے گلاب مرجھا گئے تھے۔

”رفو“ انہوں نے آہستگی سے پکارا۔

رفو نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”رفو وہ“ اور آواز ان کے حلق میں ہی پھنس گئی۔ وہ گیلی گیلی آنکھوں سے اسے دیکھتی

رہ گئیں۔

”کیا ہے اماں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ رفو سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”ہاں ہاں۔“ انہوں نے پیشانی سے قطرے صاف کیے۔ ”وہ..... میں یہ کہہ رہی تھی“

لفظ پھر ان کے اندر ہی کہیں گنڈم ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے بے بسی سے رفو کی طرف دیکھا۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ دور کہیں بہت اونچائی پر رسی پکڑے غلاموں میں لٹک رہی ہیں اور رسی ان کے گوشت میں اتری جا رہی ہو۔

”اماں آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“ رفو نے گھبرا کر انہیں بازو سے پکڑا اور بٹھانے کی

کوشش کی۔ انہوں نے دھندلی دھندلی آنکھوں سے رفو کی طرف دیکھا اور ایک ہی بار رسی چھوڑ کر نیچے گہرائیوں میں آ گئیں۔

”وہ..... میں کہہ رہی تھی کہ تم آج اپنی خالہ صالحہ کے ساتھ چلی جانا۔“

انہیں ایسا لگا جیسے ان کا وجود پختہ فرش سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہو۔

”مگر کہاں اماں۔“ رفو نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ارے وہی کیا نام ہے اس کا۔ ہاں وہی موا خوبصورتی کا اسپتال۔“

”بیوٹی کلینک۔“ رفو نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔ لمحوں میں وہ ساری حقیقت پانگنی

تھی اسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل سینے سے نوج کر پتھریلی دیوار پر دے مارا ہو۔

”ہاں ہاں وہی موا بیوٹی کلینک۔“

اماں بی نے نگاہیں چرا لیں اور آنکھوں سے انڈ پڑنے والے سیلاب کو چھپانے کے لیے

تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئیں اور رفو حیرانی، دکھ اور کرب کی ملی جلی کیفیت میں آنکھیں پھاڑے پلتے پردے کو دیکھتی رہ گئی۔

اور اتج

سارے میں تارا آپا کی دھوم مچی تھی۔ ان کے حسن کی، ان کے سلیقے کی، ان کی نفاست کی اور ان کی ذہانت کی۔ انہوں نے چھوٹی سی عمر میں ہی نفیس احمد کی جمع کی ہوئی ساری کتابیں چاٹ ڈالی تھیں۔ ”کشف المحجوب“ سے لے کر ”شاہنامہ اسلام“ تک نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں سے لے کر کرشن چندر اور منٹو کے افسانوں تک۔ جب وہ نفیس احمد سے ”اسرار خودی“ اور مثنوی مولانا روم کے کسی شعر پر بحث کرتیں تو ان کے اندر ایک انجانی سی خوشی اتر جاتی۔ انہیں لگتا جیسے ان کے اندر یہاں وہاں ہر جگہ روشنیاں جل اٹھی ہوں۔ وہ خود بھی بڑے باذوق تھے۔ ابتداء میں کچھ شعر بھی کہتے تھے لیکن پھر غم روزگار میں الجھ کر علم و ادب سے ان کا ناٹھ کچھ ٹوٹ سا گیا تھا لیکن جب وہ تارا کو کتابوں میں کھوئے ہوئے دیکھتے تو مسکراہٹ خود بخود ان کے ہونٹوں پر آ جاتی۔

تارا کو صرف کتابوں سے ہی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ خود بھی بڑے خوبصورت شعر کہتی تھیں۔

جب وہ اپنی کوئی غزل، کوئی نظم یا کوئی شعر نفیس احمد کو دکھاتیں، تو ان کے اندر غرور کی لہریں سی رقص

کرنے لگتیں اور وہ بے اختیار ہو کر اپنی بیگم کو بلاتے۔

”سن رہی ہو تارا کی ماں! تارا نے کتنی پیاری بات کتنی خوبصورتی سے شعر کے قالب

میں ڈھالی ہے۔ ہم اپنی تارا کو بہت سا پڑھائیں گے، میری بیٹی ایم۔ اے کرے گی۔“

”بس، بس رہنے دیجئے۔“ وہ انہیں فوراً ٹوک دیتیں۔

”تارا میٹرک کر لے تو میں اس کی شادی کر دوں گی۔“

”ہاں ہاں دیکھا جائے گا۔“

وہ اس کے گرد اپنے بازو جمائل کر لیتے اور ننھا سا نوید بھی ان کی تائید کرتا۔

”ہاں تارا آپا بہت سارا پڑھیں گی۔ اتا سارا۔“ وہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہتا تو وہ پھر احتجاج کرتیں۔

”دیکھئے میں کہہ رہی ہوں تارا کالج میں نہیں پڑے گی۔ بس بہت پڑھ لیا اس نے..... اے تارا امتحان کب ہو رہے ہیں تیرے؟“

وہ تارا سے مخاطب ہو جاتیں اور نفیس احمد چپ ہو جاتے کہ ابھی تو تارا کے امتحان میں پورے تین ماہ باقی تھے سو ابھی سے جھگڑا کرنے کا فائدہ، لیکن تارا کو بہت جلد بیانے والی ماں تارا کے امتحان سے پہلے ہی چند روز پیارہ کر چلی بسیں، اور تارا ڈگریوں پر ڈگریاں لیتی چلی گئیں۔

اب وہ پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھیں۔ ان کے حسن میں چودھویں رات کے چاند کا سا نکھار آ گیا تھا اور ان کا کلام معروف ادبی پرچوں میں چھپنے لگا تھا۔ اس چیز نے انہیں مغرور نہیں کیا تھا بلکہ ان کی شخصیت میں ایک انوکھی تمکنت، ایک نرالہ وقار پیدا کر دیا تھا ان کی نفاست ان کا سلیقہ خود بولتا تھا۔ گھر کے چمکتے ہوئے فرش سے، دھلے ہوئے صاف ستھرے بیڈ کورز سے اور ان کی سلیجی سلیجی ذہن باتوں سے، ان کے باوجود اگر اب تک ان کے لیے کوئی معقول رشتہ نہیں آیا تھا تو یہ نصیبوں کی بات تھی۔ مقدر کے کھیل تھے اور مقدر کے سامنے تو آدمی کے سارے فیصلے، ساری تدبیریں اور ساری عقل دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور وہ کسی ظالم فاتح کی طرح آدمی کے خوابوں، خواہشوں اور تمنائوں کو روندتا ہوا گزر جاتا ہے۔ نفیس احمد نے بھی تارا کے لیے بڑے خوبصورت خواب دیکھے تھے۔ ہر باپ کی طرح ان کی بھی یہ خواہش تھی کہ ان کی یہ ہیرا بیٹی زندگی کے سارے سکھ پائے۔ خوشیاں اس کے قدموں میں لوٹیں، اور مرتبیں اس کی جھولی میں سدا بہار پھولوں کی طرح ہمیشہ کھلتی رہیں۔ لیکن تارا کا مقدر ان کی خواہشوں، ان کے خوابوں اور ان کی تمنائوں پر کسی مطلق العنان حکمران کی طرح ہنستا رہتا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اب تک تارا کے لیے کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔ کئی لوگوں نے اپنا دامن ان کے سامنے پھیلا یا تھا لیکن نفیس احمد کی مصلحتوں، ان کی روایتوں اور ان کی قدروں نے ہر بار سائل کو خالی ہاتھ لوٹا دیا۔

شیخ صاحب نے جو ان کے بہت گہرے دوست تھے اور پچھلے بارہ سال سے وہ بلا ناغہ ان کے ہاں شام چار بجے سے رات دس بجے تک بیٹھے شطرنج کھیلے تھے ایک بار بڑی لجاجت سے تارا کو بہو بنانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تو نفیس احمد نے بڑی بے نیازی سے پیادے بساط پر سجاتے ہوئے کہا تھا۔

”ہم سید لوگ اپنی بیٹیاں غیروں میں نہیں دیا کرتے۔“

حالانکہ وہ جانتے تھے جبار بڑا ذہین، بڑا سلیکھا ہوا اور بڑا قابل لڑکا ہے اور تارا کے لیے بے حد موزوں لیکن شیخ صاحب کے سمجھانے کے باوجود انہوں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ تارا کی شادی خاندان میں ہی ہو۔ حالانکہ خاندان کا کوئی لڑکا بھی ان کی نظر میں نہ چلتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ خاندان کے کسی بھی لڑکے کے ساتھ تارا کو بیاہ دیں گے اور انہیں بڑا یقین، بڑا اعتماد تھا کہ وہ ان کے فیصلے کو رد نہیں کرے گی اور سچ سچ تارا نے ان کے فیصلے کو اپنے ماتھے کا جھومر بنالیا تھا اور بڑی فرمانبرداری، بڑی خاموشی سے نفیسہ بیگم کی لائی ہوئی انگلی پہن لی تھی۔ حالانکہ نوید نے کئی بار ان کے گلے میں بانٹیں ڈال کر اور لہجے میں پیار سمو کر پوچھا تھا۔

”آپ خوش تو ہیں نا تارا آپا؟“

اور وہ مسکراتی تھیں۔ حالانکہ مسکراتے ہوئے ان کی آنکھوں میں تارے جھلملانے لگتے تھے اور وہ سوچتی رہ جاتی تھیں کہ یہ لڑکیوں کے نصیب بھی کیسے ہوتے ہیں۔ چاہنے والے، محبت کرنے والے، پیار کرنے والے ماں باپ انہیں پڑھاتے ہیں۔ مصور بناتے ہیں، شاعر بناتے ہیں، ادیب بناتے ہیں اور پھر ان کی شادی کسی میٹرک پاس مونگ پھلی کے بیوپاری سے کر دیتے ہیں۔

اور نوید کہتا رہتا۔

”پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ آپ خوش نہیں ہیں۔“

”پنگے! نا خوشی کی کیا بات ہے۔“ وہ اس کی بے چینیوں اور محبتوں پر مسکراتی رہتیں۔

”سچ تو یہ ہے امجد بھائی آپ کے ساتھ بالکل سوٹ نہیں کرتے، آپ شعر کہتی رہئے گا اور وہ مونگ پھلی کا حساب لکھتے رہیں گے۔“

نوید کی آواز میں دکھ رہا ہوتا اسے اپنی بہن سے جو عمر میں اس سے پورے چھ برس بڑی تھی۔ بڑی انوکھی سی محبت تھی اور وہ ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس سے پیاری پیاری باتیں کیے جاتیں۔ تاکہ اس کے دل کا غبار دھل جائے اور وہ ان کی گود میں سر رکھے کہتا رہتا۔

”کیا ہی اچھا ہو جو امجد بھائی خود ہی اپنی انگلی واپس لے لیں۔“

اور تارا کے دل کی بات شاید خدا نے سن لی تھی کہ ایک دن نفیسہ بیگم آئیں اور آتے ہی اپنا دوپٹہ نفیس احمد کے قدموں میں ڈال دیا اور معافی مانگنے لگیں کہ محسن میاں نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ یہ رشتہ توڑ دیں ورنہ وہ ان کی بیٹی کو جو محسن میاں کی بہو تھیں طلاق دلوا دیں گے۔ حالانکہ

”تارا سید! آپ اتنی کھٹور کیوں ہیں۔ خیر میرے لیے اتنا اطمینان ہی کافی ہے کہ میری تحریر کو آپ کی نظریں چومتی ہوں گی، اور اس کا اندازہ آپ کی ترمیم شدہ نظم دیکھ کر ہوا۔“

کتنا پاگل تھا وہ اتنی سی بات پر ہی خوش ہو جاتا تھا۔ کتنی دفعہ تارا نے سوچا تھا اسے خط لکھے اور سمجھائے کہ دیواروں سے سرنگرانے والوں کو سوائے زخموں کے کچھ نہیں ملتا۔ لیکن ہر بار وہ قلم تھام کر رہ جاتیں۔ نہیں ایک بار راستہ کھل جائیں تو پھر ہمیشہ کے لیے کھل جاتے ہیں۔

ایک بار اس نے لکھا کہ وہ شارحہ جا رہا ہے اور پھر شارحہ جا کر بھی وہ باقاعدگی سے خط لکھتا رہا۔

”تارا سید! اپنے ملک میں سر اٹھا کر اور گردن اکڑا کر چلنے والے لوگ یہاں سڑکوں پر پتھر کوٹتے ہیں۔ ان عرب ریاستوں کی گرمی ان کی رکتیں جھلسا دیتی ہے اور محنت کرتے کرتے ان کے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے ہیں اور جب وہ گھروں کو لوٹتے ہیں تو انہیں چاہنے والے ان سے محبتیں کرنے والے، نہ ان کے ہاتھوں کے چھالوں پر مرہم رکھتے ہیں اور نہ ان کی نگاہیں ان کی مجلسی ہوئی رکتوں پر پڑتی ہیں۔ وہ تو بس رنگین ٹی وی، ٹیپ ریکارڈر اور وی سی آر میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ یہ کتنی خود غرض دنیا ہے اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ میں فرسٹ کلاس ایم اے انگلش کرنے کے بعد محض پیسے کی تمنا میں یہاں ٹرکوں سے اترنے والے تعمیراتی سامان کی نگرانی کرتا ہوں۔“

اور پھر وہ آخری خط جو اس کے کسی دوست نے لکھا تھا۔

”ایم۔ اے بلوچ مر گیا۔“

وہ ایک نئی تعمیر شدہ بلڈنگ کے کام کی نگرانی کرتے ہوئے تختے سے پھسل کر گر پڑا تھا اور ٹھیک آٹھ گھنٹے بعد اسپتال میں جان دے دی تھی لیکن مرنے سے پہلے اس نے اپنے دوست سے کہا تھا کہ وہ اس کے مرنے کی اصلاح تارا کو ضرور دے دے کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ وہ تھک گیا ہے اسے لکھ دینا۔

”میں تھکا نہیں ہوں، لیکن موت نے مجھے شکست دے دی ہے۔“

یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔

اور اب اس کی میت اس کے گاؤں پہنچا دی جائے گی اور ساتھ ہی وہ غیر ملکی کنسرکشن کمپنی اس کے لواحقین کو پچاس ہزار روپے بھی بھجوا دے گی۔

وہ خط ہاتھوں میں لیے کتنی ہی دیر تک ساکت بیٹھی رہی تھیں اور ان کے کانوں میں اس کے لکھے ہوئے جملے گونجتے رہے تھے۔

محسن میاں، نفیس احمد کے سگے چچا زاد بھائی تھے۔ وہ اس توہین کا بدلہ لینا چاہتے تھے جو نفیس احمد نے تارا کا رشتہ ان کے چھوٹے بیٹے سکندر کو نہ دے کر کی تھی اور نفیس احمد نے صرف رشتہ دینے سے ہی انکار نہیں کیا تھا بلکہ وہ تو غصہ سے آگ بگولہ ہو گئے تھے کہ محسن میاں کو جرأت کیسے ہوئی کہ وہ اپنے آوارہ لفٹے اور بد معاش بیٹے کے لیے تارا کا رشتہ مانگیں حالانکہ دادی اماں نے انہیں سمجھانا چاہا تھا کہ بیٹے اور گھوڑے تو سورنگ بدلتے ہیں اور پھر سکندر تو اپنا خون ہے لیکن وہ تو ہتھے سے ہی اکھڑ گئے تھے اور انہوں نے محسن میاں کو صاف جواب دے دیا تھا۔

نفیسہ بیگم کا دو پٹہ ان کے سر پر ڈالتے ہوئے انہیں یہ ساری بات یاد آگئی تھی اور وہ نفیسہ بیگم کی مجبوری بھی جان گئے تھے اور انہوں نے تارا کی انگوٹھی روتی ہوئی نفیسہ بیگم کی جھولی میں ڈال دی تھی اور گھنٹوں سوچتے رہے تھے کہ آج کل دنیا کتنی سوداگر ہو گئی ہے اور اس دنیا میں بیٹیوں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔ ان کے سودے کیے جاتے ہیں۔ کبھی جہیز کی کسوٹی پر انہیں پرکھا جاتا ہے اور کبھی شرائط کے ترازو پر ان کا وزن کیا جاتا ہے۔ انہوں نے تو اپنی تارا کے لیے ڈھیروں جہیز بھی اکٹھا کر رکھا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں ان کے مقدر کے بند دروازے کھلتے ہی نہ تھے۔ ہاں دل کے دروازوں پر کئی بار دستک ہوئی تھی اور وہ مضبوطی سے کواڑ بند کیے بیٹھی رہی تھیں اور دستک دینے والے تھک ہار کر چلے گئے تھے۔ لیکن یہ دستکیں اب بھی ان کے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں۔

انہیں وہ جی ایم۔ بلوچ اکثر یاد آتا تھا جسے انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن جو انٹر کالجیٹ مشاعرے میں انہیں دیکھ کر اپنا دل ہار بیٹھا تھا اور انہیں باقاعدگی سے خط لکھتا تھا۔ ان کے کلام پر تنقید کرتا تھا اور اکثر اظہار محبت بھی کر جاتا تھا کئی دفعہ انہوں نے سوچا تھا کہ وہ اس کے خط کو بغیر پڑھے ہی پھاڑ دیں لیکن وہ پڑھے بنا نہ رہ سکتی تھیں کیونکہ وہ اس کی ذہانت سے متاثر تھیں اور ذہین لوگ ان کی کمزوری تھے۔ اس کی تنقید تارا کے کلام میں نکھار پیدا کر دیتی تھی۔ ہولے ہولے وہ بے باک ہوتا گیا اور واضح لفظوں میں دل کی بات کہنے لگا۔ لیکن تارا نے کبھی اس کے خط کا جواب نہیں دیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جو راستے منزلوں کی طرف نہیں جاتے ان پر چلنے والے راہ ہی میں بھٹک جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ مستقل مزاجی سے لکھ جاتا۔

”محبت اور پرستش میں کیا فرق ہوتا ہے تارا سید! شاید آپ کو معلوم نہیں۔ پرستش میں آدمی صلے کی تمنا نہیں کرتا اور میں آپ کی پرستش کرتا ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو چاہتا رہوں۔ پوچھا رہوں۔“

کبھی وہ لکھتا۔

مدتوں وہ ککب بن کر ان کے دل میں رہا تھا اور یہ ایم۔ اے بلوچ ہی نہیں، انہیں تو وہ عمر ارسلان بھی بڑی شدت سے یاد آتا تھا جس نے محض ان کی خاطر جوگ لے لیا تھا اور جو ایک بے حد عام سی شام کو نفیس احمد کے ساتھ ان کے گھر آیا تھا۔

”یہ پروفیسر عمر ہیں نوید کے دوست، عثمان کے بڑے بھائی۔“ نفیس احمد نے تعارف کرایا۔

”یہ آج سے نوید کو پڑھانے آیا کریں گے۔ بیٹے انہیں چائے پلا دینا۔“
اور وہ شطرنج کھیلنے چلے گئے تھے اور عمر ارسلان کی نظریں وارنگی سے ان کا جائزہ لیتی رہی تھیں۔ یہ تو ان کی سوچوں اور ان کے خیالوں سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ عثمان اور نوید سے سن سن کر انہوں نے اس کا جو خیالی پیکر بنایا تھا وہ اس کے وجود کے سامنے بڑا حقیر لگ رہا تھا۔

”اچھا تو آپ ہیں تارا سید؟“
وہ مسکرائیں لیکن وہ اس طرح وارنگی سے اسے دیکھے گئے تو نوید نے انہیں ٹوکا۔
”آپ کیا دیکھ رہے ہیں عمر بھائی؟“

”دیکھ رہا ہوں کہ یہ کس آسمان کا تارا آپ کے آنگن میں ٹوٹ کر آگرا ہے۔“
نوید ہنس دیا تھا اور وہ سرخ پڑ گئی تھیں اور عمر ارسلان کو یوں لگا تھا جیسے وہ دل جسے انہوں نے اب تک بڑا سنبھال سنبھال کر رکھا تھا ان کے ہاتھوں سے نکل گیا ہو اور حقیقت کی سخت کھردری چٹان پر کھڑی تار نے سوچا تھا۔ جانے لوگ کیسے نگلی چٹانوں پر کھڑے ہو کر خلستان کے خواب دیکھ لیتے ہیں۔ تعبیر ملے نہ ملے زندگی تو سہل ہو جاتی ہے نا۔ لیکن ان کی تو آنکھیں بھی بے خواب تھیں۔ شعور و آگہی کا جو بورڈ انہوں نے اپنے گلے میں لٹکا رکھا تھا وہ انہیں غلط راہوں پر چلنے نہیں دیتا تھا۔ تار نے پہلے ہی دن عمر ارسلان کی نظروں کا مفہوم جان لیا تھا۔ لیکن وہ انجان بنی رہیں عمر، ان سے دنیا کے ہر موضوع پر بات کرتے۔ انہیں باتیں کرنے کا فن آیا تھا۔ بات کرتے کرتے وہ کوئی ذومنی بات کہہ جاتے تب بھی وہ انجان بنی رہتیں۔ وہ اکثر کہتے۔

”تمہارے فن اور تمہاری شخصیت میں بڑا تضاد ہے تارا سید! تم جو اپنی تحریروں میں بہت حساس، بہت نرم دل نظر آتی ہو، درحقیقت بہت سنگ دل ہو۔ ہے نا؟“

”شاید!“

وہ مسکرا دیتیں۔ ”تمہیں، کیا پتا عمر ارسلان میرا دل کتنا نازک ہے۔ پھولوں کی پتیوں سے زیادہ حساس جو ذرا سی ہوا سے بکھر جاتی ہیں اور کالج سے زیادہ نازک جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ

”محبت عبادت ہے تارا سید! اور میں یہ عبادت کر رہا ہوں۔ جب چاند نکلتا ہے تو میں سوچتا ہوں یہ چاند وہاں بھی نکلتا ہوگا۔ اس کی کرنیں تمہارے رخساروں کو اور تمہاری زلفوں کو چومتی ہوں گی۔“

وہ کس قدر جذباتی تھا۔ کانوں میں اس کے لفظ گونجتے رہے اور بچھتاوا ان کے وجود میں ڈنک مارتا رہا۔ کاش وہ اسے کبھی خط ہی لکھ دیتیں۔ اسے اتنی جلدی مر جانا تھا تو وہ اسے یہ تھوڑی سی خوشی تو دے دیتیں۔

اس روز وہ سارا دن دل گرفتہ سی رہی تھیں اور ان کے جی نے چاہا تھا کہ وہ اس اجنبی شخص کے لیے روئیں۔ اس کے اس المیے پر وہ جو اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور اپنے ذہن اور سوچوں کے بالکل برعکس روپے کمانے گیا تھا۔ تاکہ اپنی بہنوں کی ڈولیاں عزت سے اٹھا سکے۔ لیکن جس کا مشن بچ راہ میں ہی ادھورا رہ گیا تھا۔ پتا نہیں اور کتنے سارے لوگ یوں ہی اپنے مشن بچ راہ میں ادھورے چھوڑ کر مر جاتے ہوں گے اور انہیں سمندر پار بھیجنے والی ان کی مائیں، بہنیں اور بیویاں راہ نکلتی رہ جاتی ہوں گی۔

”کیا ہم تھوڑے سے قناعت پسند نہیں ہو سکتے۔ یہ کلرڈ ٹی وی۔ وی سی آر۔ آخر یہ سب زندگی کے لیے ضروری تو نہیں۔ کاش ہم اپنی خواہشوں کو تھوڑا سا محدود کر سکتے۔“ وہ اداسی سے سوچتی رہیں اور دور بلوچستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والے ایم۔ اے بلوچ کی ماں اور بہنوں کے چہرے ان کے تصور میں جھللاتے رہے۔

”اس چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والی تمہاری ماں اور بہنوں نے پتا نہیں تمہاری موت کی خبر کیسے سنی ہوگی۔ شاید ان کے دل پھٹ گئے ہوں گے۔ ان کا سینہ فگار ہو گیا ہوگا اور وہ پاگلوں کی طرح تمہیں پکارتی ہوں گی لیکن جب..... جب اس کنسرکشن کمپنی کا نمائندہ انہیں پچاس ہزار روپیہ پیش کرے گا تو شاید تب ان کے آنسو تھم جائیں گے۔ ان کی سسکیاں رک جائیں گی۔ بہت سی ادھوری خواہشیں ان کے اندر یوں اودھم مچائیں گی کہ وقتی طور پر تمہاری موت کا دکھ پچاس ہزار کی بڑی رقم تلے چھپ جائے گا اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ ایم۔ اے بلوچ کہ تمہاری ساری خوبصورتیاں اور ساری خوبیاں یہ ظالم، قاتل پیسے چھپا دیں گے۔ یہ بڑی سفاک حقیقت ہے اور اس کا ادراک ابھی ابھی مجھ پر ہوا ہے۔ پچاس ہزار روپے ایک اتنے اچھے، اتنے اعلیٰ اتنے ارفع آدمی کی قیمت تو نہیں ہو سکتے؟“

وہ کتنے ہی دن افسردہ رہی تھیں بات کرتے کرتے ان کی آنکھیں جھللا اٹھتی تھیں۔

جاتا ہے۔ لیکن تم اسے کبھی نہیں جان سکو گے عمر ارسلان!“
اور کبھی وہ کہتے۔

”تم جو دل کے گداز جذبوں کو لفظوں کا روپ دیتی ہو، درحقیقت محبت کے سچ تک نہیں جانتیں۔“

وہ ہنس دیتیں۔

”تم جس بات کا جواب نہیں دے سکتیں اسے نظر انداز کیوں کر دیتی ہو تارا؟“ وہ چڑ جاتے۔

”بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے جواب سے دکھ ہوتا ہے اور میں کسی کو دکھ نہیں پہنچاتی۔“

وہ ہنستے۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو، پتا نہیں تم نے کتنوں کو دکھ دیا ہوگا۔“

اور انہیں وہ اہم۔ اے بلوچ یاد آ جاتا اور وہ سوچتیں تم غلط راستے پر جا رہے ہو عمر ارسلان میں تمہیں کس طرح بتاؤں اور کیسے سمجھاؤں کہ میں کتنی مجبور ہوں۔
ہونٹوں کے اجنبی بلاوے۔

میرے دل کے دروازے پر اس طرح دستک دیتے ہیں۔
جیسے پیاسی بوندیں۔

سیپ کے بند ٹپوں پر اپنا سر چنٹیں۔

اور تمہاری نظریں۔

غیر مرئی کمندوں کے جال مجھ پر پھینکتی ہیں۔

اور مجھے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

لیکن میرے پاؤں میں تو۔

بھاری زنجیریں ہیں۔

کہنہ روایات کی۔

لیکن تم اسے کیوں نہیں سمجھتے پروفیسر عمر ارسلان کہ میں وہ بات تم سے کبھی نہیں کہہ سکتی جسے سننے کے لیے تمہارے کان ہر وقت منتظر رہتے ہیں اور جس کا اقرار بارہا تمہاری آنکھوں میں اودھم مچاتے، بے لگام جذبوں نے مجھ سے چاہا ہے۔ تم سمجھتے ہو میں تمہارے جذبوں سے بے خبر

ہوں۔ لیکن تمہیں نہیں معلوم مجھے اپنے خلاف کتنا بڑا جہاد کرنا پڑتا ہے۔ یوں جیسے کوئی تیز طوفانی ہواؤں میں بغیر چٹنی کے کواڑوں کو دونوں ہاتھوں سے بند کیے بیٹھا ہو اور اسے ڈر ہو کہ طوفانی ہوا کا کوئی بھی جھونکا انہیں زبردست قوت سے کھول دے گا اور تم ان کمزور لحوں سے فائدہ اٹھا کر اندر در آؤ گے لیکن میں آخری وقت تک ان ٹپوں کو مضبوطی سے تھامے بیٹھی رہوں گی۔“

لیکن ان کی ان ساری سوچوں سے بے خبر عمر ارسلان ان کے راستے میں چراغ جلاتا چلا گیا۔ انہیں دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں شوخیاں ناچنے لگتیں اور تارا اس کی آنکھوں کے یہ دیکھتے رنگ دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتیں۔

”اگر یہ رنگ نکھر گئے تو کیا ہوگا عمر ارسلان؟“

مگر وہ شوخی سے اسے دیکھتے ہوئے ساقی فاروقی کے شعر گنگنا تے رہتے۔

کوئی ابر اڑے کسی قلمز سے، رس برسے میرے دیرانے پر

کوئی جلتا ہو، کوئی کڑھتا ہو، میرے دیر سے واپس آنے پر

اور وہ گھبرا کر وہاں سے چائے کے بہانے اٹھ جاتیں مگر اس کا وہ بھاری لہجہ، اس کے وہ

بے باک لفظ تارا کا پیچھا کرتے رہتے۔

کوئی سانس بھرے میرے پہلو میں

کوئی ہاتھ دھرے میرے شانے پر

کوئی دبے دبے لہجے میں کہے!

تم نے اب تک بڑے درد سے!

اور انہیں لگتا جیسے احتیاطیں بودی ثابت ہوں گی اور ساری ریاضت پر یہ شخص لمحہ بھر میں

پانی پھیر دے گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ عمر ارسلان کی والہانہ چاہت تارا کے پاؤں اکھیر دیتی انہوں

نے اپنا پروپوزن بھجوا دیا لیکن نفیس احمد نے بڑی خوش اخلاقی سے انکار کر دیا۔

”بلاشبہ عمر بڑے قابل اور اچھے انسان ہیں لیکن ہم اپنی بیٹیاں غیروں میں نہیں دیا

کرتے۔“

اور نوید ان سے الجھ پڑا تھا۔

”آپ نے آپنی سے تو پوچھا ہوتا۔“

اور نفیس احمد کا رنگ ذرا کی ذرا سفید پڑا تھا اور پھر سرخ ہو گیا تھا اور انہوں نے اسی

وقت تارا کو بلا کر پوچھا تھا۔

”کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

اور تارا نے دل کے سارے دروازوں پر بھاری دہیز پردے ڈالتے ہوئے بڑے نکھرے نکھرے، سترے سترے لہجے میں کہا تھا۔

”بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے آپ کا فیصلہ درست ہی ہوگا۔“

ان کے دل پر جو بیتی سو بیتی تھی لیکن نفیس احمد کے چہرے پر اطمینان جس طرح روشنی کی کرن بن کر اتر آیا تھا۔ اس سے ان کے سینے کی دھن کم ہو گئی تھی۔ نفیس احمد پرسکون ہو کر شیخ صاحب کی بیٹھک میں چلے گئے تھے اور وہ وہیں بیٹھی نوید کو غصہ سے بل کھاتے دیکھتی رہی تھیں وہ کتنی ہی دیر تک ان سے الجھتا رہا۔

”آپ نے کہہ دیا ہوتا آپ! کہ آپ کو عمر بھائی کا پروپوزل قبول ہے۔ پورے خاندان میں ایک شخص بھی ان کے جیسا نہیں ہے اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ان کا اور آپ کا جوڑ بہت مناسب ہے۔“

اور وہ دل پر ایک بھاری بوجھ لیے نوید کو سمجھاتی رہی تھیں کہ بہت سی باتیں اپنے بس میں نہیں ہوتی ہیں۔ نوید ناراض سا ہو کر چلا گیا تھا اور پھر اسی شام نوید سے ساری حقیقت جان کر عمران سے ملنے آیا تھا۔ نکھرے ہوئے بالوں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ اس کا لہجہ ساری شوخیاں کھو بیٹھا تھا۔ اس نے آتے ہی گلہ کیا۔

”تم نے ساتھ دیا ہوتا تارا تو آج میرے راستے یوں مجھ سے نہ بچھڑتے۔“
وہ جانے کیا کیا کہتا رہا تھا اور وہ چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی تھیں بنا کچھ کہے پلکیں جھکائے۔ جاتے جاتے اس نے چوٹ کی تھی۔

”دراصل تارا سید! تم پتھر ہو۔“

اور وہ گھنٹوں وہیں بیٹھی سوچتی رہی تھیں۔

سچ ہی کہتے ہوتے۔

کہ پتھر ہوں میں۔ ہاں پتھر ہوں میں۔

لیکن کاش دیکھ سکتے تم۔

اس پتھر لڑکی کی آنکھوں میں الجھا ہوا ایک آنسو۔

ایک مجبور، بزدل آنسو۔

اور وہ ایک آنسو مدتوں ان کی پلکوں کے کناروں پر اٹکا رہا۔

لحے بوند بوند کر کے وقت کے تھال میں گرتے رہے۔ بے شمار ماہ و سال یوں ہی گزر گئے۔ تارا کی عمر کڑی دھوپ میں پختی رہی، اور نفیس احمد کو کوئی موزوں رشتہ نہ مل سکا۔ تارا کی شخصیت میں اب بھی وہی وقار، وہی تمکنت تھی۔ اب بھی خاندان میں ان کے سلیقے اور ان کی نفاست کی دھوم تھی۔ اکثر محفلوں میں ان کے سلیقہ اور ہنرمندی کا ذکر رہتا لیکن پھر بھی وہ باہل کی دہلیز پر بیٹھی رہ گئی تھیں۔ خاندان میں کچھ کو تو اپنی کم مائیگی کے احساس نے جھولی نہ پھیلانے دی اور کچھ کے محسن میاں آڑے آئے۔ لیکن تارا بڑی مطمئن، بڑی پرسکون تھیں۔ وہ سوچتیں کسی ناپسندیدہ آدمی کے ساتھ زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ آدمی ساری زندگی تنہا گزار دے۔ نوید اکثر نفیس احمد سے الجھتا رہتا کہ وہ آخر کب تک پرانی روایات سے چپے رہیں گے۔ اگر خاندان میں کوئی اچھا رشتہ نہیں ہے تو خاندان سے باہر رشتہ کرنے میں کیا ہرج ہے اور نفیس احمد، نوید کی بات سنی ان سنی کر کے اپنی ساری الجھنیں شیخ صاحب کے ہاں جا کر ایک ہی بازی میں جھٹک دیتے۔

وقت کچھ اور آگے سرک گیا۔ نفیس احمد کے بالوں کی ساری سیاہی وقت کے سمندر میں کھل گئی۔ تارا کے بالوں میں سفیدی آنکھ پھولی کھیلنے لگی۔ اگرچہ اب بھی تارا کے سلیقے اور ہنرمندی کا وہی عالم تھا، لیکن اب کبھی کبھی تارا کو یوں لگتا جیسے ہواؤں میں ریت کی دیواروں پر کھڑی ہو اور ذرا سے جھونکے سے یہ سارا وقار، یہ ساری تمکنت ختم ہو جائے گی اور ان کا وجود ڈالی سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح بے وقعت، بے مایہ اور بے صرف ہو جائے گا۔ اب وہ محفلوں میں جانے سے گھبرانے لگی تھیں۔ عورتوں کی چیمٹی ہوئی نظریں اور خنجر کی طرح دل میں گڑ جانے والی ظالم سرگوشیاں انہیں ہراساں کر دیتی تھیں۔ آخر لوگ ان کے بارے میں اتنے شکر کیوں رہتے ہیں؟ وہ سوچتیں۔

اگر ان کی شادی نہیں ہوئی تو یہ قطعی ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ لیکن وہ عورتوں کی زبانیں بند نہیں کر سکتی تھیں۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کے سارے بدن میں کرب و اذیت کی سولیاں گڑی ہوں۔ داوی اماں کبھی کبھی گھبرا کر نفیس احمد کو بھونڈ دیتیں۔

”لڑکی کی عمر نکلی جا رہی ہے نفیس۔ اس کی عمر کی لڑکیاں تو چار چار بچوں کی مائیں بن گئی ہیں۔“

اور نفیس احمد جھنجھلا جاتے۔

”تو میں کیا کروں۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤ، منتیں کروں۔“ بے بسی ان کے چہرے پر پاؤں پھیلا لیتی اور ان کا لہجہ آنسوؤں میں بھیگ جاتا۔ ان کی تارا تو لاکھوں میں ایک تھی، کیا کمی تھی

اس میں، ان کی آواز ہار جاتی اور وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل جاتے۔

لیکن ایک روز شیخ صاحب کے ہاں جاتے ہوئے تارا کے ڈھلکے ہوئے دوپٹے میں سے جھانکتے ہوئے سفید بالوں نے ان کے دل کو ٹھٹھی میں لے لیا یہ ان کی تارا تھی جس کی ذہانت، سلیقے اور خوبصورتی کی دھوم تھی لیکن خزانیں چپکے چپکے جس کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ ابھی تو خزان کی آمد تھی۔

”کہیں ایسا نہ ہو.....“ اور وہ کانپ سے گئے۔

اس روز شیخ صاحب کی بیٹھک تک پہنچتے پہنچتے کئی بار انہوں نے اپنی پیشانی کو پونچھا۔ کئی بار انہیں لگا جیسے ان کا دل ڈوبنے کو ہو۔ لیکن وہ سچ سچ چلتے شیخ صاحب کی بیٹھک تک پہنچ ہی گئے کہ آج انہیں شطرنج کھیلنے کے علاوہ ایک اور اہم کام بھی کرتا تھا۔ بساط پر مہرے سجاتے ہوئے کئی بار انہوں نے ہونٹ کھولے۔ کچھ کہنا چاہا۔ مگر ہمت ہار بیٹھے۔ کئی بار لہجے کو سنوارا، سنبھالا۔ کئی بار کھوئی ہوئی ہمتوں کو یکجا کیا۔ لیکن ہر بار ان کا لہجہ توانائی کھو بیٹھا اور لفظ گوگے ہو گئے۔ نگاہیں کارنس پر پڑی، جبار اور اس کی بیوی کی تصویر سے الجھ گئیں اور وہ دن ان کے دل میں ایک اذیت ناک احساس کے ساتھ جاگ اٹھا جب اسی کمرے میں شطرنج کھیلتے ہوئے انہوں نے بڑی غوت سے کہا تھا۔

”ہم سید لوگ اپنی بیٹیاں غیروں میں نہیں دیا کرتے۔“ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اور پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کرتے ہوئے انہوں نے چال چلی۔

”ارے، ارے شاہ صاحب! یہ آپ گھوڑے کو کہاں لے جا رہے ہیں، ادھر ڈھائی گھر چلیے نا۔“ انہوں نے شرمندہ سا ہو کر چال درست کی اور دل ہی دل میں پھر سے لفظوں کو ترتیب دینے لگے انہیں لگ رہا تھا جیسے وہ پل صراط پر کھڑے ہوں۔

”لیجئے صاحب بچائیے اپنے شاہ کو، شہہ دے رہا ہوں۔“

شیخ صاحب چپکے تو ایک ہاری ہوئی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آگئی اور انہوں نے سوچا زندگی میں اتنی بڑی مات مل رہی ہے مجھے کہ شیخ صاحب کیا جانیں۔

”کیا آپ کچھ پریشان ہیں؟“ شیخ صاحب نے ان کے پیادے کو ہناتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... ہاں، نہیں تو.....“ وہ گھبرا گئے۔

شیخ صاحب نے دور بین نگاہوں سے ان کے چہرے کا جائزہ لیا اور ان کے کندھے پر

ہاتھ رکھ دیئے۔

”کیسے کہیے۔ شاہ صاحب! آپ کو کیا پریشانی ہے۔ شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔“ نفیس احمد نے بے بسی سے انہیں دیکھا اپنے خشک ہونٹوں کو تر کیا لیکن جیسے کوئی ان کا گلا بھینچ رہا تھا۔ ایسی بے بسی تو انہوں نے زندگی میں کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ تھوک نکلتے ہوئے انہوں نے شیخ صاحب کی طرف دیکھا۔

”نہیں میں پریشان تو نہیں ہوں بس یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ.....“

”آپ کی نظر میں کوئی لڑکا ہوتا رہا کے لیے تو.....“

ایک ہی بار ہمت کر کے وہ اس کٹھن منزل سے گزر گئے۔ شیخ صاحب نے اپنے ہاتھ ان کے کندھوں سے ہٹا لیے اور حیرت سے انہیں دیکھا۔

”رشتہ تو ہے ایک ہمارے ملنے والے ہیں۔ بلکہ یوں سمجھ لیجئے ہمارے دور پار کے عزیز ہیں۔ لیکن.....“ انہوں نے بات دانستہ ادھوری چھوڑ دی۔

”کوئی بات نہیں..... میرا مطلب ہے ذات پات کی کوئی قید نہیں۔“

نفیس احمد کو یوں لگا جیسے وہ کونین کی گولیاں چبا رہے ہوں۔ بات ختم کر کے انہوں نے شیخ صاحب کی طرف دیکھا جو تاسف ہمدردی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ پھر بیک وقت دونوں نے جبار کی تصویر کی طرف دیکھا۔ نفیس احمد نے شرمندہ ہو کر نگاہیں جھکا لیں۔

”وقت اور حالات آدمی کے اصولوں میں کتنی لچک پیدا کر دیتے ہیں۔ وقت بڑا ظالم ہے۔ آدمی کی کردہری ہو جاتی ہے۔ کندھے ڈھلک جاتے ہیں، گردن جھک جاتی ہے۔“ شیخ صاحب نے سوچا اور نفیس احمد کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے چال چلنے لگے۔

چند دن بعد نفیس احمد نے دادی اماں کو بتایا کہ انہوں نے تارا کی بات پکی کر دی ہے۔ وہ لوگ اتوار کو انگوٹھی پہنانے آئیں گے۔ نوید کو میں نے پیغام بھجو دیا تھا۔ لڑکا وہیں ہوتا ہے لاہور میں نوید مل لے گا اس سے۔“

”مگر لڑکا کیا کرتا ہے؟ کیا ذات ہے؟“ دادی اماں نے اللہ کا شکر بجالاتے ہوئے پوچھا۔

”لڑکے کی اپنی دکان ہے۔ ذاتی مکان ہے۔ شیخ صاحب کا دور کا عزیز ہے۔“

اور کچن میں چائے بناتی تارا آپا کو یوں لگا جیسے سب کی چھتی نظروں کے تیر جوان کے دل میں اور جسم میں پیوست انہیں مسلسل اذیت دیتے رہتے تھے۔ انہوں نے ایک ساتھ نکال کر پھینک دیئے ہوں۔ باہر نفیس احمد بجھے بجھے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”لڑکا پڑھا لکھا نہیں ہے۔ سادہ لوگ ہیں۔“

”یہ وہی تارا آپا تھیں جن کا نظریہ تھا کہ اگر ہم ذوق ہم سفر نہ ملے، تو بہتر ہے کہ آدمی ساری زندگی تنہا ہی گزار دے۔“

”اسے تو بات تک کرنا نہیں آتی تھی تارا آپا! بالکل گنواروں کی طرح بولتا تھا۔ جیسے فپ ہاتھ پر بیٹھ کر قسمت کا حال بتانے والے نجومی یا پھر دکانوں کے تھڑے پر بیٹھ کر باتیں کرنے والے کبوتر باز اور جواری“

”پھر بھی دیدی تم نے اچھا نہیں کیا۔“

تارا آپا کا ضبط ان کا ساتھ چھوڑنے لگا تو انہوں نے سختی سے ہونٹ بھیجنے لیے۔
”آپ خوش نہیں ہوئیں تارا آپا! آپ کو افسوس ہوا ہے؟“ نوید کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی۔

تارا آپا خاموشی سے ہونٹ کاٹتی رہیں۔

”وہ تو شکل سے ہی بیوقوف لگتا تھا تارا آپا اور اس کے چہرے پر چپکے کے اتنے بڑے بڑے داغ تھے۔“

انہیں خاموش دیکھ کر نوید نے روہاسی آواز میں کہا۔ تو تارا آپا کا ضبط پارہ پارہ ہو گیا اور وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”اب مجھ میں دوسروں کی جھپتی نظریں برداشت کرنے کی ہمت نہیں رہی نوید!“

”مگر تارا آپا.....!“ نوید نے کچھ کہنا چاہا لیکن تارا آپا نے اسے ٹوک دیا۔

”تم نہیں جانتے دیدی.....! تم نہیں سمجھ سکتے میں اب اور اتج ہو گئی ہوں اور میرے لیے اس سے بہتر، اس سے مناسب!“

ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ ان کی شخصیت کا وہ سارا وقار، سارا تناؤ کیسے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا۔ نوید کو لگا جیسے کسی نے دیکتے انگاروں کا تھال اس کے سر پر الٹ دیا ہو، یا جیسے کسی غیر مرئی ہاتھ نے اس کا دل سینے سے نوج کر پتھر ملی دیوار پر دے مارا ہو۔ تھوڑی دیر تک وہ یونہی یقینی دے بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتا رہا۔ لیکن جلد ہی اس پر حقیقت کا ادراک ہو گیا اور اس نے روتی ہوئی تارا کو بے اختیار دونوں بازوؤں میں بھینچتے ہوئے بڑی دردمندی سے کہا۔

”آئی۔ ایم سوری تارا آپا۔ آئی ایم ویری سوری!“

اور پھر اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی اور وہ ان کے سر پر چہرہ رکھے بچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رونے لگا۔

پھر ان کی آواز ڈوب سی گئی۔ پتا نہیں وہ کیا کہہ رہے تھے تارا کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ نفیس احمد کے دکھ کو سمجھ رہی تھیں۔ لیکن وہ خود بھی اتنی ہی مجبور تھیں جتنے نفیس احمد۔ آج انہیں عمر ارسلان بڑی شدت سے یاد آ رہے تھے جو نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ نوید نے ایک بار انہیں بتایا تھا کہ وہ امریکہ میں ہی کسی کالج میں پڑھانے لگے تھے۔

”آج اگر عمر یہاں ہوتے تو.....“ تارا کی پلکیں بھیگ گئیں اور پھر بھیکتی ہی چلی گئیں۔ کچن میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے کتنے ہی آنسو بہا ڈالے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کاش نوید آ جاتا اور وہ اس کی گود میں سر رکھ کر خوب روتیں، اتنا کہ دل کا سارا غبار دھل جاتا اور سچ سچ نوید اسی شام آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا۔

”دادی اماں نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔“

”ارے بیٹا! تم اتنی جلدی آگئے۔ کیا اتنے بہت سارے دنوں کی چھٹی مل جائے گی۔ وہ لوگ تو اتوار کو آ رہے ہیں نا؟“

”اب وہ لوگ نہیں آئیں گے دادی اماں۔“

اور نوید کی آواز سن کر باہر آتی تارا آپا وہیں بیڈ کے کنارے پر ٹپک گئیں انہیں لگا جیسے جھپتی نظروں کے وہ تیر جو انہوں نے اپنی دانست میں نکال پھینکے تھے۔ اسی طرح ان کے جسم میں پیوست تھے اور جیسے جا رہے تھے اور وہ ظالم قاتل سرگوشیاں جو انہیں کسی محفل میں دیکھ کر ہونے لگتی تھیں مسلسل ان کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ نوید، دادی اماں کو یونہی حیرت زدہ چھوڑ کر انہیں پکارتا ہوا اندر آیا اور ان کے چہرے کو اور ان کی بھللائی آنکھوں کو دیکھ کر اس نے بڑے لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کی پیشانی چوم لی۔

”مجھے پتا تھا تارا آپا! کہ آپ کتنی پریشان ہوں گی اسی لیے تو میں فوراً چلا آیا..... اچھا جناب.....!“ اس نے شوخی سے کہا۔

”آپ یہ آنسو پونچھ ڈالیے۔ میں نے تو ان حضرت کو دیکھتے ہی اور ان سے دو چار باتیں کرتے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم اپنی بہن کا رشتہ آپ کو نہیں دے سکتے۔“

”مگر تم نے ایسا کیوں کیا دیدی؟“

”وہ بالکل اُن پڑھ تھا تارا آپا! اور آپ کے ساتھ تو بالکل نہیں جتنا تھا۔“

”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ تارا آپا نے شکوہ کیا تو نوید نے ان کے گلے سے بانہیں نکال کر حیرت سے انہیں دیکھا۔

لابی سیاہ کھنی پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اور گداز شکر فی ہونٹ ہوئے ہوئے کانپ رہے تھے۔

”ہائے ہم اس سے پہلے مر کیوں نہ گئے، فرخ جہاں عاصمہ بیگم بدستور روتی رہیں۔“
 ”اماں پلینز! چپ کر جائیے..... حوصلہ کیجئے۔“

فرخ جہاں نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے کہا ”ہائے کیسے چپ کروں۔ میرا دل کوئی سینے سے نوج رہا ہے۔ فرخ جہاں!“
 ”تو پھر ہمارا گلا گھونٹ دیجئے مار دیجئے ہمیں۔ ہم سے یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر موت کا انتظار نہیں ہوتا۔“

فرخ جہاں کی پلکوں پر آنکے ہوئے آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔
 انہوں نے بے بسی سے فرخ جہاں کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ اب وہ ہوئے ہوئے سکیاں لے رہی تھیں۔

”ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے اماں!“
 فرخ جہاں نے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے نرمی سے سمجھایا۔
 ”تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ کل جو بادشاہ تھے آج بھکاری اور جو بھکاری تھے آج بادشاہ ہو سکتے ہیں اور پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں رکھتے ہوئے روٹی کے ٹکڑے کے لیے دوسروں کا منہ دیکھتے رہیں اور وہ جو آپ کے نصیر ماموں ہیں۔ پورے چھ ماہ سے انہوں نے خبر تک نہیں لی۔ اور اگر آپ کے پاس وہ چند تولے زیور نہ ہوتا تو ہم بھوکوں مر جاتے اور ہمیں تو خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ قاضی صاحب کی مہربانی سے ہمیں یہ نوکری مل گئی ہے۔ ورنہ ایک میٹرک پاس لڑکی کو کہاں نوکری ملتی ہے سوائے گھروں میں برتن دھونے کے۔“

”اللہ قاضی صاحب کو اس کا اجر دے گا بیٹی پر میرا دل ڈرتا ہے میری جان۔“
 ”کس بات سے اماں؟“ فرخ جہاں کھڑی ہو گئیں۔

”دنیا بہت خراب ہے بیٹا! اور تو بہت خوبصورت ہے۔ نادان ہے، نا سمجھ ہے..... ہائے جانے نصیر کو کیا ہوا۔“

”کچھ نہیں ہوا اماں! نہیں بس وہ تو.....“

اس کا دل چاہا وہ کہہ دے کہ وہ تو بس یونہی مارے باندھے چلے آتے ہیں۔ ورنہ جو انہیں سچ سچ آپ کا خیال ہوتا تو آپ کو یوں رکنے دیتے ساتھ ہی نہ لے جاتے مگر وہ ان کی دل

بے جہت سفر

عاصمہ بیگم وحشت بھری آنکھوں نے چادر میں لپٹی فرخ جہاں کے قدم روک لیے۔
 ”اماں! آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟“

ان کی وحشت بھری آنکھیں ایک دم پھلک پڑیں۔ انہوں نے کاہے کو اس دن کے بارے میں سوچا تھا۔ وہ گھر انہیں جہاں پرندہ بھی پر نہ مار سکتا ہو۔ آج اس گھرانے کی لڑکی بے پردہ گھر سے باہر جا رہی تھی۔ جس گھر کے ٹکڑوں پر سینکڑوں خاندان پلتے تھے۔ اسی گھر کی بیٹی روٹی کے دو ٹکڑوں کے لیے گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

”اللہ! یہ دن بھی مجھے دیکھنا تھا۔ یہ دیکھنے سے پہلے تو میں مر جاتی۔“
 ان کے دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی اور پھر پھلکتی آنکھیں دریا بن گئیں۔ اور فرخ جہاں گھبرا کر ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

”اماں!..... اماں! خدا را روئے نہیں آپ تو مجھے بھی بے حوصلہ کیے دے رہی ہیں۔ آپ کو تو مجھے حوصلہ دینا چاہیے۔“

”تمہارے بابا زندہ ہوتے تو کاہے کو ہمیں یہ دن دیکھنا پڑتے۔ آج تو ان کی روح بھی تڑپ رہی ہوگی۔ ان کی فرخ جہاں جس کے چہرے کو کبھی غیر نظروں نے نہ چھوا ہو آج یوں کھلا چہرہ لیے باہر جا رہی ہے۔ ہائے جانے کتنی نظریں پڑیں گی اس چہرے پر کیسی غلیظ، گندی اور حریص نظریں۔ وہ تو مر جاتے پر ان کی غیرت کو یہ گوارا نہ ہوتا ہائے میں کیوں اتنی بے غیرت ہو گئی۔ کیوں نہ زہر کھا کر سو رہی۔“

انہوں نے روتی آنکھیں اٹھا کر فرخ جہاں کو دیکھا۔ جس کی رنگت یکدم زرد پڑ گئی تھی۔

فرخ جہاں ابھی صرف دو ماہ کی تھیں کہ فسادات شروع ہو گئے۔ وقت سہم سہم کر گزرنے لگا اور پھر پاکستان بن گیا اور سید وقار عالم سارا جاہ و جلال ساری شان و شوکت ساری عزت و حشمت وہیں چھوڑ کر فرخ جہاں کو سینے سے لگائے اور عاصمہ بیگم کا ہاتھ پکڑے..... پاکستان کی سرحد پر آ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد ایک مکان ان کے نام الاٹ ہو گیا تو وہ کمپ سے مکان میں اٹھ آئے۔ انہوں نے سوچا تھا وہ اطمینان سے سیٹ ہو کر جائیداد کے لیے کلیم..... کر دیں گے۔ اور زندگی کو نئے سرے سے شروع کریں گے۔ بلا سے یہاں وہ جاہ و حشمت نہیں ہوگی مگر اپنا وطن تو ہوگا۔ بہت نہیں تھوڑا تو ملے گا پھر ان کے پاس اتنا کچھ تھا سونا، زیورات، جواہرات کہ وہ زندگی کو پھر اچھے طریقے سے شروع کر سکتے تھے۔ سب کچھ لٹانے کے باوجود بھی وہ مطمئن تھے کہ ایک آزاد وطن میں ہیں۔ وہ کئی منصوبے بنا رہے تھے۔ کئی لوگوں سے ملنا چاہ رہے تھے مگر تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ ایک صبح نہا کر باہر نکلے تو ایسے گرے کہ پھر اٹھ نہ سکے۔ ڈاکٹر نے بتایا فالج ہے۔ دایاں حصہ مکمل طور پر ناکارہ ہو گیا تھا۔

اور ایسے میں دور پار کے عزیز سید اصغر علی کی آمد انہیں بڑی غنیمت لگی۔ انہوں نے اسے گھر پر ہی روک لیا کہ وہ تنہا آدمی تھا اور انہیں ان کی ضرورت تھی۔ ہو لے ہو لے اس نے سب کچھ سنبھال لیا۔ حتیٰ کہ اس کے مشورے پر وقار عالم نے تمام قیمتی جواہرات اور نوادرات اور زیورات لاکر میں رکھا دیئے۔ اور اصغر علی نے خود ہی سب کچھ جا کر لاکر میں رکھوایا تھا۔ لاکر کی چابی بھی اسی کے پاس تھی۔ لوگوں کو جائیدادیں مل رہی تھیں اور وہ تو بہت کچھ چھوڑ کر آئے تھے۔ زمینیں، باغات، حویلی مگر شاید ان کے نصیب میں کچھ نہ تھا۔ اصغر علی کلیم کے اور زمینوں کے کاغذات لے کر غائب ہو گئے۔ جاتے جاتے لاکرز سے بھی سب کچھ نکال لے گئے۔ اور وقار عالم کچھ بھی نہ کر سکے کہ وہ تو بے بس تھے۔ چار پائی سے مل جل بھی نہیں سکتے تھے۔ عاصمہ بیگم سہارا دے کر اٹھائیں تو اٹھ جاتے خود سے تو ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتے تھے۔ چار پائی پر لیٹے لیٹے انہوں نے بہت سے ملے جلنے والوں کو اور متعلقہ افسروں کو خط لکھے مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا اور اصغر علی جسے انہوں نے بھائیوں کی طرح سمجھا تھا۔ انہیں دھوکا دے کر چلا گیا تھا۔ اور وہ اسے کہاں ڈھونڈتے کہاں تلاش کرتے۔

ایسے میں عاصمہ بیگم کی آنکھیں دن رات آنسو برساتیں اور وہ بے بسی سے اس سادوں کو دیکھتے رہ جاتے کہ ان کے اختیار میں کچھ بھی تو نہ تھا اور عاصمہ بیگم کے ہاتھوں کانوں سے کوئی نہ کوئی زیورات کر بکرا رہا۔ وہ خاموشی سے برقعہ پہنتیں اور قاضی صاحب کے ہاتھ پر جا کر کوئی نہ کوئی

لکھنی کے خیال سے چپ ہی رہی۔
”اب کے نصیر آئیں تو کہوں گی اپنی امانت لے جائیں اور تو وعدہ کر، نصیر آئے تو انہیں خبر تک نہیں ہونے دے گی کہ نوکری کر رہی ہے۔ ہائے کیا کہیں گے وہ ان کی غیرت کیسے گوارا کرے گی۔ ارے سید نجیب الدولہ کی پوتی اور سید وقار عالم کی بیٹی اور دو نکلے کی نوکری۔“
”اماں پلیز!“

”وعدہ کر فرخ جہاں کبھی کسی مرد کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔“
”اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ میں کیا مردوں کو دیکھنے جا رہی ہوں۔“
”ارے نادان بچی! تو کیا جانے یہ مردوں کی قوم کو کیسے بل چھل آتے ہیں۔ محبت کے، پیار کے جال پھینک کر پھنسا لیتے ہیں نادان لڑکیوں کو اور تو تو میرے شبوبی امانت ہے۔“
”ہوں، شبو جس نے بیس سالوں میں آپ کی خبر تک نہیں لی۔ کبھی اس گھر میں جھانکا تک نہیں۔“

فرخ جہاں نے تختی سے سوچا اور بے چینی سے بولی۔
”اماں! مجھے دیر ہو رہی ہے قاضی صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔“
”میں وعدہ کرتی ہوں اماں کہ میں بہت محتاط رہوں گی۔“
”اچھا جا میری بچی تجھے اللہ کے حوالے کیا۔“

عاصمہ بیگم نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھونکا اور فرخ جہاں جلدی سے چادر لپیٹتی باہر نکل گئی کہ کہیں اماں کے آنسو سوچ سوچ ہی ان کے قدم نہ روک لیں۔ کتنی مشکوں سے اس نے انہیں آمادہ کیا تھا۔ کتنی تاویلیں دے کر، کتنی دلیلیں دے کر سمجھایا تھا۔ اور اتنی ہی تاویلیں اور اتنی ہی دلیلیں اس نے خود کو بھی دی تھیں۔ راتوں کو جاگ جاگ کر سوچا تھا اور زندہ رہنے، عزت سے جینے کے لیے ہی ایک راستہ دکھائی دیا تھا کہ کہیں نوکری کر لے کہ اب تو گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں رہی تھی جسے فروخت کر کے پیٹ کا ایندھن بھرا جائے۔ کسی کیسی خوبصورت اور قیمتی چیزیں بک گئی تھیں یہ کم بخت پیٹ کا جہنم نہ ہوتا تو کتنی اچھی بات تھی۔ مگر زندہ آدمی کو تن کے لیے کپڑا اور پیٹ کے لیے روٹی دونوں ہی چاہیے ہوتی ہیں اور یہی ضرورت فرخ جہاں کو باہر لے آئی تھی۔

وہ فرخ جہاں جس کی پیدائش پر مہینوں حویلی میں جشن ہوتا رہا کہ وہ اس حویلی کی، اس خاندان کی پہلی بیٹی تھی اور سید وقار عالم کو خدا نے شادی کے پورے دس سال بعد اولاد سے نوازا تھا۔ وہ کتنی بھی خوشاں مناتے کتنا بھی چراغاں کرتے کم تھا۔ مگر نہ خوشاں انہیں راس نہ آئیں۔

زیور رکھ آئیں کہ ان نیک دل پڑوسیوں نے بڑا ساتھ دیا تھا۔

وقت گزرتا رہا زیور کم ہوتے رہے۔ پہلے دائیں ہاتھ کی چوٹیں چوڑیاں ختم ہوئیں پھر بائیں ہاتھ کی۔ اس کے بعد کڑوں کی اور انگوٹھیوں کی نوبت آئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اصغر علی کے اصرار کے باوجود عام استعمال کا زیور انہوں نے پاس ہی رکھا تھا۔

فرخ جہاں اب سارے گھر میں چپکتی پھرتی اور وہ چار پائی پر لیٹے لیٹے اسے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے۔ اس کے لیے انہوں نے برسوں انتظار کیا تھا۔ برسوں خواب دیکھے تھے۔ اور یہ کیسا نصیب لے کر آئی تھی۔

”بد نصیب بچی۔“ وہ اسے سینے پر لٹائے لٹائے رو پڑتے۔

”ہم سے یہ غربت، یہ بے بسی نہیں دیکھی جاتی عاصمہ بیگم! جب یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا تو کیا ہوگا۔“

”تب کی تب دیکھی جائے گی۔ اللہ کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا ہی دے گا۔“

عاصمہ بیگم انہیں تسلی دیتیں۔ لیکن خود ان کا اندر لہو روتا رہا۔ اور انہوں نے گھبرا کر نصیر احمد کو کتنے خط لکھ ڈالے تھے۔ نصیر احمد جو ان کے سکے بھائی تھے مگر ابھی تک وہ ہندوستان میں ہی تھے۔ پھر ایک دن ان کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

نصیر احمد نے کراچی سے خط لکھا تھا کہ وہ بھی بحری جہاز کے ذریعے پاکستان آ گئے ہیں۔ اور جلد ہی لاہور آئیں گے۔

”اب ہمارے دل در دور ہو جائیں گے عاصمہ بیگم!“

وقار عالم دن میں کتنی ہی بار کہتے اور عاصمہ بیگم بھی مسکرا دیتیں مگر نصیر احمد آئے تو انہیں دیکھ کر بھونچکا سے رہ گئے۔

”یہ..... یہ کیا ہے بھائی صاحب! ہم نے تو سنا تھا کہ ادھر ہندوستان کی جائیداد کے بدلے بڑی بڑی جائیدادیں مل رہی ہیں۔“

اور تب انہوں نے اصغر علی کے فریب کی ساری کہانی سنا دی۔

”مگر آپ کے پاس تو بہت کچھ تھا اور میں تو سوچ رہا تھا کہ آپ کے ساتھ ہی مل کر کوئی بزنس وغیرہ شروع کروں گا۔“

”وہ سب کچھ بھی اصغر علی ہی لے گیا۔“ انہوں نے افسردگی سے کہا۔

”مگر اب تم آ گئے ہو تو اپنی پریشانی دور ہو جائے گی۔ تم کراچی ہی میں سیٹل ہو رہے

ہو یا لاہور آؤ گے۔“

”میں کراچی میں ہی سیٹل ہونا چاہتا ہوں۔“

”پھر میرا خیال ہے ہم بھی تمہارے ساتھ۔“

”ارے نہیں بھائی صاحب! آپ لوگ ابھی یہاں ہی رہیں۔ یہاں آپ کے پاس اتنا

اچھا مکان ہے۔ وہاں تو رہائش کا ابھی بڑا پرالہم ہے۔ میں خود بھی زینت آرا اور بچوں کو ایک دوست کے پاس چھوڑ کر آیا ہوں۔ میں خود ایک باریسیٹل ہو جاؤں تو بلا لوں گا۔“

مگر وقار عالم کی تجربہ کار نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ نصیر احمد لحوں میں کتنا بدلے ہیں کہ جاتے جاتے انہوں نے اس فرخ جہاں کو پیار تک نہیں کیا تھا۔ جس کی پیدائش پر انہوں نے لڑ بھگڑ کے منتیں کر کے شبیر احمد خان کے نام کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی تھی۔ اس لیے تو انہوں نے نصیر احمد کے جانے کے بعد بڑی مایوسی سے کہا۔

”اب کیا ہوگا عاصمہ بیگم؟“

”ارے اب کس بات کی فکر ہے نصیر آگئے ہیں تو سب کچھ سنبھال لیں گے۔“

”نصیر کچھ نہیں کریں گے عاصمہ بیگم!“

کبھی کبھی وقار عالم کہتے۔

”نہیں، نہیں نصیر ضرور آئیں گے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔“

عاصمہ بیگم کو اب بھی یقین تھا اور یہ یقین پورا تو ہوا لیکن جب وقار عالم نے اس بے وفا دنیا سے آنکھیں موڑ لی تھیں اور عاصمہ بیگم بھری دنیا میں تمہارہ گئی تھیں۔

نصیر خان آئے بہت سی معذرتوں کے ساتھ اپنی ہی مصیبتوں اور پریشانیوں کی کہانی لیے اور عاصمہ بیگم کو تسلی دلا سادے کر چلے گئے۔ ساتھ لے جانے کا ذکر تک نہ کیا اور عاصمہ بیگم بھی آخر سید وقار عالم کی بیوی اور سید نجیب الدولہ کی بہوتھیں۔ جو ناک پر کبھی تک نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ بلا سے نصیر احمد ان کے بھائی تھے۔ مگر عاصمہ بیگم نے ان سے نہ کہا کہ وہ انہیں ساتھ لے جائیں کہ وہ اس اجنبی شہر میں بالکل اکیلی اور تنہا ہیں۔ اور پھر نصیر احمد چلے گئے۔

البتہ دو تین ماہ بعد خرچ کے لیے پانچ سات سو بھجوا دیتے۔ اس کمپرسی میں یہ بھی غنیمت تھا۔ زندگی کی گاڑی ہولے ہولے گھسنے لگی۔ فرخ جہاں پاؤں پاؤں چلتے جوان ہو گئی۔ نصیر احمد سال دو سال میں چکر لگاتے مگر انہوں نے کبھی عاصمہ بیگم اور فرخ جہاں کو ساتھ لے جانے کے لیے نہیں کہا۔ اور عاصمہ بیگم نے خود ہی سوچ لیا کہ نصیر احمد اس لیے انہیں ساتھ لے کر نہیں جاتے

کہ کہیں وہ زینت آرا کے سامنے چھوٹی نہ پڑ جائیں۔
آخر کو انہوں نے بیٹی بیانی تھی اوہر، مگر جب بھی انہوں نے زینت آرا کا ذکر کیا۔
”ارے کبھی زینت آرا کو لاؤ۔ شبیر احمد کو دیکھنے کا بڑا جی چاہتا ہے۔“ مگر نصیر احمد مال جاتے۔

”زینت بیمار ہے۔“

شبیر پڑھائی میں مصروف ہے۔

”ارے شبو! کیسا ہوگا میرا شبو۔“

عاصمہ کا دل مچل مچل جاتا اور نصیر احمد ایک دو دن رہ کر چلے جاتے اور اب تو پورے چھ ماہ سے خرچ تک نہ بھیجا تھا۔ بچا کچھ زبور بھی بک گیا تھا۔ اور تب فرخ جہاں نے بے حد مجبور ہو کر قاضی صاحب کی وساطت سے یہ نوکری حاصل کی تھی۔

یہ دواؤں کی ایک کمپنی تھی۔ اور قاضی صاحب اس کمپنی میں سیلز مینبر تھے۔ انہوں نے تمام اسٹاف سے اسے بھانجی کہہ کر متعارف کروایا۔ چادر کو اچھی طرح لپیٹے وہ سہمی سہمی قاضی صاحب کے پیچھے کھڑی تھی کئی بار تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی گر پڑے گی۔ بہت سی جھپٹی ہوئی نظریں اس کے جسم کے آر پار ہوئی جارہی تھیں اور وہ اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہی تھی۔ قاضی صاحب نے اسے دلاسا دیا۔

”گھبراؤ نہیں بیٹا! سب لوگ اچھے ہیں بس آدمی کو خود اچھا ہونا چاہیے۔“

لیکن قاضی صاحب کے دلاسا دینے کے باوجود ایک انجانا سا خوف سارا دن اسے..... گھیرے میں لیے رہا حالانکہ جہاں اس کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔ وہاں کام کرنے والی لڑکیاں ہی تھیں۔ فرحت خان تو اس کی ہم عمر ہی تھی۔ جب کہ فاطمہ صادق ذرا بڑی اور مدبر لگتی تھیں۔ انہوں نے بڑی محبت سے اسے سارا کام سمجھایا اور اسے ابھی کام کرتے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ احمد رضا اندر آیا تو مارے گھبراہٹ کے دوائی کی شیشی اس کے ہاتھوں سے گر گئی۔

”یہ احمد رضا ہے۔“ فرحت خان نے اسے بتایا۔ ”اسٹور انچارج۔“

اس نے مڑ کر ایک نظر دیکھا اور گھنی مونچھوں کے پیچھے چھپے مسکراتے ہونٹ دیکھ کر ساری جان سے لرز گئی۔

”آپ غالباً نئی آئی ہیں۔“

”جی۔“ وہ پسینے پسینے ہو گئی۔

اور وہ تھوڑی دیر تک بوتلوں کو الٹ پلٹ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مدنی صاحب آگئے۔ چھوٹی سی داڑھی اور پیلے پیلے دانتوں والے مدنی صاحب۔
”یہ ہیڈ کلرک ہیں۔“
فرحت خان نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

ان کی آنکھوں میں عجیب کمینی سی چمک تھی۔ وہ فاطمہ صادق سے کسی فائل کے بارے میں پوچھنے لگے۔ مگر آنکھوں سے اسے بھی دیکھتے جا رہے تھے۔ مدنی صاحب گئے تو فرحان حیدر فائلوں کا پلندہ اٹھائے آ گیا اور پھر صفی صاحب..... پکینگ چیک کرنے چلے آئے۔
”یہ سب تمہارے لیے آرہے ہیں۔“ فرحت خان نے ہنستے ہوئے کہا۔
”میرے لیے۔“

وہ گھبرا گئی اور عاصمہ بیگم جیسے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔
”میرا دل ڈرتا ہے فرخ جہاں! باہر کی دنیا بڑی ظالم ہے۔“ اور خود اس کا دل طوفان کی زد میں آئے ہوئے کسی پتے کی طرح کانپنے لگا۔
”مگر کیوں؟“

اس نے بمشکل تھوک نکلنے ہوئے پوچھا۔
”اس لیے کہ تم ہو ہی ایسی چیز کبھی آئینہ دیکھا ہے پیاری لڑکی..... اور یہ مرد، یہ تو کسی چڑیل پر بھی سوجان سے فدا ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ لڑکی ہو۔“
فرحت خان نے خود ہی زور سے قہقہہ لگایا۔

اور اس کے کام کرتے ہاتھ رک گئے۔ اور اس کی بے حد گلابی رنگت پر زردی سی دوڑ گئی۔

”گھبراؤ نہیں فرح!“ فاطمہ صادق نے اسے تسلی دی۔

”بے ضرر لوگ ہیں۔ خطرے والی کوئی بات نہیں۔ چند روز میں تمہاری طرف سے التفات نہ پا کر خود ہی سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ تم ان کی باتوں پر دھیان مت دینا۔“
”جی بہتر۔“

مگر پھر بھی اس کے دل کو اطمینان نہ ہوا۔ جب کوئی آتا وہ یک دم پیلی پڑ جاتی۔ اور اطمینان تو عاصمہ بیگم کو بھی نہیں تھا کہ جب وہ لوٹی تو وہ دروازے کے پاس ہی کھڑی تھیں۔ اور اس نے لرزتی کانپتی عاصمہ بیگم کو تھام لیا۔

”آپ اتنی پریشان کیوں ہو رہی تھیں اماں!“
 ”تو..... ٹھیک تو ہے فرخ جہاں!“ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پیشانی چوم لی۔

”ارے اماں!“ وہ زبردستی ہنسی۔
 ”آٹھ بجے تو میں گھر سے گئی تھی۔ اور دو بجے واپس بھی آگئی ہوں اتنی سی دیر میں بھلا مجھے کیا ہو جانا تھا۔“

”پر میرا دل تو سارا دن لرزتا رہا فرخ جہاں! تو تھکی تو نہیں؟

کام مشکل تو نہیں تھا؟

کیسے لوگ تھے؟

اور بھی لڑکیاں تھیں؟“

وہ سوال پر سوال کیے جا رہی تھیں اور فرخ جہاں نرمی سے جواب دیتی جا رہی تھی۔

سوال کرتے کرتے عاصمہ بیگم کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”تو نے جلدی کی فرخ جہاں! کیا خبر دو ایک روز میں تیرے ماموں کا منی آرڈر آ جاتا۔

ضرور اس پر کوئی افتاد پڑی ہوگی۔ جب سے پاکستان آیا ہے ہماری طرح مصیبتوں میں گھرا ہے۔“

”کوئی افتاد وغیرہ نہیں پڑی اماں! اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ نصیر ماموں تو بڑے

آدمی ہیں۔“

”ارے بچی! تو یوں ہی بدگمان ہوتی ہے اس سے۔ اگر وہ اتنے ہی مالدار ہوتے تو

زینت آرا کو نہ لاتا یہاں۔ شبو اور دوسرے بچوں کو دیکھنے کے لیے۔ کیا جی ترستا ہے میرا۔“

اماں کی خوش فہمیاں نہ جانے کب ختم ہوں گی۔ فرخ جہاں نے جل کر سوچا اور نرمی سے

بولی۔

”جو بھی ہو اماں! اب ہم کب تک نصیر ماموں کے ہاتھوں کی طرف دیکھتے رہیں گے۔

ابا زندہ ہوتے تو ان کی غیرت کبھی یہ گوارا نہ کرتی۔“

”ہاں۔“

عاصمہ بیگم آبدیدہ ہو گئیں تو وہ بھی افسردہ سی ہو گئی۔ اسے کون سا نوکری کرنے کا شوق

تھا۔ اب اماں کو کیا پتا کہ گھر سے باہر نکلے وقت کیسے کیسے اس کا کلیجہ خون ہوا تھا۔ اور ہر قدم پر اسے

ابا کتنے یاد آئے تھے۔ مگر کچھ مجبوریوں سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔ کس عورت کا دل نہیں چاہتا کہ

وہ گھر میں بیٹھ کر آرام سے کھائے۔ مرد کمائے اور وہ خرچ کر لے تو ٹھوڑا زیادہ جتنا بھی ہو۔
 ”ہائے شبو تو اب بھر پور جوان ہوگا۔ نصیر خیر سے آئے تو کہوں گی لے جائے اپنی
 امانت۔ بس فرخ جہاں تو بھی سن لے نصیر کے آنے تک ہی تیری نوکری ہے پھر نہیں۔“

”اچھا اماں!“

اس نے آہستگی سے کہا حالانکہ جانتی تھی وہ ریت پر محل بنا رہی ہے۔ اگر نصیر ماموں کو ذرا

بھی اس رشتے کا پاس ہوتا تو وہ یوں بے یار و مددگار نہیں چھوڑتے۔ اور پھر کبھی تو بچپن میں کیے

گئے اس رشتے کا ذکر کیا ہوتا۔ کبھی تو شبیر احمد کو لائے ہوتے زینت آرا آئی ہوتیں۔ مگر وہ عاصمہ

بیگم کی امیدوں کو توڑنا نہیں چاہتی تھی کہ یہ امید ہی تو انہیں زندہ رکھے ہوئے تھی۔ چنانچہ وہ انہیں

تسلیم دے کر کمرے میں چلی آئی کہ آج اس کا کچھ کھانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ شاید سب

کے لیے پہلا دن اتنا ہی اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہوگا۔ پہلا قدم ہی مشکل ہوتا ہے۔ اور اس

نے پہلا قدم اٹھا لیا تھا۔ اور پھر مشکلیں خود بخود آسان ہوتی گئیں۔ پہلے جو مشکل لگتا تھا اتنا مشکل

نہ رہا۔ چند دن تک سب ہی بہانے بہانے سے وہاں آتے رہے۔

اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ کسی نے مدد کی آفر کی، کسی نے سیٹی بجائی۔ کسی نے

مسکرانے پر ہی اکتفا کیا مگر وہ بے نیازی بنی اپنے کام میں مصروف رہی۔ پھر دوسرے گزرا زمانے

گئے۔ ابصار سلیم نے بیوی کی بدسلوکی اور بدزبانی کا رونا رو کر ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی۔

مدنی صاحب نے اپنی شفقت اور مہربانی کا سایہ ڈالنا چاہا۔ نوید اور احمد رضانے اس کی خوبصورتی

کے گن گائے۔ مگر سارے حربے ناکام رہے۔ اور کسی کو مزید آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ کچھ

قاضی صاحب کا احترام مانع تھا اور کچھ اس کی بنیدگی نے بے حوصلہ کر دیا تھا۔

مگر فرحان حیدر کو یہ سادہ سی بے حد خوبصورت لڑکی بے حد اچھی لگی تھی اور وہ ہر قیمت پر

اسے جیتنا چاہتا تھا۔ اکثر کینٹین میں چائے پیتے ہوئے یا اپنی میز پر بیٹھ کر فائلیں چیک کرتے

ہوئے سر جھکائے فرخ جہاں کو گزرتے دیکھتا تو اس کا دل مچل اٹھتا۔

”ارے لیٹا پکڑنا میرا دل گیا۔“

اس کی نیلی آنکھوں میں شرارت ہوتی مگر فرخ جہاں یوں بے نیازی گزر جاتی جیسے اس

نے کچھ سنا ہی نہ ہو اور ابصار سلیم نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

”اگر یہ دل مس فرخ جہاں کی طرف جا رہا ہے تو اسے روک لو۔“

”مگر میرا دل بڑا ضدی ہے یار۔ کھیلن کو مانگے چاند۔“ وہ گنگنا تا۔

”لگا میں ڈال کے رکھو میرے بھائی۔ ان تلوں میں تیل نہیں۔“

”بے قابو ہو رہا ہے یار۔“

”وہ قاضی صاحب کی بھانجی ہے..... بھولنا مت۔“

”ارے تو کیا ہوا میں کوئی اسے فلرٹ کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر؟“

”اتنی دلکش، اتنی خوبصورت لڑکی کو تو دل میں، گھر میں چھپا کر رکھنا چاہیے۔“

”دل میں ضرور چھپائے رکھو مگر گھر میں چھپائے رکھنے والی خواہشیں کچھ وقت طلب نظر

آتی ہیں۔“

”ارے مشکل کیا ہے۔“

انجم نواز سمجھتا۔

”جا کر قاضی صاحب کے سامنے دست سوال دراز کر دو۔ حسب نسب تمہارا ٹھیک ٹھاک

ہے۔ گھر تمہارے پاس ہے۔ تنخواہ تمہاری معقول ہے۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہوگا۔“

”یہ تو بعد کی بات ہے۔ میرے بھائی پہلے اس کے دل کا حال تو معلوم ہو۔“

”تو پھر کر دیکھو کوشش۔ جوتے کھا کر رونا مت۔“

مگر وہ اتنی باوقار، اتنی سنجیدہ دکھائی دیتی تھی کہ اس بے حد شوخ اور کھلنڈرے لڑکے کی

ہمت ہی نہ پڑتی کہ وہ اس سے کچھ کہہ سکے۔ مگر ایک روز ابصار سلیم کے جوش دلانے پر وہ اسٹور

میں پہنچ گیا۔

”سینے مس فرخ!“

”جی۔“ دوائیاں پیک کر دیتے ہوئے فرخ جہاں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نیلی

آنکھوں میں پارے کی سی بقیقاری تھی۔

”وہ..... وہ مس فرخ!“

وہ جھجک کر ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگا اور اس کی بے حد سفید رنگت سرخ پڑ گئی۔

فرخ جہاں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کہئے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔“

”جی میں..... وہ میں..... پوچھنا چاہ رہا تھا کہ قاضی صاحب آپ کے سکے ماموں

ہیں؟“

”جی نہیں، پڑوسی ہیں ہمارے۔“

اس نے سنجیدگی سے کہا اور دوبارہ پکینگ کروانے لگی اور یہ چادر میں لپیٹی سادا مگر انتہائی

دلکش لڑکی اتنی مشکل کیوں ہے۔ اور میں اس کے سامنے وہ سب کچھ کیوں نہیں کہہ پاتا جو کہنا چاہتا

ہوں۔

فرحان حیدر نے محویت سے کام کرتی فرخ جہاں کو دیکھ کر سوچا۔

”اگر لعنت ہو تم پر فرحان حیدر ایسے ڈیل ڈول کے ساتھ تم اتنے بزدل ہو۔“

اس نے اپنے آپ کو کوسا اور سر جھکائے باہر نکل آیا۔ ابصار سلیم نے اسے دیکھ کر سیٹی

بجائی۔ احمد رضا قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اور مدنی صاحب ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے اور فرحان حیدر

نے جھنجھلا کر میز پر پڑی ہوئی ساری فائلیں نیچے پٹخ دیں اور غصے سے چڑا اسی کو آوازیں دینے لگا اور

وہ انتہائی دلکش لڑکی اپنی لائبریری جھکائے کام میں مصروف رہی۔ ادھر ادھر آتے جاتے اس نے

کبھی سر اٹھا کر فرحان حیدر کو نہ دیکھا اور فرحان حیدر..... کا دل اس کے قابو سے باہر ہوتا گیا اور

آخر ایک دن وہ پھر اس کے پاس پہنچ گیا وہ اکیلی اسٹور میں موجود اسٹاک کا حساب تیار کر رہی تھی۔

”سینے مس فرخ!“

اس نے جاتے ہی بغیر تمہید کے کہا۔

”یہ کم بخت دل اب میرے قابو میں نہیں رہا۔“

”کیا؟“

فرخ کے ہاتھ رک گئے لیکن فرحان حیدر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا نہیں کہ

کہیں اس کے حسن کے جلال سے مرعوب نہ ہو جائے اور یوں ہی سر جھکائے کہتا رہا۔

”اصل میں بات یہ ہے کہ میں آپ سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

اس نے انتہائی بے بسی سے اعتراف کیا اور فرخ جہاں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں

اور قلم اس کے ہاتھوں سے گر پڑا۔ اسے سروں کرتے پورے چھ ماہ اور چھ دن ہو گئے تھے۔ اور آج

فرحان حیدر اس سے وہی بات کہہ رہا تھا جس سے عاصمہ بیگم اسے ڈرایا کرتی تھیں اور صبح و شام

اسے ڈھیروں نصیحتیں کرتی ہیں۔

”ان مردوں کے پاس بڑے جال ہوتے ہیں فرخ جہاں بڑی لچھے دار باتیں کرنی آتی

ہیں انہیں۔ پیار و محبت کے وعدے اور خوبصورت باتیں اس عمر میں اچھی لگتی ہیں مگر تو ان باتوں میں

نہ آتا بیٹا۔“

”آپ یہاں سے چلے جائیں فوراً“ اس نے خشکیوں نظروں سے اسے دیکھا۔

”مگر مس فرخ! آپ میری بات تو سنیں میں آپ سے۔“

”شٹ اپ..... آپ جاتے ہیں یا میں قاضی صاحب کو بلواؤں۔“

”آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں مس فرخ میں.....“

”غلط آپ بھی مجھے سمجھ رہے ہیں۔ فرحان حیدر صاحب!“ اس نے تلخی سے کہا۔

”اور بہتر یہی ہے کہ آپ مزید کوئی بات کہے بغیر یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ۔“

اور فرحان حیدر سر جھکا بے ہر نکل گیا۔ لمحہ بھر کے لیے فرخ جہاں کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ارد گرد سناٹا چھا گیا ہو۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ کام میں مصروف ہو گئی۔

کچھ دن وہ پریشان رہی کہ کہیں وہ اسے تنگ نہ کرے۔ مگر وہ تو یک دم خاموش ہو گیا تھا۔ اب نہ تو کوئی شوخ فقرہ اس کی طرف اچھالتا تھا اور نہ ہی شریر نظروں سے اسے دیکھتا تھا۔ وہ ایک بار پھر مطمئن ہو گئی اور فرحان حیدر نے اعتراف کیا کہ اس نے پورے خلوص سے اس لڑکی کو اپنانا چاہا تھا مگر شاید وہ اس کے مقدر کا ستارہ نہ تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی تبدیلی دوسری برانچ میں کرا لی تھی۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ کئی لوگ چلے گئے اور کئی لوگ نئے آئے۔ بہت سے لوگوں نے قریب آنے کی کوشش کی۔ مگر فرخ جہاں نے کسی کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ وہ اپنے مقام پر مضبوطی سے قدم جمائے کھڑی تھی اور اس کے قدموں میں کبھی لرزش نہیں آئی تھی۔ اور عاصمہ بیگم نصیر احمد کی آس لگائے بیٹھی تھیں۔

”نصیر آجائیں تو اپنی امانت لے جائیں۔“

شبوتو اب بہت بڑا افسر بن گیا ہوگا۔

وہ تو بچپن میں یہی کہتا تھا کہ بہت پڑھے گا۔

بڑا پیارا بچہ تھا۔“

وہ شبوتو کی باتیں کرتی رہتی تھیں مگر فرخ جہاں جب بھی شبیر احمد کے بارے میں سوچتی کوئی سراپا، کوئی شبیبہ اس کے تصور کی گرفت میں نہ آتی۔ پتا نہیں اب تک اس کی شادی بھی ہو گئی ہوگی۔ وہ سوچتی مگر اماں ہیں کہ آس لگائے بیٹھی ہیں کہ وہ دنیا کے جس کونے میں بھی ہوگا اس بندھن سے بندھا ہوگا جو ایک ننھی سی انگوٹھی کی صورت میں برسوں پہلے باندھا گیا تھا۔ اور یہ ننھی سی انگوٹھی جسے اماں نے ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اب اس کی چھنگلی کی ایک پور تک میں نہیں آتی

تھی۔ اور نہ ہی نصیر ماموں نے کبھی اس عہد کی تجدید کی تھی۔ پھر بھی جانے عاصمہ بیگم کو کیسی آس تھی جو ٹوٹتی ہی نہ تھی۔ حالانکہ نصیر ماموں نے دو سال سے پلٹ کر خبر تک بھی نہ لی تھی۔ بس ان پورے دو سالوں کے دوران ایک بار ہزار روپے کا منی آرڈر آیا تھا۔ فرخ جہاں کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ وہ اس منی آرڈر کو ان کے منہ پر دے مارے مگر مجبوری یہ تھی کہ اس منی آرڈر پر انہوں نے کبھی مکمل پتا نہیں لکھا تھا اور اس نامکمل پتے پر عاصمہ بیگم نے کتنے ہی خطوط لکھے تھے کبھی کوئی جواب نہ آیا تھا۔

”اماں! یہ جو ماموں میاں ہمیں سال کے سال زکوٰۃ بھجوا دیتے ہیں۔ اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب کہ جب بھی وہ آئیں تو یہ پیسے انہیں واپس کر دیجئے گا۔“

”ارے کیسی اونگٹی بوگٹی باتیں کرتی ہے لڑکی! وہ بھلا ہمیں کیوں زکوٰۃ دینے لگے۔ تیرا تو دماغ چل گیا ہے۔“

”جو بھی ہو اماں! یہ پیسے آپ سنبھال کر رکھ لیں اور جب بھی وہ آئیں انہیں واپس کر دیجئے گا۔“

اس نے بات ختم کر دی اور عاصمہ بیگم بڑبڑا کر رہ گئیں۔ مگر نصیر احمد کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ ایک سال اور چپکے سے بیت گیا۔ فرخ جہاں میں اور بھی اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس اعتماد نے اس کی شخصیت کے وقار اور حسن میں اضافہ کیا تھا۔ آفس میں ہر شخص اس کا احترام کرتا تھا۔ اور احمد رضا سے لے کر مدنی صاحب تک سب ہی اسے فرخ آپا کہنے لگے تھے۔ اور کبھی کبھی وہ سوچتی..... کہ دنیا اتنی بری بھی نہیں ہے جتنی کہ اماں سمجھتی ہیں۔ اور عاصمہ بیگم تو ان دنوں نصیحتیں کرنا بھی بھول گئیں تھیں۔ انہیں تو بس ایک یہ فکر تھی کہ کہیں سے نصیر احمد کی خبر ملے۔ کئی بار تو انہوں نے فرخ جہاں سے کراچی چلنے کو کہا تھا۔

”کراچی اتنا چھوٹا شہر نہیں ہے اماں! کہ ہم وہاں نصیر ماموں کو تلاش کر لیں گے۔“

فرخ جہاں انہیں سمجھاتی۔ تب ہر طرف سے مایوس ہو کر انہوں نے اللہ سے لو لگا لی تھی۔ ہر وقت تسبیح اٹھائے نصیر احمد کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ آخر خدا نے ان کی سن ہی لی۔ پورے تین سال اور چھ ماہ بعد ایک دن اچانک نصیر احمد آگئے اور ان کی آمد نے عاصمہ بیگم کی امیدوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

”اور نصیر! تم ٹھیک تو رہے گھر میں تو سب خیریت تھی نا۔“ وہ کتنی ہی دیر تک ان کا چہرہ ہاتھوں میں لیے ان کی بلائیں لیتی رہیں۔

”بس آپ! کیا کہوں کاروباری مصروفیات اتنی رہیں کہ ادھر آ ہی نہ سکا۔“

”اچھا اب کے تو اپنا پتا دے جانا۔ کیسا کیسا تڑپی ہوں تیرے لیے۔ کیا کیا سو سے آتے تھے دل میں بس نصیر میاں اب کے تو اپنی امانت لے ہی جاؤ۔ یہی دن ہوتے ہیں کھانے پینے کے۔“

”امانت..... کیسی امانت؟“ نصیر احمد گھبرا گئے۔

”فرخ بیٹی! کی بات کر رہی ہوں بھیا! اپنا شبو بھی تو اب پڑھائی وغیرہ سے فارغ ہو گیا ہوگا۔“

”شبو۔“ نصیر احمد نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”وہ تو کب کا پڑھائی ختم کر چکا آپا! اب تو ماشاء اللہ دو بچوں کا باپ بھی ہے۔“

اور عاصمہ بیگم ساکت نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئیں۔

”اصل میں آپا۔“ وہ کچھ نام سے دکھائی دینے لگے۔

”آج کل کے بچے اپنی مرضی کرتے ہیں۔ بچپن کے بندھن کو کون یاد رکھتا ہے۔“

وہ معذرت کرتے رہے۔ شرمندگی کا اظہار کرتے رہے مگر عاصمہ بیگم چپ بیٹھی رہیں۔

بڑی دیر تک یوں ہی خاموش رہیں۔ جیسے ان کے اندر سب کچھ ڈھس گیا ہو۔ پھر انھیں اور صندوق میں سے کئی کپڑے ہٹا کر وہ چھوٹی سی ڈبیا نکالی جس میں ایک ننھی سی انگوٹھی آج بھی پوری آب و تاب سے جھلک رہی تھی۔ اور پھر اسی خاموشی سے جا کر نصیر احمد کے ہاتھوں پر رکھ دی اور ان تین سالوں کے دوران بیچھے جانے والے دو ہزار روپے فرخ جہاں نے آ کر دے دیئے۔

”یہ کیا؟“ نصیر احمد نے حیرانی سے پوچھا۔

”دراصل میں نے نوکری کر لی ہے۔ ماموں میاں اور ہمیں اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ کچھ بیچنے کی زحمت نہ کیجئے گا۔“ اس نے بڑے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

”آپا! یہ کیا کہہ رہی ہے؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہے نصیر میاں!“ عاصمہ بیگم نے آہستہ سے کہا۔

”مگر آپا آپ سے مجھے اس غیریت کی امید نہیں تھی۔“

”غیریت تو تو نے ہم سے برتی ہے بھائی ارے شبو کی شادی کا بلاوا تک نہیں دیا۔“

آنسوؤں کی آنکھوں میں چپکنے لگے مگر وہ ضبط کر گئیں۔

نصیر احمد کچھ خفا خفا اور ناراض ناراض سے چلے گئے مگر عاصمہ بیگم نے انہیں روکا نہیں۔

اور ان کے باہر نکلتے ہی رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے اور پھر وہ اتنی شدت سے روئیں کہ فرخ جہاں کو

انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس نے اپنی بانہیں ان کے گلے میں ڈالتے ہوئے ان کی پیشانی چوم لی۔

”آپ اتنی بے حوصلہ کیوں ہو رہی ہیں اماں! میں نے کوئی آس نہیں باندھی تھی۔ اور

اب تو ہمیں تنہا جینے کا ڈھنگ آ گیا ہے۔“

مگر اس کی تسلیاں عاصمہ بیگم کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑ نہ سکیں۔ انہیں بڑا شدید دھچکا

لگا تھا۔ کئی دن تک تو یہ خیال رہا کہ وہ بیٹھے بیٹھے ایک دم رو پڑتیں اور پھر روتی ہی چلی جاتیں۔

مہینوں بعد جا کر کہیں سنبھلیں تو انہیں خیال آیا کہ فرخ جہاں کی عمر تیزی سے گزرتی جا رہی ہے اور

اس سے پہلے کہ بالوں میں سفیدی جھلکنے لگے وہ فرخ جہاں کو بیاہ دیں۔ تب آس پاس اڑوس

پڑوس میں کئی لوگوں سے انہوں نے کسی اچھے رشتے کے لیے کہا۔ کچھ لوگ اسے دیکھتے بھی آئے

پسند بھی کیا۔ مگر چیز کی بازی میں وہ مات کھا گئی۔ عاصمہ بیگم کے پاس تو اسے جہیز میں دینے کے

لیے کچھ بھی نہ تھا۔ بس چند جوڑے کپڑے، معمولی برتن اور ایک دو انگوٹھیاں۔ تب عاصمہ بیگم نے

اس کا جہیز بنانے کی خاطر مکان کا آدھا حصہ کرائے پر دے دیا مگر فرخ جہاں ان کی سرگرمیوں سے

بے نیاز معمول کے مطابق آفس جاتی۔ اور پھر گھر پر آ کر ان کا تھوڑا ہاتھ بٹاتی اور مزے سے سو

جاتی۔

شبیر احمد خان کی شادی کی خبر نے اس کے ذہن پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس نے

عاصمہ بیگم کے بے تحاشا ذکر کرنے کے باوجود اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ البتہ عاصمہ

بیگم چاہتی تھیں کہ جلد از جلد کوئی اچھا سا رشتہ مل جائیں ابھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ نگاہیں اب بھی اس

کے چہرے پر نہیں ٹھہرتی تھیں۔ اس کی بے حد خوبصورت آنکھوں میں اب بھی ڈوب جانے کو جی

چاہتا تھا۔ اس کے حسن میں ایک دھیمی دھیمی آنچ تھی جو ہولے ہولے پکھلاتی تھی۔ اور آصف شاہ

بھی اس آنچ سے پکھلا جا رہا تھا اسے اس آفس میں زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ مگر اسے لگتا تھا جیسے

یہ بادقاری سنجیدہ سی لڑکی برسوں سے اس کے دل میں بس رہی ہو اور شاید اسی لیے اس نے اب

تک شادی نہیں کی تھی کہ اسے اس لڑکی سے شادی کرنا تھی۔ جو یہاں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پہلے

دن جب مدنی صاحب نے احمد رضا کو ایک فائل دیتے ہوئے کہا۔

”جاؤ یہ فرخ آپا کو دے آؤ۔“

تو اس نے سمجھا کوئی بزرگ خاتون ہوں گی مگر اسی روز جب وہ مدنی صاحب کے کہنے پر

فرخ آپا سے حاضر اسٹاک کا حساب لینے گیا۔ تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ دہلی پتلی نازک سے سراپا والی

لڑکی فرخ آیا ہے۔

”معاف کیجئے گا فرخ! آپ کہاں ہیں مجھے ذرا حسابات چیک کرنے تھے۔“

ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ کر معدوم ہو گئی۔

”جی..... میں ہی فرخ ہوں۔“

”اوہ تو آپ فرخ تو ہو سکتی ہیں مگر آپا ہرگز نہیں۔“

”دیکھیے مسٹر.....“

”آصف علی شاہ۔“ اس نے شوخی سے کہا۔

”جی مسٹر آصف علی! مجھے فضول قسم کی گفتگو قطعی پسند نہیں ہے۔“

”مگر میرے خیال میں، میں نے تو کوئی فضول گفتگو نہیں کی۔“

”بہر حال، آپ جس کام سے آئے ہیں وہ کریں اور جائیں۔“

مگر اس کا یہ روکھا پن بھی آصف شاہ کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ نہ پیدا کر سکا۔ وہ پروانے کی طرح اس کے گرد چکر لاتا پھرا اور وہ اسے نظر انداز کرتی رہی مگر وہ بار بار اس کے قریب آتا بہانے بنا بنا کے۔ آفرشیو لوشن کی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسنے لگتی تو وہ اسے جھڑک دیتی۔

”آپ کو اور کوئی کام نہیں ہے۔ سیٹ پر جائیں پلیز۔“

”آپ کی رفاقت کی خوشی ہر کام پر بھاری ہے مس فرخ!“

وہ سرخ پڑ جاتی۔

”عجیب ڈھیٹ آدمی ہے کسی بات کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔“

”سینس مس فرخ! آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے۔“

”شٹ اپ۔“

”چلا جاؤں گا محترمہ! پہلے میرے سوال کا جواب تو دیں۔“

وہ خاموش ہی رہتی تو وہ خود ہی بولتا۔

”بڑا خوبصورت جذبہ ہے کبھی کر کے دیکھئے۔“

وہ بولتا رہتا اور خود ہی بول بول کر تھک جاتا تو اٹھ کر چلا جاتا۔ اک دن وہ آیا تو.....

سنجیدہ تھا۔

”مجھے بڑی اچھی جاب مل رہی ہے مگر یہاں سے جانے سے پہلے آپ سے آخری بار

ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”دیکھیں مس فرخ! یہ میری انتہائی بد قسمتی ہے کہ میری انتہائی کوشش کے باوجود آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہوئی۔“

اس نے کچھ اس طرح منہ بنا کر کہا کہ فرخ جہاں کو بے اختیار رہی آ گئی۔

”ہنسیں نہیں، میں سنجیدہ ہوں۔ محبت نہ سہی رفاقت کی تمنا تو کر سکتا ہوں۔ میں آپ

سے شادی کرنا چاہتا ہوں مس فرخ!“

فرخ جہاں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اچھا لگ رہا تھا وہ۔ اب جب کہ وہ شبیر احمد کی چھوٹی سی انگوٹھی کی قید سے آزاد تھی۔ تو کیا حرج تھا۔ اگر اس شخص کی دائمی رفاقت مل جائے تو کس قدر زندہ دل شخص ہے اور پھر مجھے..... مگر اماں بی کیا کہیں گی۔ میں نے ان کے اعتماد کو نہیں پہنچا دی اور آفس کے ایک شخص سے..... نہیں..... اس کے ڈولتے قدموں میں استواری آ گئی اور اس نے لمبے میں سختی پیدا کر لی۔

”دیکھیے مسٹر آصف! میں نے کتنی بار آپ سے کہا ہے۔ کہ مجھے اس قسم کی فضول باتیں پسند نہیں ہیں۔“

”یہ فضول باتیں نہیں زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ مگر آپ پتا نہیں جھوٹ کیوں بول رہی ہیں؟“

”جی.....“ اس نے اپنی لائبنی پلکیں اٹھائیں۔

”ابھی لمحہ بھر پہلے آپ کی آنکھیں کچھ اور کہہ رہی تھیں۔ مگر اب..... پتا نہیں جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔“

وہ کندھے اچکا کر چلا گیا اور وہ کتنی ہی دیر تک اس کی پیٹھ کو دیکھتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ دوسری طرف مڑ گیا اور اس کے ارد گرد سناٹا سا چھا گیا۔ عجیب گونجتا ہوا سناٹا پھر ہولے ہولے یہ سناٹا گہرا ہوتا گیا اتنا گہرا کہ وہ گہرا کر کھڑی ہو گئی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر فرحت خان کے پاس آ بیٹھی۔

”تم نے اچھا نہیں کیا۔“

فرحت خان جیسے سب کچھ جانتی تھی۔

”کیا اچھا نہیں کیا؟“ اس نے انفرادی سے پوچھا۔

”آصف اچھا آدمی ہے اور ایسے اچھے لڑکوں کو تو لڑکیوں۔“

اور پھر فاطمہ صادق کو آتے دیکھ کر وہ چپ ہو گئی تھی..... وہ فرحت خان کی بات پر غور

کام کرتے ہیں۔ کسی نے بھی پروپوز نہیں کیا انہیں۔ آج کل ایسے ہی رشتے ہوتے ہیں خالہ! لڑکے لڑکیاں باہر ہی ایک دوسرے کو پسند کر لیتے ہیں۔“

اور فرخ جہاں کے اندر چھن سے جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔ اس نے سنا نہیں کہ وہ اور کیا کہہ رہی تھیں۔ وہیں سے پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اب ہاجرہ کو کیا پتا کہ مجھے کسی نے پروپوز کیا تھا یا نہیں۔ وہ فرحان حیدر اور آصف علی شاہ اور..... مگر میں نے خود ہی اپنے ارد گرد ایک حصار بنا رکھا تھا کہ کہیں.....

”اور اب..... کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

عاصمہ بیگم کا اداس اور غمزہ چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ کیا میں اب اماں کی پریشانی دور نہیں کر سکتی۔

”آج کل کی لڑکیاں تو بہت ہوشیار ہوتی ہیں۔“ کسی نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

”تو اور کیا۔“

فرحت خان جیسے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ”اب تو خود ہی ہاتھ پاؤں ہلانے پڑتے ہیں۔ ورنہ اچھے رشتے.....“

وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”اب بھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“

اس نے غور سے اپنے آپ کو دیکھا۔

بس ذرا سی بالوں میں کہیں کہیں سفید اتر آئی ہے۔ ورنہ اس کی آنکھوں میں اب بھی وہی قاتل چمک ہے جو بقول فرحی کے کسی کو لحوں میں قتل کر ڈالے۔ اس کے رخساروں پر اب بھی شفق نثار ہوتی ہے اور جسم میں وہی لوج ہے۔ وہی گداز ہے۔ اور اس کے گداز شگرنی ہونٹ اب بھی اپنی طرف بلا تے ہیں۔ اور نچلے ہونٹ کے کنارے پر وہ ظالم، قاتل تل اب بھی اتنا ہی دلفریب ہے جتنا پہلے تھا۔ اتنا وقت گزر گیا۔ مگر میں کچھ زیادہ نہیں بدلی۔

اسے اطمینان سا ہوا اور اس نے صدق دل سے دعا مانگی کہ خدا کرے اماں کی پریشانی دور ہو سکے اور جب عاصمہ بیگم ہاجرہ کو رخصت کر کے آئیں تو حیران رہ گئیں۔

”ارے تو کب آئی؟“

”ذرا دیر پہلے آئی تھی۔“

کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

کئی اور سال پر لگا کر اڑ گئے۔ آصف علی شاہ نے نئی جاب جوائن کر لی اور شاید کہیں شادی بھی کر لی ہوگی اور اپنی زندگی سے مطمئن اور خوش ہوگا کہ اس نے جاتے جاتے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ خوش رہنے والا آدمی تھا اگر وہ اسے مل جاتی تو وہ بہت خوش رہتا اور اگر نہیں ملی تب بھی خوش ہی رہے گا۔“

وہ تو خوش ہی ہوگا مگر فرخ جہاں کے دل میں ایک کک سی چھوڑ گیا تھا۔ اسے کبھی کبھی بہت یاد آتا تھا۔ اس کی باتیں یاد آتیں تو وہ ذرا سی دیر کے لیے اداس ہو جاتی۔ جبکہ اس کے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ عاصمہ بیگم اب بھی اس کا رشتہ ڈھونڈنے میں لگی ہوئی تھیں اور خود اس کی کئی راتیں یوں ہی بے خواب گزر جاتیں۔ رفاقت کی تمنا، دوسرا ہٹ کی خواہش پتا نہیں کیا چاہتی تھی وہ۔ اسے خود اپنی سمجھ نہیں تھی۔ فرحت خان بھی شادی کے بعد آفس چھوڑ چکی تھی۔ ورنہ وہ بڑی سیدھی، سچی اور کھری باتیں کرتی تھی اور اس کی باتیں اس کے دل کو بڑا سکون پہنچاتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ کہا کرتی تھی۔

”فرخ! دنیا تم جیسی لڑکیوں کو کچھ نہیں دیتی۔ جو جتنا برا ہے وہ اتنا ہی خوش قسمت ہے۔“

اسے فرحت خان کی باتوں پر حیرت ہوتی۔

”تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں فرحی!“

”حالانکہ میں تو سیدھی باتیں کرتی ہوں۔ جاناں تم جتنی خوب صورت ہو، جتنی حسین ہونا اتنی ہی عقلمند بھی ہوتیں۔ تو اس وقت کسی شیش محل میں بیٹھی ہوتیں۔ تم نے خود ہی اپنی طرف آنے والے راستے بند کر رکھے ہیں۔ ورنہ تم دیکھتیں کہ لوگ کیسے اپنا دل تمہارے قدموں میں نچاؤ کرتے ہیں۔“

اور وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتی۔ اس کی باتیں غلط بھی لگتیں اور صحیح بھی۔ اور اب وہ نہیں تھیں۔ تو کبھی کبھی دل بہت اداس ہوتا تھا۔ اس دن وہ بورسی ہو کر پہلے ہی چھٹی لے کر آ گئی تھی۔ عاصمہ بیگم قاضی صاحب کی بہو سے باتیں کر رہی تھیں۔

”اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ ہاجرہ! میری بچی کے لیے کچھ کروانا۔“

اور عاصمہ بیگم کی آواز سن کر وہ وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔

”کوشش تو بہت کر رہے ہیں خالہ! اماں نے بھی دو ایک لوگوں سے کہہ رکھا ہے۔ ویسے ایک بات ہے خالہ! فرخ آپا اتنی خوبصورت ہیں اور پھر آفس میں کام کرتی ہیں۔ وہاں مرد بھی تو

اس نے غور سے انہیں دیکھا۔ ان چند سالوں میں وہ یکدم کتنی بوڑھی ہو گئی تھیں۔ نصیر ماموں نے ان کی امیدوں کو قتل کر کے ان کے اندر سے زندگی کی ساری رمت چھین لی تھی۔
”چلو کھانا کھا لو۔“

”بھوک نہیں ہے اماں!“

”اچھا۔“

وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں اور اس کے آفس کے ساتھیوں کے بارے میں پوچھنے لگیں کہ کون کیسا ہے۔ کیا کرتا ہے۔ حالانکہ برسوں سے انہوں نے فرخ جہاں سے کچھ پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب وہ کیوں پوچھ رہی ہیں۔ فرخ جہاں سمجھ رہی تھی، محسوس کر رہی تھی۔ اگرچہ عاصمہ بیگم نے کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر وہ..... آج دوسرے انداز میں سوچ رہی تھی۔ رات وہ ٹھیک طرح سے سو بھی نہیں سکی تھی مگر پھر بھی جلدی اٹھ گئی۔ آج وہ کچھ اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ اس نے فرجی کی شادی پر پہننے والا سوٹ نکالا تھا۔ حالانکہ اس کا رنگ کچھ شوخ سا تھا۔ پھر بھی اس نے وہی پہن لیا اور آج شاید پہلی بار آفس جاتے ہوئے اس نے لپ اسٹک لگائی تھی۔ آنکھوں میں کاجل بھی لگایا تھا۔ اور لمحہ بھر کے لیے آئینے میں خود کو دیکھ کر حیران سی رہ گئی تھی۔

”ارے یہ میں ہوں فرخ جہاں۔“

پھر وہ کچھ جھجکتی ہوئی باہر آئی۔ اماں دیکھیں گی تو کیا سوچیں گی۔ مگر عاصمہ بیگم نے کوئی دھیان نہ دیا تو وہ جلدی جلدی چائے پی کر باہر نکل آئی۔ آفس میں ہمیشہ کی طرح مدنی صاحب نے اسے آتے دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا۔ کلرک صاحب نے کھڑے ہو کر اسے سلام کیا۔
”سلام فرخ آپا!“

وہ ذرا سی دیر احمد رضا کے پاس رکی۔ خالد وقاص کا حال پوچھا۔ مگر کسی نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ سب کے رویوں میں وہی روزمرہ کا احترام تھا۔ نگاہیں جھکائے سب اپنے کاموں میں مصروف رہے اور وہ سب کے درمیان سے گزرتی ہوئی اپنی سیٹ پر آ گئی۔ اور پھر کام کرتے کرتے کئی بار اس نے سر اٹھا کر سفیان نسیم کو دیکھا۔ جو نیا اکاونٹ تھا۔

”ادھر دیکھو سیفی مجھے میں فرخ جہاں ہوں۔ میری آنکھیں، میرے ہونٹ اور یہ گالوں میں پڑنے والے ڈبل کوئی ایک چیز بھی تمہیں اپنی طرف نہیں پکارتی۔“

مگر سفیان نسیم اس کے وجود سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہا۔ تب وہ اٹھ کر خود ہی اس کی میز پر چلی آئی۔

”ارے وہ سیفی صاحب! وہ جعفر اینڈ سنز والوں کا حساب تیار کر لیا ہے۔“ اس نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”جی فرخ آپا! بس چند منٹوں میں تیار ہوا جاتا ہے کیا قاضی صاحب نے مانگا ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے مری مری آواز میں کہا۔

”میں نے یوں ہی پوچھ لیا تھا۔“ اور غور سے سفیان کو دیکھا۔

”میں فرخ آپا نہیں فرخ جہاں ہوں صرف فرخ جہاں۔“

اور اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر سفیان مسکرایا۔

”آپ فکر نہ کریں فرخ آپا۔ میں حساب تیار کر کے ابھی آپ کی طرف بھیج دیتا ہوں۔“

اور وہ سر ہلا کر تھکے تھکے قدموں سے واپس چل دی۔ اور پھر چپکے سے ہاتھ روم میں جا کر اس نے لپ اسٹک پونچھ ڈالی۔ کاجل صاف کر دیا۔

”سوری اماں! اب میں آپ کی کچھ مدد نہیں کر سکتی کہ اب میں فرخ جہاں نہیں فرخ آپا ہوں۔“

صرف فرخ آپا۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ اور آنکھوں میں آنسو چپکنے لگے۔

”احترام کی وہ دیواریں جو میرے ارد گرد کھڑی ہیں۔ میں انہیں گرانے کا حوصلہ نہیں رکھتی اور اب میں آپا ہوں صرف آپا..... فرخ جہاں نہیں۔“

اور اس کے اندر جیسے کوئی بہت بڑی عمارت ہو لے کر کے گرتی چلی گئی ہو اور اس گرتی عمارت کو کسی نے آگ لگا دی ہو۔ دھوئیں میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ تو آنکھیں خود بخود چھلک پڑیں۔

فرحان حیدر، آصف علی شاہ اور بہت سے دوسرے چہرے ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ مگر وہ ان سب کی دسترس سے دور کھڑی تھی۔ ایک بلند مقام پر تنہا اور اکیلی۔

”آپا.....“ اس نے زیر لب کہا۔

”صرف آپا۔“

اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی پتا نہیں کیوں اس فضیلت پر جو اسے ملی تھی۔ یا اس تنہائی پر جو اب اس کا نصیب تھی۔

جاتا ہوں جیسے وہ میرا اپنا گھر ہو۔ میں تو اس کی ایک ایک عادت سے واقف ہوں۔ وہ کسی بات پر دل جلانے کا عادی نہیں دوستوں میں کئی بار ایسی باتیں ہوئیں کہ وہ اگر ان سے ناراض ہو جاتا تو حق بجانب تھا لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ وہ تو ہر بات سے لطف اٹھانے کا قائل تھا۔ پھر اب اسے کیا ہو گیا ہے کہ روز بروز گھلتا جا رہا ہے۔ کئی بار میں نے اس سے پوچھا ہے۔

”افضل! یار! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو تو اتنا تھڑکلا نہیں تھا۔“

لیکن ہر بار وہ ایسی نظروں سے مجھے دیکھتا ہے کہ کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔ حالانکہ میرا دل چاہتا ہے، اسے پرت پرت کھول کر دیکھوں مگر اس نے تو چپ کی ایسی بکل اوڑھی ہے کہ منہ سے کچھ بولتا ہی نہیں اور اب تو مجھے بھی یہ خوف ہو چلا ہے کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو رہا؟ کہیں ذہن نے اس کا ساتھ تو نہیں چھوڑ دیا۔ چچا شہباز نے کئی بار مجھ سے کہا ہے۔ ”تم اس کے دوست ہو وحید! کچھ کرو۔ کسی طرح اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلو ہماری تو وہ سنتا ہی نہیں۔ شاید تمہاری بات مان لے۔“ میں نے کتنی کوشش کی ہے کہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں تاکہ وہ شک جو ہم سب کے ذہنوں میں پرورش پا رہا ہے، اس کی تصدیق یا تردید ہو سکے لیکن اس کے پاس تو یہی ایک جواب ہے۔

”میں بیمار نہیں ہوں پھر بھلا ڈاکٹر کے پاس کیوں جاؤں؟“

”تم ٹھیک نہیں ہو افضل، کبھی آئینے میں شکل دیکھی ہے؟ کسی وحشت برس رہی ہے تمہارے چہرے پر! کیسے گھل رہے ہو تم۔“

”وہم ہے تمہارا۔“ وہ پڑمردگی سے مسکرا دیتا ہے۔ میں پورے یقین سے کہتا ہوں۔ ”تم بیمار ہو۔ تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔“

”نہیں۔“ وہ جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کرتا ہے۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ پھر شرمندہ شرمندہ سا چور نظروں سے مجھے دیکھتا ہے۔

”ٹھیک ہو تو پھر پہلے کی طرح گھومتے پھرتے کیوں نہیں؟ وہ تمہاری شوخیاں اور شرارتیں کیا ہوئیں؟ اسد اور نوید تمہیں یاد کرتے ہیں۔ وسیم کئی بار تمہارا پوچھ چکا ہے۔ اس کا خیال ہے، شاید تم کسی دوشیزہ کے حسن جہاں سوز کی نذر ہو چکے ہو۔ اگر کوئی ایسی بات ہے تو بتا دو..... میں تمہارا دوست ہوں۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ مجھے یقین ہے شہباز چچا اپنے اکلوتے بیٹے کی خواہش کو رد نہیں کریں گے۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“

تھوک

وہ بند کمرے میں بیٹھے بیٹھے اکٹا جاتا ہے تو باہر نکل آتا ہے اور پھر راہ چلتے ٹھنک کر رک جاتا ہے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جیب سے رومال نکال کر چہرہ صاف کرتا ہے اور پھر اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار پھیل جاتے ہیں۔ یوں جیسے وہ اندر ہی اندر نادم ہو رہا ہو۔ کبھی کبھی وہ یوں ہی شرمندہ شرمندہ سا مجھ سے پوچھتا۔ ”یار دیکھو میرے چہرے پر تھوک تو نہیں لگا۔“ اور جب میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ نہیں، اس کا چہرہ تو بالکل صاف ستھرا ہے اور اس پر کوئی تھوک وغیرہ نہیں لگا تو وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا ہے۔ اور رومال سے فرضی تھوک صاف کر کے شکوہ بھری نظروں سے مجھے دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔ ”یار تم بھی صحیح بات نہیں بتاتے۔ دوست ہو کر مجھ سے فریب کرتے ہو۔“

جب دو تین بار اس سے ایسی ہی حرکت سرزد ہو جاتی ہے تو وہ ایک بار پھر کمرے میں بند ہو جاتا ہے۔ پچھلے چند ماہ سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ خوب صابن مل کر نہاتا ہے اور پھر مجھ سے تصدیق چاہتا ہے کہ کہیں اس کے چہرے پر تھوک تو نہیں لگا ہوا میرے یقین دلانے پر بھی اسے یقین نہیں آتا۔ میں اسے کھینچ کھینچ کر باہر لاتا ہوں اور وہ پھر کمرے میں بند ہو جاتا حالانکہ کہ وہ پہلے ایسا تھا۔ بڑا ہی یار باش قسم کا آدمی تھا۔ ہنسا ہنسا، شور و غل، جھپٹ چھاڑ، ہنگامے، محفلیں جمانا اس کے پسندیدہ مشاغل تھے اب ہماری محفلیں اس کے بغیر سونی ہو گئی تھیں۔

بچپن سے ہی ہم اکٹھے رہ رہے ہیں ہم نے بچپن سے لے کر اب تک کا وقت ایک ہی محلے میں گزارا ہے۔ ایک ہی سکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ہم دونوں کے خاندان ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گھلے ملے ہوئے ہیں جیسے قریبی رشتے دار ہوں۔ اگرچہ ان کے ہاں پردے کی سخت پابندی ہے لیکن اس کی بہنیں اور ماں مجھ سے پردہ نہیں کرتیں میں اس کے گھر اس طرح آتا

”اچھا تو پھر چلو ساحل سمندر پر جاتے ہیں اور وہاں پہلے کی طرح ہاتھو میں ہاتھ ڈال کر گھومیں گے۔ آتی جاتی خوبصورت لڑکیوں کو دیکھیں گے۔ یاد ہے نا تمہیں وہ گلابی سوٹ والی سانولی سی لڑکی جس کی آنکھیں بے حد بڑی بڑی تھیں اور بال کتنے بے تحاشا خوبصورت گھنے اور سیاہ تھے۔ تم نے اس کا نام سانولی ہی رکھ چھوڑا تھا۔ یاد ہے ایک بار تم نے مذاق مذاق میں کہا تھا کہ میں تو اسی سانولی لڑکی سے بیاہ کروں گا۔ کیا پتا، آج وہ ساحل پر آئی ہو۔“

”نہیں۔“ اس کا چہرہ سخت ہو جاتا۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل جاتی۔ ”تمہیں پتا ہے، لوگ بڑے کمینے ہیں۔ راہ چلتے منہ پر تھوک دیتے ہیں میں باہر گیا تو وہ سب مجھ پر تھوکیں گے۔“

پھر وہ رومال نکال کر چہرے سے خیالی تھوک صاف کرتا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیتا ہے۔ میں تاسف سے بند دروازے کو دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ ضرور کوئی بات ہے۔ کسی نے بھرے بازار میں اس کے منہ پر تھوک دیا ہے۔ اور احساس توہین نے اس کا دماغ الٹ دیا ہے۔ میں نے کئی بار سوچا ہے اور پھر خود ہی اس کی تردید کر دی ہے۔ وہ ایسا نہیں ہے کہ اسے دل پر لے لے وہ تو ایسا تھا کہ اگر کوئی اس منہ پر تھوکتا تو وہ جواباً اس کے منہ پر تھوک کر ایسا قہقہہ لگاتا کہ مقابل شرمندہ ہو ہو جاتا۔

سب اس کے لیے پریشان ہیں۔ اس کی ماں، اس کا باپ اور اس کی بہنیں۔ میں نے کئی بار ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں۔ اکلوتے لاڈلے بیٹے اور بھائی کی خاموشی نے ان کے ہونٹوں کی ہنسی بھی چھین لی ہے۔

”ضرور کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے۔“ اس کی ماں کو پورا یقین ہے۔ ”کئی لوگوں کی نظریں میرے بچے پر لگی ہوئی تھیں۔“

وہ ٹونے ٹونے کرتی پھر رہی ہیں۔ اس شہر کراچی میں تو کوئی بزرگ ایسا نہیں رہا جس کے در پر انہوں نے حاضری نہ دی ہو لیکن نہ جانے یہ کیسا جادو ہے کہ کسی تعویذ، کسی ٹونکے سے ذائل ہی نہیں ہوتا اور وہ اندر ہی اندر گھل رہا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کی حالت دیکھ کر مجھے بہت رونا آتا ہے۔ لیکن کیا کروں، میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

ابھی چند دن پہلے کی بات ہے، اس کی بہن کی منگنی تھی۔ گھریلو تقریب تھی۔ میرے والدین کے علاوہ اس کی بہن کے سسرال میں سے صرف اس کا منگیترا، اس کے والد اور والدہ آئی تھیں۔ وہ باہر آ کر بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے بڑی مشکلوں اور منتوں سے اسے باہر لایا

تھا۔ وہ جھینپا جھینپا سا آ کر بیٹھ گیا تھا اور مسلسل زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سب کتنے خوش تھے۔ ہنسی مذاق اور تہنقہوں کے درمیان چائے پی گئی تھی۔ اس کی دونوں چھوٹی بہنیں اپنے بہنوئی رنی کے ساتھ مذاق کر رہی تھیں۔ رفعت بھی بہت شوخ ہو رہے تھے اور مسلسل مینا کو چھیڑ رہے تھے کہ اچانک اس نے غصیلی نظروں سے مینا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”مینا تم نے..... تم نے میرے چہرے پر تھوکا۔“

”نن..... نہیں تو۔“ مینا زرد پڑ گئی ”میں تو دلہا بھائی سے۔“

”جھوٹ مت بولو۔“ اس کی آنکھیں خون رنگ ہو گئیں اور چہرے سے وحشت برسنے لگی۔ اس نے جب سے رومال نکالتے ہوئے مینا کی طرف دیکھا اور یوں آگے بڑھا جیسے اسے مار ڈالے گا۔ ”ہوش کرو افضل۔“ میں نے اپنے بازو اس کے گرد حائل کرتے ہوئے اسے ہولے سے تھپکا۔ ”تمہاری بہن کے سسرال والے کیا کہیں گے یار۔“

”اس نے..... اس نے مجھ پر تھوکا۔“ اس نے روہانسی آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں کے کٹورے چھلک پڑنے کو بیتاب ہو گئے۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے افضل! بھلا مینا ایسا کر سکتی ہے؟“

”تم بھی..... تم بھی یہی کہہ رہے ہو۔ اس نے مجھ پر تھوکا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں ہوگا..... پوچھو..... پوچھ لو اس سے۔“

مینا سہمی سہمی سی کھڑی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”چلو افضل اپنے کمرے میں۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا تو وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگا اور بولا پہلے اس سے پوچھو اس نے مجھ پر کیوں تھوکا؟“

مینا رونے لگی۔ سب ترحم بھری بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

رفعت نے پوچھا تو شہباز چچا نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔

چچی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ”دو تین ماہ سے یہ حال ہے۔ پہلے تو بالکل ٹھیک تھا۔ ضرور میرے بچے پر کسی نے کچھ کر دیا ہے بٹ صاحب۔“ چچی نے روتے روتے رفعت کے والد کی طرف دیکھا۔

”نہیں بہن یہ سب آپ عورتوں کے وہم ہوتے ہیں، میرے ایک دوست ہیں ڈاکٹر مبین۔ برین اسپیشلسٹ ہیں۔ آپ انہیں دکھالیں انسانی دماغ کی پیچیدگیوں کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ میں آج ہی رات ڈاکٹر مبین سے بات کروں گا۔“

”آپ کی بڑی مہربانی ہوگی بھائی صاحب“

”مہربانی کی کیا بات ہے؟ آپ کا بیٹا میرے لیے بھی بیٹوں کی طرح ہے۔“
وہ ابھی تک اس طرح گرد و پیش سے بے خبر سر نہوڑائے بیٹھا تھا۔ میں بڑی مشکلوں سے اسے کمرے میں لایا۔ آج اس کی حالت زیادہ خراب لگ رہی تھی۔ اس کے سوجانے کے بعد میں دیر تک چچا شہباز سے اس کے متعلق باتیں کرتا رہا یہی فیصلہ ہوا تھا کہ کسی بہانے اسے ڈاکٹر مبین کے کلینک میں لے جایا جائے اور پھر ڈاکٹر مبین جو علاج بھی تجویز کریں، اس پر عمل کیا جائے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مبین نے اسے اچھی طرح دیکھا دماغ کے کئی ایکسرے اور مختلف قسم کے چیک اپ ہوئے۔ سب کچھ نارمل تھا۔ ”انہیں کوئی سایا وایا تو نہیں؟“ شہباز چچا نے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔
”ارے نہیں بھائی صاحب! کوئی سایا وایا نہیں آپ کا بچہ صحت مند ہے۔ بس کسی قسم کی کوئی نفسیاتی الجھن ہے۔ آپ ڈاکٹر راشد کو دکھالیں۔ میں ان کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔ ذاتی طور پر بھی ان سے کہہ دوں گا۔ انشاء اللہ بہت جلد آپ کا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا۔“

☆☆☆

ڈاکٹر راشد نے اس کا علاج شروع کر دیا تھا۔ وہ تقریباً ہر روز اس کے ساتھ سنگ کرتے تھے۔ اب وہ ان کے ساتھ کافی بے تکلف ہو گیا تھا اور اکثر دل کی باتیں انہیں بتاتا رہتا۔ ایک دو بار انہوں نے اس پر مصنوعی نیند بھی طاری کی اور اس سے نیند کی حالت میں سوال و جواب کیے۔ کبھی کبھار وہ میری موجودگی میں اس سے باتیں کرتے۔ یوں ہی عام سی باتیں، اور پھر ہم چلے آتے۔ کبھی وہ تنہائی میں دو دو گھنٹے تک اس سے گفتگو کرتے رہتے تھے۔ اس روز خلاف معمول اس نے راستے میں جیب سے رومال نہ نکالا مگر کچھ دیر بعد مضطرب ہو کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکال لیا میں بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب یہی بات ہے میں نے ڈاکٹر کو بتائی تو ڈاکٹر راشد مسکرا دیئے اور میری موجودگی میں ہی اس سے باتیں کرنے لگے۔
”ہاں تو افضل! تم اس روز کس سانولی کے متعلق بتا رہے تھے۔ یہی نام بتایا تھا نام نے۔ وہ کون تھی؟“

”وہ.....“ اس نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”پتا نہیں وہ کون تھی، میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا لیکن پہلی بار وہ ہمیں ساحل سمندر پر ملی تھیں اور اچھی لگی تھی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، گھنے اور سیاہ بال اور کئی بار ہم نے اسے وہیں دیکھا تھا۔“
میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں دور کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی

تھیں اور یوں لگتا تھا کہ یہاں موجود نہ ہو۔

”اس کا نام سانولی تھا؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”نہیں اس کا نام زینب تھا۔“

میں چونکا۔ بھلا اسے سانولی کا نام کیسے معلوم۔ میں پوچھنا ہی چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر نے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔

”میں اسے سانولی کہتا تھا۔ دراصل اس کے سانولے رنگ میں بڑی حلاوت اور بڑی کشش تھی۔“

”تمہیں اس سے محبت ہو گئی تھی؟“

”محبت! پتا نہیں۔ شاید محبت ہو گئی تھی یا نہیں بس وہ اچھی لگتی تھی۔ بے حد۔ ایک بار میں نے اسے سلمنگ سنٹر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ خود تو نازک سی تھی۔ اسے بھلا سلمنگ کی کیا ضرورت تھی شاید وہ وہاں ملازم تھی۔ اسی خیال سے میں اگلے روز ہی بے ارادہ وہاں پہنچ گیا۔ میرا خیال صحیح تھا۔ وہ وہاں کام کرتی تھی۔ پھر میں اکثر وہاں جانے لگا۔ رفتہ رفتہ ہم باتیں کرنے لگے ایک دو بار ہم اکٹھے ساحل سمندر پر بھی گئے ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ وہ بھی شاید مجھے پسند کرنے لگی تھی ہم اکثر ملتے تھے لیکن ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں کبھی کچھ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بس ایک بار اس نے مجھ سے کہا تھا۔

”افضل! تم بہت اچھے ہو اور تمہاری ہمراہی میں زندگی بہت سہل ہو جائے گی اور شاید ان کانٹوں کی جھین کم ہو جائے جو زیست کے سفر میں اب تک میرے رفیق کار ہیں۔“

اس روز میں نے بھی سوچا تھا کہ اگر زندگی کے سفر میں سانولی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا تو زندگی بڑی سہل ہو جائے گی..... شاید یہی محبت ہوتی ہے۔“

”تو تمہیں اس سے محبت تھی۔“ ڈاکٹر نے نرمی سے پوچھا۔ ”پھر تم نے اسے کیوں چھوڑ دیا؟“

”وہ..... اسے.....“ کرب سے اس کا چہرہ جیسے جگہ جگہ سے چٹختے لگا اس نے بے چینی سے اپنی انگلیوں کو چٹایا اور بولا۔ ”پتا نہیں۔“

وہ بدستور خلا میں دیکھ رہا تھا۔

”اس نے تمہارے منہ پر تھوکا تھا، اس لیے نا؟“ ڈاکٹر نے اس کی طرف جھکتے ہوئے

سرگوشی کی۔

”ہاں۔“

اس کے ہاتھ اضطرابی طور پر اپنے چہرے کو ٹٹولنے لگے اور اس نے جیب سے رومال نکال کر چہرہ صاف کیا۔

”لیکن تم نے اس سے کیا کہا تھا؟ تم تو اس سے محبت کرتے تھے نا اور اس سے شادی کرنا چاہتے تھے پھر تم نے کیا کیا تھا؟“

”کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا۔ ڈاکٹر نے نرمی سے اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹا دیئے اور کہا ”تو پھر اسے تم سے محبت نہیں رہی ہوگی۔ وہ تم سے نفرت کرتی ہوگی۔“

”نہیں..... نہیں اسے بھی مجھ سے محبت تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا وہ مجھے اپنے بابا اور ماں سے ملائے گی۔“

”تو پھر تم اس کے بابا اور ماں سے ملنے نہیں گئے؟“ ڈاکٹر مسلسل سوال کر رہا تھا۔

”گیا تھا..... گیا تھا پر وہ.....“ اس نے خوف سے جھرجھری سی لی اور اس کی آنکھیں دھواں دھواں ہو گئیں۔ پھر وہ لمحہ بھر کو چپ ہو گیا یوں جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”مجھے اس کی طرف جانا تھا لیکن پھر راستے میں مجھے فرہاد مل گیا..... فرہاد نے مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ میرا تو کوئی ارادہ نہیں تھا اس کے ساتھ جانے کا۔ اور اسے بتایا بھی تھا کہ مجھے آج کسی سے ملنے جانا ہے اور وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے لیکن اس نے مجھ سے کہا کہ اس ملاقات سے زیادہ اہم یہ مشن ہے جس پر وہ مجھے ساتھ لے جا رہا ہے۔ بخدا مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کیا مشن ہے۔ میں نے بہت احتجاج کیا اور اسے بتانے کی کوشش کی کہ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے اور میں اگر نہیں نہ گیا تو کس قدر شرمندگی ہوگی اسے اور مجھے اس کے ماں باپ کیا کہیں گے لیکن اس نے میری ایک نہ سنی اور مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھالیا۔ اس نے مجھے ایک ریوالور بھی دیا تھا۔ خود اس کے پاس ایک کلشکوف تھیں“ وہ خاموش ہو کر اپنی انگلیاں جچانے لگا۔ اور اس کے چہرے پر کرب سے لکیریں سی بن گئیں۔

”پھر؟..... پھر کیا ہوا؟“ ڈاکٹر نے بے چینی سے پوچھا۔

”پھر.....“ وہ غلامی گھورنے لگا۔ ”پھر پتا نہیں کیا ہوا“ اس نے بے بسی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ”مجھے بس اتنا یاد ہے کہ بہت شور تھا وہاں۔ ٹھائیں ٹھائیں گولیاں چل رہی تھیں اور..... اور عورتیں رو رہی تھیں، بچے چیخ رہے تھے۔ لاشیں..... خون میں ڈوبی ہوئیں لاشیں..... اور فرہاد..... فرہاد پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا میں بہت دیر تک اسے ڈھونڈتا رہا اور پھر بالکل غیر ارادی طور

پر ایک گھر میں گھس گیا..... بالکل سامنے صحن میں تین لاشیں پڑی تھیں ایک بارہ سالہ بچے کی لاش، ایک مرد اور ایک عورت کی لاش۔ لاشوں کی آنکھوں میں ایک حیرت منہد ہوئی تھی۔ اور ایک لڑکی میری طرف پیٹھ کے ساکت بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے اور ان سیاہ چمکیلے بالوں کو دیکھ کر یکا یک مجھے سانولی یاد آ گئی..... مجھے تو اس کی طرف جانا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی اور اس کے بابا اور ماں کیا سوچتے ہوں گے کہ میں کتنا غیر ذمے دار لڑکا ہوں۔ میں نے واپس پلٹنا چاہا لیکن میرے پاؤں جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔

”بابا!“ لڑکی نے اچانک چیخ مارتے ہوئے اپنا سر ادھیڑ عمر مرد کے خون آلود سینے پر رکھ دیا تھا وہ رو رہی تھی۔ شاید روتے روتے بین بھی کر رہی تھی۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا تو اس کی آواز مجھے صاف سنائی دینے لگی۔ وہ شخص شاید اس کا باپ تھا۔

”بابا!..... بابا!“ وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔ ”بابا یہ آپ ہمیں کہاں لے آئے تھے۔“

آپ تو کہتے تھے اب کوئی خوف، کوئی ڈر نہیں ہے۔ اب ہم اپنے وطن میں ہیں اور اب یہی ہماری پناہ گاہ ہے مگر یہ کیسی پناہ گاہ ہے بابا جو ہمیں پناہ نہیں دے سکی..... بابا ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھئے تو سہی، آپ کا لاڈلا پیرا امین کیسے خون میں لتھڑا پڑا ہے۔ یہ وہی کھڑا تو ہے بابا جسے آپ چومتے نہیں تھکتے تھے کہ تین جوان بیٹوں کو گنوا کر آپ صرف اسے بچا کر، چھپا کر یہاں لائے تھے اور آپ نے سارے خواب اسی سے وابستہ کر لیے تھے۔ وہ آپ کے لیے عارف، عابد، خالد بیٹوں کا نعم البدل تھا۔ لیکن بابا آپ کے خواب مٹی میں مل گئے۔ جنہیں آپ نے محافظ سمجھا تھا، وہ تو لٹیرے نکلے۔ بابا آپ تو کہتے تھے پہلی بار ہم سے غلطی ہوئی تھی ہم نے انہیں اپنا سمجھ لیا تھا لیکن وہ غیر تھے، پر بابا آپ تو دوسری بار بھی ٹھوکر کھا بیٹھے۔ بابا آپ تو کہتے تھے کہ آپ نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک الگ وطن حاصل کیا تھا تو کیا اسی لیے کہ بار بار بے گھر ہوتے رہیں؟ ایک بار آپ نے اپنے ماں، باپ، بہن بھائیوں کو گنوا یا اور دوسری بار تین جوان بیٹوں کی جدائی کا کرب سہا اور اب بچی کچھی متاع بھی لٹا بیٹھے۔“

وہ یوں ہی روتے روتے شکوہ کر رہی تھی اور میں ساکت کھڑا تھا میرا دل اس اجنبی لڑکی کے دکھ پر رو رہا تھا۔

”بابا ایک بار آنکھیں کھول کر مجھے صرف اتنا بتا دو کہ جب یہاں بھی ہماری زندگی محفوظ نہیں تھی تو پھر ہم وہ شہر! دیس چھوڑ کر کیوں آئے تھے؟ وہ ٹھنڈے پانیوں کا دیس جس میں ناریل اور سپاری کے درخت تھے اور جہاں ہم عابد، عارف اور خالد کو یونہی بے گور و کفن چھوڑ آئے تھے۔“

تمہیں یاد ہے نا بابا! تم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ مجھے ناریل کے اس جھنڈ میں اس چشمے کے پاس دفن کرنا لیکن پھر ہم وہ شہر، وہ دیار ہی چھوڑ آئے پر کیا فائدہ ہوا بابا! ہم وہاں رہتے تو کم از کم تمہاری خواہش پوری ہو جاتی بابا!..... میرا بہت دل چاہا، اس اجنبی لڑکی کو تسلی دوں جو اپنے ہی وطن میں اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں بے سہارا ہو گئی تھی میں نے ایک قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ اچانک اس نے سر اٹھایا اور چھوٹے بچے کے خون آلود چہرے کو بے تحاشا چومنے لگی۔ میں نے ہولے سے کھنکارا تو وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھر جیسے ہی میرے نظر اس کے چہرے پر پڑی میں بھونچکا رہ گیا۔

”تم..... تم زینی؟ سانولی؟“

وہ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا۔ سچ میں بہت شرمندہ ہوں زینی..... بابا اور ماں جی میرا انتظار.....“ پھر یکا یک ہی مجھے تلخ حقیقت کا ادراک ہو گیا اور لفظ میرے ہونٹوں پر ٹوٹنے لگے۔ ”یہ..... یہ بابا اور ماں جی..... زینی یہ.....“

وہ ساکت نظروں سے میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا احساس ہوتے ہی ریوالور میرے ہاتھوں سے گر پڑا۔

”نہیں..... نہیں زینی، اس طرح مت دیکھو..... میں نے..... میں نے کچھ نہیں کیا..... یہ..... یہ تو فریاد نے مجھے دیا تھا۔ دیکھ لو اس میں پوری گولیاں موجود ہیں۔“

لیکن وہ اس طرح میرے ہاتھوں کو گھور رہی تھی۔

”سانولی! چلو میں تمہیں اپنے گھر لے چلوں۔ یہ مانی، بابا اور ماں جی..... انہیں.....“

میں آگے کچھ نہ بول سکا۔

اس کا چہرہ پتھر ہو رہا تھا میں نے گھبرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ”سانولی!“

تو اس نے جھرجھری لی جیسے گہری نیند سے جاگی ہو اور..... اور.....

”ہاں..... پھر کیا ہوا؟“ ڈاکٹر نے نرمی سے افضل کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اس کا

چہرہ تپ کر سرخ ہو گیا تھا..... ”اس نے مجھے کچھ نہیں کہا، ایک لفظ بھی نہیں..... بس بس میرے چہرے پر تھوک دیا اور اور زمین پر پڑا ہوا ریوالور اٹھا کر اپنی کپٹی پر رکھ کر گولی چلا دی۔“

افضل دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زینی نے اس کے چہرے پر نہیں، میرے چہرے پر تھوکا ہو، میرے ہاتھ بے اختیار اپنے چہرے کی طرف اٹھ گئے۔ عین اسی لمحے میری نگاہ ڈاکٹر راشد کے چہرے پر پڑی وہ بھی رومال جیب سے نکالے اپنا چہرہ صاف کر رہے تھے۔

کو سچن مارک

”اوہ خدایا! اسرئی تم اتنا کام بھی نہیں کر سکتیں۔ اب کیا تھا اگر تم خود جا کر بچوں کی فیس جمع کروا دیتیں۔“ عارف نے اسکول سے آیا ہوا نوٹس غصے سے اس کے سامنے پھینک دیا۔

”تمہیں تو پتا ہے میں کتنا مصروف رہتا ہوں، نیا نیا بزنس ہے میرا..... پھر بھی بخدا، مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ تم اس قدر ڈری سہی اور اعتماد سے محروم لڑکی ہوگی۔ مجھے تو ایک خود اعتماد شریک زندگی کی خواہش تھی۔ جو میرے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلے۔ جو ذرا سی باتوں کے لیے میری محتاج نہ ہو بلکہ مشکل لمحوں میں میرا ساتھ دے، میرا حوصلہ بڑھائے۔ نہ یہ کہ دو قدم تک جانے کے لیے بھی میری محتاج ہو۔“

عارف کی آواز میں پیچھے تا دوں کی جھلک تھی۔

”میں نے سوچا تھا کہ تم ایک پڑھی لکھی باشعور اور حساس لڑکی ہو۔ تمہارے اندر احساس ذمہ داری ہوگا۔ تم میرے پر اہلن کو شیر کر دوگی۔ میں اکلوتا تھا اور مرا کوئی دوست بھی نہ تھا۔ جو کسی مشکل لمحے میں میری رہنمائی کرتا، مجھے گائیڈ کرتا۔ میرے دکھ درد کو محسوس کرتا۔ میرے زخموں پر مرہم رکھتا۔ تب میں سوچتا تھا کہ وہ ایک لڑکی جو میری زندگی میں داخل ہوگی، وہ میری بہترین رفیق ہوگی۔ میں ہارنے لگوں گا تو میری رہنمائی کرے گی۔ دکھی ہوں گا تو دکھ کے کانٹے اپنی انگلیوں کے پوروں سے چن لے گی۔ مگر تم اسرئی۔“ اس نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”تم میرے ہارنے کے تصور سے بھی کانپنے لگو گی۔“

”میری رہنمائی کرنے سے پہلے خود ہی بھٹک جاؤ گی۔“

”میرے درد کو جان کر مر جاؤ گی۔“

”تم سے تو اتنا بھی نہ ہو سکے گا کہ اگر میں تمہارے سامنے مر رہا ہوں تو تم کسی ڈاکٹر کو

ہی بلا لاؤ..... تم.....“ عارف نے بات کرتے کرتے ایک نظر اسے دیکھا جس کا رنگ خطرناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔ پھر ناگواری سے اسے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ یونہی زرد چہرے کے ساتھ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں

’یہ عارف بھی کیا کہہ گیا تھا‘

’یہ اس کے کانوں نے کیا سنا تھا‘

’کیا یہ ناپسندیدگی کا اظہار تھا‘

’چھ سالوں بعد آج..... آج پہلی بار..... وہ تو اپنی وائسٹ میں خود کو اس کی پسند میں ڈھالے ہوئے تھی‘

’وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اس نے خود کو ایک مرد کی خواہش اور پسند کے مطابق ڈھال لیا ہے، اور ان چھ سالوں میں ایک بار بھی عارف نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ..... اور خود کو عارف کی ایک مرد کی پسند میں ڈھالنے کے لیے اسے خود اپنے اوپر کتنا جبر کرنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ عارف..... اوہ خدایا.....‘ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔

گلابی گلابی اسرئی کی پیشانی کو چومتے ہوئے بابا نے صالحہ خاتون کی نم آنکھوں کو دیکھا اور ننھی اسرئی کو اپنے ساتھ بٹھنے ہوئے مسکرائے۔

”نہ۔ نہ صالحہ۔ اس ننھے فرشتے کے لیے تیری آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔ یہ تو میرا بیٹا ہے۔ میرا بازو، میرا سہارا۔“ انہوں نے ایک بار پھر اس کی روشن پیشانی کو چوم لیا۔

بیٹا نہ ہونے کی کک اپنی جگہ لیکن صالحہ خاتون نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔ اور بابا نے اپنا کہا بچ کر دکھایا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ دفتر مارکیٹ، بازار اکثر وہ ان کی انگلی پکڑے ان کے ساتھ ہوتی۔ بابا نے اس کی ذات کو جو اعتماد بخشا تھا اس نے بہت چھوٹی عمر میں ہی اسے بڑا سمجھ دار اور بڑا بردبار بنا دیا تھا۔

”مجھے بابا کا بیٹا بننا ہے۔ اور میں کوئی کمزور لڑکی نہیں ہوں۔“ وہ خود سے بابا کے کہے ہوئے الفاظ دہراتی۔

اور جب بڑی آیا چھپکلی سے خوف زدہ ہو کر چیخ کر بیڈ پر چڑھ جاتیں تو وہ بڑے اطمینان سے بڑی سے بڑی چھپکلی کو جھاڑو سے دبائے صحن تک لے جاتی۔

اور جب چھوٹی آپا کچن میں کاروچ دیکھ کر کچن میں جانے سے انکار کر دیتیں اس وقت بھی وہ مدد کے لیے پہنچتی۔

”اسرئی، تجھے چھپکلیوں اور کاروچوں سے ڈر نہیں لگتا؟“ چھوٹی آپا معصومیت سے

پوچھتیں۔

”نہیں تو۔“ وہ بڑے فخر سے کہتی! ”میں تو بابا کا بیٹا ہوں۔“ اور بابا کو بھی اس پر بے جا فخر نہیں تھا۔ پڑھائی میں بھی وہ سب سے اچھی تھی۔ چھوٹی آپا اور بڑی آپا تو مارے باندھے پڑھتی تھیں۔ بس بمشکل پاس ہوتیں لیکن وہ نرسری سے ہی کلاس میں اول آ رہی تھی اور صرف پڑھائی میں ہی نہیں، دوسری سرگرمیوں میں بھی وہ سب سے آگے ہوتی تھی اور پھر یہی نہیں، اللہ میاں نے اس کے سینے میں ایک بہت محبت بھرا دل رکھا تھا۔ اس کے دل میں ہر ایک کے لیے بے پایاں محبت تھی۔ اماں کے سر میں درد ہے تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ان کا سر دبا رہی ہے۔ بابا دفتر سے آئے ہیں تو وہ بھاگ کر ان کے لیے چائے لارہی ہے۔ ان کے کپڑے ہاتھ روم میں رکھ رہی..... بڑی آپا کی سہیلیوں سے رسالے مانگ کر لانے ہیں تو اسرئی لارہی ہے چھوٹی آپا کے دوپٹے رنگوانے ہیں تو اسرئی جارہی ہے۔

اماں کے لیے دوائیں لانی ہیں تو اسرئی تیار ہے۔ یوں بچپن میں ہی وہ جیسے خود کو گھر کا سربراہ سمجھنے لگی تھی، جیسے گھر کے بہت سارے کام اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتے تھے اور پھر جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کے دل میں احساس قوی ہوتا گیا کہ اسے سب گھر والوں کے دکھ درد بانٹنے ہیں۔ اماں جان جنہیں کبھی کبھی بیٹا نہ ہونے کا دکھ بری طرح ستاتا تھا۔ ان کا بھی اسے خیال رکھنا تھا۔ وہ گھنٹوں ان کے پاس بیٹھی اپنی نرم نرم باتوں سے سمجھاتی رہتی۔

وہ بابا کی تھکاوٹیں بانٹتی رہتی جو عمر سے پہلے ہی تھکتے جا رہے تھے۔

”میں جو ہوں بابا آپ کا بیٹا۔“ وہ انہیں تسلی دیتی۔

اور پھر بڑی آپا تھیں جنہیں اپنی کم تعلیم کا غم تھا..... حالانکہ میٹرک کے بعد سلسلہ تعلیم تو وہ خود ہی چھوڑ بیٹھی تھیں مگر اب انہیں کم علمی کا احساس ستاتا تھا۔ ان کے اندر کہیں یہ ڈر بیٹھ گیا تھا کہ کہیں یہ کم تعلیم اس کی خوشیوں کی راہ میں حائل نہ ہو جائے۔

تب جب وہ خود فرسٹ ایئر میں آئی تو بڑی آپا کو بھی..... پڑھانے لگی اور بڑی آپا کو پڑھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پونٹری کی دو لائیں سمجھانے کے لیے گھنٹوں مغز ماری کرنی پڑتی تھی۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور بڑی آپا نے قسطوں میں سہی ایف اے سیکنڈ ڈویژن میں کر ہی لیا۔ اور پھر چھوٹی آپا تھیں۔ جنہیں خواہ مخواہ ہی رنگت کا کمپلیکس ہو گیا تھا۔ سلونا سارنگ تھا جس کی اپنی ایک کشش تھی لیکن وہ ہر وقت پریشان ہی رہتیں۔

تب وہ انہیں کسی بزرگ کی طرح سمجھاتی۔ اور فرینڈز سے پوچھ پوچھ کر رنگ گورا کرنے

کی کریمیں خرید کر دیتیں۔

اور یوں ایسے ماحول میں پلنے والی اسرئی کی شخصیت میں بلا کا نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے اس کے اندر ایک عجیب سی شان بے نیازی پیدا کر دی تھی چھوٹی سی پونی ٹیل بنائے سادہ سے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں وہ خود بخود ہی دوسروں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ سیاہ چمکیلی آنکھیں، گلابی رنگت، چھوٹی سی ناک، روشن پیشانی وہ کالج کی بے حد پاپولر اسٹوڈنٹ تھی۔ لڑکیوں کے اکثر مسائل چٹکی بجاتے ہی حل کر دیتیں لڑکیاں اکثر اسے گھیرے رکھتیں۔

”اسرئی پلینز، یہ کتابیں تو ایڈوکرادو۔“

”اسرئی پلینز، ذرا مسز ربانی سے فزکس کے نوٹس کی فوٹو اسٹیٹ تو لا دو۔“ اور وہ پیشانی پر شکن لائے بغیر سب کے کام کیے جاتی۔

بی ایس سی کے بعد اس نے ایم بی اے میں ایڈمیشن لے لیا تھا کہ یہ بابا کی خواہش تھی کہ وہ ایم بی اے کرے اور پھر ان کے ساتھ بزنس میں ان کا ہاتھ بنائے۔ گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ ان کا بزنس پھیلتا جا رہا تھا۔

”کیوں کیا اس کی شادی نہیں کرو گے۔ ساری عمر بٹھائے رکھو گے؟“ صالحہ خاتون کو حیرت ہوتی۔

”شادی بھی ہو جائے گی۔“ وہ مسکراتے ”تم اس کی فکر نہ کیا کرو۔“

اور واقعی انہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ ان سب کی فکر رکھتی تھی۔ بابا بیمار ہوئے تو اماں کو ہاتھ پیر پڑ گئے۔ رات کے بارہ بجے اچانک ہی درد اٹھا تھا اور ہرگزرتے لمحے کے ساتھ بابا کا رنگ زرد ہوتا جا رہا تھا۔

”اب..... اب کیا ہوگا؟“

چھوٹی آپنی اور بڑی آپنی رونے لگیں۔

”خدا کے لیے بڑی آپا۔“ اس نے انہیں خاموش کروا دیا اور اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں فون کر کے پتا کیا کہ وہاں ڈیوٹی پر کوئی موجود ہے یا نہیں۔ اور پھر گاڑی نکال کر بابا کو سہارا دے کر گاڑی میں لٹایا۔ پاس اماں بیٹھیں اور سارا راستہ دعائیں پڑھتی گئیں کہ کہیں حادثہ ہی نہ ہو جائے۔

”اور اس کجخت ڈرائیور کو بھی آج ہی چھٹیاں لے کر جانا تھا۔“ راستے میں کتنی ہی بار انہوں نے کہا تھا لیکن وہ بے نیازی سے ڈرائیور کرتی رہی اور پھر ڈاکٹر سے ملنا۔ ان سے ڈسکس

کرنا..... بابا کی دوائیاں، دفتر میں تھوڑی دیر جا کر ان کا کام سنبھالنا۔ یہ سارے کام وہ اتنی خوش اسلوبی سے کر رہی تھی کہ کئی بار صالحہ خاتون کو یہ گمان گزرا جیسے وہ سچ ان کا بیٹا ہی ہو۔ بابا کو معمولی سا انجانپنا کا ایک ہوا تھا۔ شاید کام کا بوجھ تھا۔ ڈاکٹروں نے انہیں آرام کی تلقین کی تھی اور اس نے کئی دن تک دفتر نہ جانے دیا۔ یونیورسٹی سے سیدھی وہ دفتر جاتی۔ وہاں کے معاملات دیکھ کر سمجھ کر گھر آتی اور گھنٹوں بابا سے کاروباری مسائل پر ڈسکس کرتی۔ اور بابا بہت خوش ہوتے۔ اور پھر بابا صحت یاب ہو کر آفس جانے لگے تو وہ پڑھائی میں مصروف ہو گئی اور انہی دنوں بڑے ماموں کا بلاوا آ گیا۔ آصف بھائی اور عابدہ آپنی کی شادی تھی۔ اور انہوں نے پندرہ دن پہلے ہی انہیں بلوایا تھا..... بلکہ بڑے ماموں نے خاص کر تاکید کی تھی کہ ممکن ہو سکے تو بیچوں کو تو ابھی سے بھیج دیں۔ اسی بہانے کچھ دن نکھیل میں رہ لیں گی۔ اس کا جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ صرف چھوٹی آپا اور بڑی آپا تیاری کر رہی تھیں کہ اچانک ہی یونیورسٹی بند ہو گئی۔ کوئی معمولی سا ہنگامہ ہوا تھا۔ ایک طالب علم مارا گیا اور طلباء حسب معمول سڑکوں پر نکل آئے۔ یونیورسٹی نامعلوم مدت کے لیے بند ہو گئی تو بابا نے اسے مجبور کیا کہ وہ بھی چلی جائے۔

”مگر بابا، یہاں آپ اور اماں اکیلے جو رہ جائیں گے۔“

”ارے نہیں بیٹا، ہم دواکیلے کیسے ہوں گے، پھر نوکر ہیں ڈرائیور ہے۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔“

”مگر آپ روز فون کرنے کا وعدہ کریں تب۔“

اور بابا نے وعدہ کر لیا کہ وہ ہر روز فون کر کے اسے اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیں گے۔

اور وہاں بڑے ماموں کے گھر میں سب نے ہی انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ بڑے ماموں، چھوٹے ماموں اور منجھلے ماموں تینوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ بڑے ماموں کے تین بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ منجھلے ماموں کے چاروں بیٹے تھے۔ جبکہ چھوٹے ماموں کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں۔ کینیڈا سے چھوٹی خالہ کوئی پندرہ سال بعد آئی تھیں۔ ان کی بھی دو بیٹیاں تھیں اور یوں گھر میں خوب رونق تھی۔ جلد ہی وہ سب سے بے تکلف ہو گئی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اتنے عرصے بعد ملے ہیں۔ اسے اپنے کزنز بہت اچھے لگے تھے۔ محبت کرنے والے، گرمجوش اور پر خلوص۔ رات گئے تک محفل جمتی۔ لیکن چھوٹے ماموں کا بڑا بیٹا ناسک بہت کم ان محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ شروع دن سے ہی اسرئی نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ بہت خاموش طبع اور کم گو سا ہے۔ وہ غالباً کسی سے بھی زیادہ بے تکلف نہیں تھا۔ اپنے آپ میں ہی گم رہتا تھا۔

”یہ ناسک بھائی سب سے الگ تھلگ کیوں رہتے ہیں؟“ ایک روز اس نے بڑے ماموں کے ظفر سے پوچھا۔

”بس شروع ہی سے وہ ایسے ہیں۔“ ظفر نے اسے بتایا۔ ”دراصل چھوٹی ممانی کا مزاج بہت تلخ ہے اور ناسک بھائی کو انہوں نے پہلے دن ہی قبول نہیں کیا تھا۔ چھوٹے ماموں کی پہلی بیوی ناسک کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد ہی وفات پا گئی تھیں۔ دو سال تک تو ناسک کو دادی نے پالا، پھر چھوٹے ماموں نے دوسری شادی کر لی تو ان کی خواہش تھی کہ ناسک کا خیال ممانی تاج رکھا کریں۔ مگر انہیں تو پہلے دن سے ہی ناسک سے چڑسی ہو گئی تھی۔ سو ناسک دادی کے پاس ہی رہتا تھا لیکن ابھی وہ چھ سال کا ہی ہوا تھا کہ دادی کا بھی انتقال ہو گیا۔ یوں مجبوراً ہی سہی وہ ممانی کے ذمے داری بن گیا۔ لیکن ممانی نے اسے کبھی پسند نہیں کیا۔ ماموں کی عدم موجودگی میں اسے مارنا، ڈانٹنا اور پھر اس کی جھوٹ موٹ شکایتیں..... ان حالات نے ناسک کو ایسا بنا دیا ہے۔“

”ناسک اور جنید بھائی تقریباً ہم عمر ہیں لیکن جنید بھائی اپنا ایم بی بی ایس مکمل کر کے اب ہاؤس جاب کا انتظار کر رہے ہیں، جبکہ انہوں نے بی ایس سی کا امتحان دیا ہے۔ ان کی تعلیمی کمزوری کا سبب بھی ممانی کا رویہ ہے۔“

ظفر نے تفصیل سے بتایا تو اسری کو بہت دکھ ہوا۔ خود بخود ہی اس کے دل میں ناسک کے لیے ہمدردی کا جذبہ بیدار ہو گیا تھا اور یہ ظفر کی بتائی ہوئی باتوں کا ہی اثر تھا کہ اگلی صبح حسب معمول جب وہ بیدار ہوئی تو اپنے لیے چائے بنا کر باہر لان میں چلی آئی۔ باقی سب لوگ تو نوبے تک اٹھتے تھے وہ نماز سے فارغ ہو کر اپنے لیے چائے بناتی اور تھوڑی دیر لان میں چہل قدمی کرتی اور اخبار لے کر کمرے میں چلی آتی۔

آج وہ یونہی کپ اٹھائے لان میں آئی تو اس نے لان کے کونے میں چینیلی کے جینڈ کے پاس ناسک کو بیٹھے دیکھا تو اس کے پاس چلی آئی۔

”آپ یہاں بیٹھے ہیں ناسک بھائی، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ ناسک نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں، میں سویرے اٹھنے کا عادی ہوں۔“

”میں بھی۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”چائے پیئیں گے؟“

”لیکن آپ نے تو ایک ہی کپ بنایا ہوگا۔“

”آپ یہ کپ لیں، میں اور بنالاتی ہوں۔“

”تھینکس، میں عادی نہیں ہوں۔“

”اچھا۔“ اسری نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

اچھی خاصی پرستش تھی۔ اس کے تمام تر کزنز کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہینڈ سم تھا لیکن شخصیت دبی دبی سی تھی۔

”بی۔ ایس۔ سی کے بعد کیا ارادہ ہے؟“

”پتا نہیں، ابو نے جیسا کہا۔“

”آپ کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہے۔“ اسری نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”دراصل میں نے کچھ سوچا ہی نہیں۔“

”آپ کا رزلٹ تو آنے والا ہوگا۔“

”جی۔“

اسری نے دیکھا، اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جھللا رہے تھے۔ شاید وہ اس سے بات کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ اس میں خود اعتمادی کی شدید کمی تھی۔ اسری کو بے حد افسوس ہوا کہ کہ ماموں جان نے اس پر توجہ نہ دے کر اس کی شخصیت تباہ کر دی تھی۔

”ناسک، آپ ادھر نانا جان والے حصے میں کیوں نہیں آتے۔ سچ بہت مزہ آتا ہے۔“

”ہم سب لوگ دیر گئے تک باتیں کرتے رہتے ہیں یعنی بیت بازی، کارڈز وغیرہ.....“

”وہ دراصل ممی کا خیال ہے کہ مجھے اس طرح وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

”مگر آج کل تو آپ فارغ ہیں، آپ کا کون سا وقت ضائع ہوتا ہے۔“

”جی۔“ اسے کوئی جواب نہیں سوچ رہا تھا، تب ہی چھوٹی ممانی کی چیخنی آواز سنائی دی۔

”ناسک..... ارے بھئی، صبح کہاں مر گئے ہو۔ رات میں نے تمہیں ٹیلر کے پاس جانے کے لیے کہا تھا، گئے تھے؟“

ممانی ان کے قریب آگئیں اور ایک عجیب سی نظر اسری پر ڈالی۔ اسری بے پروائی سے بیٹھی رہی اور انہیں سلام کر لیا۔

”علیکم السلام۔“ وہ پھر ناسک کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”جی ممی۔ کپڑے سلے نہیں تھے۔“

”سلے نہیں تھے، تب بھی تو بتانا تو تھا مجھے۔ عجیب بے پروا لڑکا ہے۔ نہ کسی کام کا ڈھنگ نہ سلیقہ۔ اس کی عمر کے لڑکے پڑھ لکھ کر نوکریاں کرنے لگے ہیں اور یہ ابھی.....“ وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ تو ناسک بھی سر جھکائے ان کے پیچھے ہی چلا گیا۔

اسرئی کو اس پر بے حد ترس آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ جتنے دن یہاں ہے، ناسک کو کمپنی دے گی اور اس کے اندر اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔ اور پھر یہ بھی محض اتفاق تھا کہ ناسک اچانک بیمار پڑ گیا۔ گھر میں شادی کی گہما گہمی میں کسی کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ اس پر توجہ دیتا۔ اس کا خیال کرتا۔

اسرئی نے خود بخود ہی اس کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ یوں بھی چھوٹی ممانی کو اچانک بھائی کی بیماری کی خبر سن کر کراچی جانا پڑا تھا۔ شادی میں ابھی کافی دن تھے۔ اور سب نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ اگر بھائی کی طبیعت بہتر ہوئی تو وہ شادی سے ایک دو دن قبل ضرور لوٹ آئیں گی۔ وہ اپنے ساتھ اپنے بیٹے کو لے گئی تھیں اور تینوں بیٹیاں زیادہ وقت بڑے ماموں کی طرف گزرتیں۔ اور یوں اسرئی ناسک کو زیادہ سے زیادہ وقت دے رہی تھی۔ وقت پر اسے دوائیں دینا، اس کے لیے ہلکی غذائیں تیار کرنا اور پھر اس کے پاس بیٹھ کر گپ لگانا۔ ناسک اس کا بے حد ممنون تھا۔ اس روز جب وہ اس کے لیے دودھ لے کر آئی تو اس نے مشکرانہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اسرئی، میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ نے میرا بہت خیال رکھا۔“
”اس میں ممنونیت کی کیا بات ہے بھئی۔“ اس نے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔
”یہ دودھ لیں۔“
”پلیز نہیں۔“

”اتنی کمزوری ہو گئی ہے۔ چلیں پی لیں، شاباش۔“

اور ناسک نے خاموشی سے گلاس لے لیا۔

”اسرئی، بیمار تو میں پہلے بھی ہو جاتا تھا لیکن اس طرح میرا خیال کبھی کسی نے نہیں رکھا۔ میں ساری زندگی بہت اکیلا رہا۔ بہت تنہا۔ کبھی کوئی میرے قریب نہ آ سکا۔ ابو نے بھی مجھ سے محبت نہیں کی۔ مجھ سے کبھی کسی نے محبت نہیں کی اسرئی۔ اور آپ نے میرا اتنا خیال رکھا۔ کیوں کس لیے؟“

وہ یونہی بے ربط سا بول رہا تھا۔ اور اسرئی نے محسوس کیا تھا کہ اکثر اس کی گفتگو میں ربط نہیں ہوتا تھا۔

”اس یے ناسک کہ آپ مجھے اچھے لگے۔ آپ میرے ماموں کے بیٹے ہیں اور..... اور میں نے سوچا کہ آپ سے دوستی کر لوں۔ دراصل میرا بھی کوئی دوست نہیں ہے نا اور میں گھر میں تنہائی محسوس کرتی ہوں۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

”اچھا۔“ ناسک نے اسے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”تو دوستی کچی۔“ اسرئی نے ہاتھ بڑھایا۔
”مگر تم تو لڑکی ہونا۔“

”تو کیا ہوا، بابا مجھے، اپنا بیٹا کہتے ہیں۔“
”اچھا.....“ ناسک نے ہاتھ آگے بڑھایا۔
”اسرئی، آپ۔“

”ہوں ہوں..... آپ نہیں تم۔ میں آپ سے چھوٹی ہوں۔“
”مگر دوستی میں تو کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ اس لیے تم بھی اسرئی مجھے تم کہہ کر بلاؤ۔“ اور اسرئی ہنس دی۔
”بہتر۔“

ناسک اور اسرئی کے درمیان دوستی کا رشتہ کیا قائم ہوا، ناسک نے اپنا دل کھول کر اسرئی کے سامنے رکھ دیا۔ کس قدر محرومیاں تھیں جو اس نے اپنے دل میں اکٹھی کر رکھی تھیں۔ کتنے زخم تھے جو بچپن سے لے کر اب تک اسے کلتے رہے تھے۔ اسرئی نے ایک اچھے میاں کی طرح ان سارے زخموں پر اپنی باتوں سے مرہم رکھا۔ اور اس کے دل میں چھپے محرومیوں کے سارے کانٹے چن لیے اور جب وہ شادی کے بعد گھر واپس آ رہی تھی تو ناسک اور اس کے درمیان خلوص و محبت کا ایک ٹوٹا رشتہ استوار ہو چکا تھا۔

”اسرئی، میں تمہیں بہت مس کر دوں گا۔“

”میں بھی۔“ اسرئی کی آنکھیں نم ہو گئیں مگر وہ مسکرائی۔

”تم ایسا کیوں نہیں کرتے ناسک، بی۔ ایس۔ سی کے بعد ایم بی اے کر لو اور وہاں لاہور پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لو۔ تمہارے پاس ڈبل میٹھس اور فزکس ہے نا۔“
”ہاں لیکن پتا نہیں، نمبر کیسے ہوں۔“ وہ کچھ متذبذب سا تھا۔
”مگر تم تو کہہ رہے تھے، پیپر بہت اچھے ہوئے ہیں۔“

”ہاں، اچھے تو ہوئے ہیں مگر مگر یہ کہہ رہی تھیں کہ مجھے بی۔ ایس۔ سی کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ دینا چاہیے اور ابو کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔“

”نہیں ناسک، بی۔ ایس۔ سی تمہاری منزل نہیں ہے۔ اگر تمہارے نمبر اچھے آتے ہیں تو تمہیں ایم۔ بی۔ اے ضرور کرنا چاہیے۔“ اس نے جاتے جاتے اسے کہا تھا۔

اور یہ اسرئی کا دیا ہوا اعتماد ہی تھا کہ ممانی کی شدید مخالفت کے باوجود وہ لاہور آ گیا۔ اور چونکہ اس کے نمبر بھی بہت اچھے تھے اس لیے اسے ایڈمیشن بھی آسانی سے مل گیا۔ اسرئی بے حد

خوش تھی۔ اگرچہ ناسک اس سے دو سال بڑا تھا۔ لیکن اب یونیورسٹی میں وہ اس سے ایک سال جونیئر تھا۔ وہ ہوسٹل میں رہنا چاہتا تھا لیکن صالحہ خاتون نے زبردستی اسے گھر میں روک لیا۔
”سگی پھپھو کا گھر ہو اور تو ہوسٹل میں رہے۔ نہ بچے، یہ نہیں ہو سکتا۔“ اور یوں ناسک ادھر ہی رہنے لگا تھا۔ اسری نے اس کا فارم جمع کروانے اور اسے پہلے دن اس کے ڈیپارٹمنٹ میں چھوڑ آنے تک سارے کام خود کیے تھے۔

وہ اس سے بے حد متاثر تھا۔ اور اکثر حیران ہوتا۔

اسری، یہ سارے کام تم کیسے کرتی ہو۔ حالانکہ تم لڑکی ہو۔

”بس کر لیتی ہوں۔“ وہ مسکرا دی۔ ”دراصل بابا نے شروع سے میری تربیت ہی اس

طرح کی ہے۔“

اور اسری کی رفاقت میں اس کی شخصیت پر لگا ہوا رنگ اتر گیا تھا۔ اس کی شخصیت میں اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ بے ربط گفتگو نہیں کرتا تھا۔ عجیب سا نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ وہ خود فیصلے کرنے لگا تھا۔ لیکن اسری سے وہ ہر معاملے میں مشورہ ضرور لیتا تھا۔ اسری چاہے کتنی بھی مصروف ہوتی، بہت دھیان سے اس کی بات سنتی، اسے مشورہ دیتی، اس کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو حل کرتی۔ اس کے ساتھ مل کر شاپنگ کرتیں

”ناسک، یہ شرٹ تمہارے لیے ٹھیک رہے گی۔“

”یہ سوٹ اچھا ہے۔“

”بہنوں کے لیے یہ لے لو۔ بھائی کے لیے یہ۔“

اور ناسک آنکھیں بند کیے اس کی ہر بات پر عمل کرتا۔ وہ سارے کا سارا اسری کی پسند

میں ڈھل گیا تھا۔

اس کے جسم پر اس کا پسندیدہ لباس ہوتا۔

جوتے اس کی پسند کے۔

حتیٰ کہ خدشبو بھی وہ اس کی پسند سے خریدتا تھا۔

ذرا سی اس کی طبیعت خرات ہوتی تو وہ بے چین ہو جاتی اور اسے آرام کی تلقین کرتی۔

ساری ساری رات جاگ کر اس کی تیمارداری کرتی۔ وقت پر دوا دینا اور اس کے لیے

پرہیزی کھانا تیار کرنا۔ سب کچھ وہی کرتی تھی اور ناسک دل ہی دل میں اس کا ممنون ہوتا۔

”اسری، تم بہت اچھی ہو۔ بہت مہربان۔ اگر تم میری زندگی میں نہ آتیں تو پتا نہیں۔ پتا

نہیں، میں کیا ہوتا کیا کرتا۔“ کبھی کبھی وہ اظہار کرتا۔ ”میرے اندر تو جینے کی امنگ ہی نہیں تھی۔

تم نے میرے اندر یہ امنگ پیدا کی ہے۔ تم نے اسری۔“

اور اسری مسکرا دیتی۔

وقت گزرتا رہا۔ اسری ایم۔ بی۔ اے مکمل کر کے بابا کے ساتھ ان کے دفتر جانے لگی۔ بڑی آپا کی شادی ہو گئی چھوٹی آپا کی منگنی بھی مچھلے ماموں کے حقیظ سے کر دی گئی۔ ناسک اپنے فائنل کے پیپرز دے رہا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح اسری اس کا بے حد خیال رکھ رہی تھی۔ کمرے میں کھانا، ناشتا سب اسے مل جاتا تھا۔ رات کو بھی وہ ایک بار ضرور اسے چائے بنا کر دیتی۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی آپا کی شادی کی بھاگ دوڑ کبھی وہ جیولر کے پاس جا رہی ہے کبھی فرنیچر والے کے پاس۔ ناسک کے پیپرز کے بعد رخصتی کی تاریخ طے پائی تھی۔

”تم تھکتی نہیں ہو اسری؟“ کبھی کبھی وہ پوچھتا۔

”سوری اسری، میں تمہاری مدد بھی نہیں کر پا رہا۔“

”بے فکر رہو۔ تمہارے لیے بہت سے کام رکھ چھوڑے ہیں۔“

اور پھر امتحان سے فارغ ہوتے ہی گھر میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔ چھوٹے ماموں نے اسے گھر بلایا تھا لیکن وہ اسری کی مدد کے خیال سے رک گیا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں، اسے محسوس ہوا جیسے اسری کو اس کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو خود ہی سب کچھ کر لیتی تھی۔ اس لیے اس نے سوچا کہ وہ گھر چلا ہی جائے۔ یہ سوچ کر وہ اسری کے کمرے میں آیا تو وہ اپنے گرد کپڑے پھیلانے دیکھ رہی تھی۔ خوبصورت جھلملاتے کپڑے، صالحہ بیگم پاس ہی بیٹھی تھیں اور وہ انہیں ایک ایک سوٹ ڈبوں سے نکال کر دکھا رہی تھی۔

”امی، یہ دیکھیں۔ یہ کام کتنا خوبصورت ہے۔ پتا ہے، کتنی دکانوں کا چکر لگایا۔ تب کہیں

جا کر یہ کام مجھے پسند آیا۔“

”ارے ناسک، آ جاؤ نا، وہاں کیوں کھڑے ہو گئے ہو.....“ اسری نے اسے دیکھ لیا۔

”یہ آپا کے کام والے کپڑے ابھی لے کر آئی ہوں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا نیلا دوپٹہ جس پر کمیش کا کام کیا ہوا تھا، پھیلا کر صالحہ بیگم کو دکھایا۔

”یہ دیکھیں۔“ اس نے دوپٹہ سر پر لیا۔ ناسک کی نگاہیں بے اختیار اس کے چہرے پر

ٹھہری گئیں۔ نیلے دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ کیسا روشن روشن لگ رہا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے

دیکھے جا رہا تھا۔

گلابی رنگ میں کتنی چمک تھی۔

لابنی پلکوں والی خوبصورت آنکھیں۔

’یہ اسرئی کس قدر دلکش، کس قدر خوبصورت ہے۔‘ اسے کبھی احساس بھی نہ ہوا تھا۔ اونچی سی پونی باندھے جو گرز اور سادہ سے ڈھیلے ڈھالے سوتی کپڑوں میں ملبوس رہنے والی اسرئی کو شاید اس نے کبھی اتنے دھیان سے دیکھا ہی نہ تھا جتنے دھیان سے وہ آج دیکھ رہا تھا۔ اسرئی کو اپنے چہرے پر اس کی آنکھوں کی تپش محسوس ہوئی تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس کا دل اچانک زور سے دھڑک اٹھا اور اس کے رخسار تپ اٹھے۔ اس نے دوپٹہ اتار کر تہہ کرتے ہوئے آنکھیں سے کہا۔

”اندر آ جاؤ ناسک۔“

وہ بھی چونک کر اندر چلا آیا۔

”بیٹھو۔“ صالحہ خاتون نے اپنے پاس ہی اس کے لیے جگہ بنائی۔

”ابو کا فون آیا تھا آج پھر۔“ اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیا کہہ رہے تھے؟“ اسرئی نے کپڑے تہہ کر کے ڈبوں میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”بلا رہے ہیں۔“

”تو چلے جاؤ۔ بہت دن بھی ہو گئے، نا تمہیں گئے ہوئے۔“

”میں تمہارے خیال سے رک گیا تھا اسرئی کہ تمہیں مدد کی ضرورت ہوگی۔ بابا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہی اور بڑی آپا کی شادی کے وقت تو ظفر بھائی وغیرہ کافی پہلے آ گئے تھے لیکن اس بار شاید انہیں چھٹی نہ مل سکے۔“

”اوہو۔ ڈونٹ وری ناسک۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں سب کر لوں گی۔ ضرور کوئی بات

ہوگی جو وہ بار بار تمہیں بلا رہے ہیں لیکن دیکھو، چار پانچ دن پہلے ضرور آ جانا۔“

”اچھا۔“

اور ناسک چلا گیا۔ مگر اسرئی کو یوں لگا، جیسے کہیں کچھ کھو گیا ہے، کوئی کمی ہو گئی ہے۔ اس

کا کمرہ خالی تھا۔ وہ اپنا سارا سامان لے گیا تھا۔ وہ پڑھنے کے لیے آیا تھا اور اسے بہر حال جانا ہی تھا۔ وہ کوئی کام لے کر بیٹھتی تو اسے یاد ہی نہ رہتا کہ وہ کیا کرنے لگی تھی۔

صالحہ خاتون نے کئی بار اسے ٹوکا تو ایک روز اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ وہ تو ناسک

کی محبت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ جانے کب، جانے کس وقت وہ اس کے دل میں اتر آیا تھا۔ کئی دن تک تو وہ اس انکشاف سے بوکھلائی بوکھلائی رہی پھر نارمل ہو گئی۔

”یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔“ اس نے خود کو سمجھایا..... ”رفاقتیں ہی محبتوں کو جنم دیتی

ہیں۔“

اور ناسک بھی یقیناً اس سے محبت کرتا ہے اور بار بار اس نے اعتراف بھی کیا تھا کہ وہ دنیا میں جس ہستی سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے وہ اسرئی ہے۔ کیونکہ یہ اسرئی ہی تھی جس نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا تھا، جس نے اس کے دل میں چھپے درد اور محرومی کے سارے کانٹے اپنی انگلیوں سے چن لیے تھے۔

وہ بہت مطمئن سی ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی اور پھر شادی سے چند دن پہلے وہ آ گیا اور پھر اسرئی نے محسوس کیا جیسے ہر لمحہ اس کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ اس بار اس نے اسرئی کو سراہا بھی۔ تعریف کی بھی۔ مہندی والے دن اس نے گرین اور شاکلنگ پنک سوٹ پہنا تھا۔

”تم اس وقت اس رنگ میں بہت پیاری لگ رہی ہو اسرئی۔“

”تھینک یو۔“ وہ مسکرا دی۔

”تم بھی اچھے لگ رہے ہو۔“

”سچ۔“

”ہوں۔“ وہ ہنس دی۔

”تو پھر میرا خیال ہے، مجھے اندر پریوں کے جھرمٹ میں جانا چاہیے۔ کیا خبر۔“ اب اس میں مزاح کی حس بھی پیدا ہو گئی تھی۔

سب کزنز میں بیٹھ کر بات کرتا ہوا وہ اسرئی کو بہت اچھا لگا تھا۔ بہت اپنا اپنا سا اور اس کے اندر فخر سا اتر آیا۔ یہ وہی تو تھی جس نے اس کی شخصیت کے نکھار میں حصہ لیا تھا۔ وہ ایک دم ہی سب میں بہت پاپولر ہو گیا تھا۔

چھوٹی آپا رخصت ہو گئیں۔ گھر میں ایک دم ویرانی سی چھا گئی تھیں ناسک بھی چلا گیا تھا۔ مگر تقریباً ہر روز اسے فون کرتا۔ اور ہفتے میں ایک روز ضرور خط لکھتا جس میں پوری پوری تفصیل ہوتی وہ اس کے خط کو بار بار پڑھتی۔ خط میں جتنا وہ اپنا ذکر کرتا، اتنا ہی اس کا بھی ذکر ہوتا۔ کوئی نہ کوئی پرانی بات۔ ”پتا ہے اسرئی، مجھے وہ دن بہت یاد آ رہا ہے جس روز یونیورسٹی میں اچانک ہنگامہ ہو گیا تھا۔ اور تم سیدھی مجھے ڈھونڈتی ہوئی لائبریری میں آئی تھیں۔ حالانکہ مجھے تمہارے پاس آنا چاہیے تھا۔ اور میں دل ہی دل میں بڑا شرمندہ ہوا تھا لیکن پھر میں نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں پڑ سکتی تھی۔ تم تو خود بہت بہادر ہو۔ بلکہ میں تو خود تمہارا، سہارا ڈھونڈتا رہتا تھا۔“

اور یوں ہی وہ ایسے ہی کسی ماضی کے واقعے کا حوالہ ضرور دیتا۔

کبھی بے وقت اچانک اس کا فون آ جاتا۔

”اسرئی، سنو۔ ابو کہہ رہے ہیں کہ میں۔ ان کے ساتھ کام کروں۔ لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔ میری خواہش ہے کہ میں الگ کہیں کسی اور جگہ جاؤں۔“

”ٹھیک ہے، زلزل آجائے تو تم اپلائی کر دینا۔ لاثانی والوں کو ایک منیجر کی ضرورت ہے۔ سختی اور ذہین..... میں بابا سے کہہ دوں گی، وہ تمہارا ذکر کر دیں گے۔“

”اچھا۔“ وہ مطمئن ہو جاتا۔

اور کبھی رات کو بارہ یا ایک بجے اسے یاد آتا:

”سنو اسرئی۔ آج کل می جھ پر بڑی مہربان ہو رہی ہیں۔ صبح انہوں نے اپنے ہاتھ سے میرے لیے پراٹھے بنائے اور مجھے کہہ رہی تھیں۔ ”ناسک بیٹا، تم کمزور ہو رہے ہو، اپنا خیال رکھا کرو جان۔“

”پھر تو مبارک ہو۔“ وہ کہتی۔

”دراصل اسرئی۔ یہ سب تمہارا کمال ہے.....“ وہ اعتراف کرتا۔ جو تم نہ ہوتیں تو زندگی میں کہیں بھی کوئی خوشی نہ ہوتی نہ پھول کھلتے نہ رنگ ہوتے۔“

”شاعر ہو گئے ہو۔“ وہ ہنستی۔

”ہاں تم نے شاعر بنا دیا ہے۔“

ایک روز رات ایک بجے اس کا فون آ گیا۔

”کیا مصیبت ہے ناسک، ابھی تھوڑی دیر پہلے سوئی تھی، اس نے مصنوعی غصے سے کہا۔

”سوری اسرئی، رات گیارہ بجے ابو نے مجھ سے ایک بات کہی اور دو گھنٹے سے میں اس بات کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھ سے ہضم نہیں ہو رہی ہے فرینڈ۔“

”اچھا کیا بات ہے۔ میں ہمدن گوش ہوں۔“

”ابو نے مجھ سے تمہارے بارے میں رائے لی۔“

”پھر؟“ وہ غالباً نیند میں تھی۔

”ابو نے پوچھا۔ ”اسرئی کیسی ہے؟“

”میں نے کہا۔ ”بہت اچھی، بہت مہربان، بہت شفیق اور یہ جو میں آج ہوں نا، یہ سب اسی کی وجہ سے ہوں۔“

”مگر ماموں نے یہ کیوں پوچھا؟“

”اس لیے کہ وہ تمہیں میرے لیے مانگنا چاہتے ہیں۔“

”پھر تم نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا سوچ کر جواب دوں گا۔ اسرئی، مجھے بتاؤ میں ابو سے کیا کہوں۔“

”میں بتاؤں؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں تم۔“ وہ شرارت سے کہہ رہا تھا یا سنجیدگی سے، یہ اسرئی کی سمجھ میں نہ آیا۔

”آخر تم نے زندگی کے ہر معاملے میں مجھے مشورہ دیا ہے اور تقریباً اڑھائی سال سے میں نے صرف وہی کیا ہے جو تم نے کہا ہے۔ تم میری دوست ہو نا اور میرے چھوٹے چھوٹے مسائل کو تم نے حل کیا ہے تو کیا تم زندگی کے اس اہم معاملے میں مجھے مشورہ نہ دو گی۔“

”مگر ناسک۔“ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

”پلیز اسرئی۔“ ناسک نے التجا کی۔ ”اپنی ذات کو الگ کر کے مجھے مشورہ دو کہ میں اور اسرئی اچھے لائف پارٹنر بن سکتے ہیں۔“

”ہوں۔“ بہت دیر بعد اس نے بوجھل آواز میں کہا۔

”یقیناً تم دونوں کی لائف مثالی ہو گی۔ تم کبھی پچھتاؤ گے نہیں ناسک..... لیکن کوئی خواہ کتنا بھی اچھا ہو۔ اصل بات تو دل کی ہوتی ہے۔ تمہارا دل جو کہتا ہے، تم وہی کرو۔ تم ماموں سے وقت لے لو۔ اور اچھی طرح سوچ لو جب مطمئن ہو جاؤ تو۔“

اور اسرئی کو یقین تھا کہ ناسک کا فیصلہ کیا ہو گا اسی لیے تو بیٹھے بیٹھے کام کرتے کرتے اس کا دل یک دم دھڑک اٹھا جو شخص اس کے دل میں اچانک اتر آیا تھا، اس تک پہنچنے کے لیے، اسے پانے کے لیے راستے خود بخود ہی آسان ہو گئے تھے۔

”میں ناسک کو بتاؤں گی کہ میں نے اسے کتنا..... کتنا بے حساب چاہا ہے اور کیسے ایک روز اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ جانے کب میرے دل میں چپکے سے اتر آیا تھا اور لہو کے ساتھ میری رگوں میں شامل ہو گیا تھا۔“

پھر بہت سارے دن گزر گئے۔ معمول کے مطابق ایک بار وہ ضرور فون کرتا۔ ہفتے میں ایک خط بھی لکھتا۔ لیکن اس بات کا اس نے پھر کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہی اپنی باتیں، ماضی کا ذکر۔ اس نے غیر ملکی کمپنی میں جاب کر لی تھی اور بہت خوش تھا۔

ایک رات پھر ایک بجے تیل ہوئی۔ دوسری طرف ناسک تھا۔ بے وقت فون وہ تب ہی کرتا تھا، جب کوئی خاص بات ہوتی تھی۔ اسرئی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ شاید ناسک نے ماموں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر لیا ہے۔ تب ہی اس وقت.....

”خیریت!“

”ہاں بھئی، خیریت ہے۔ یوں ہی دل چاہ رہا تھا بات کرنے کو حالانکہ آج کی حاضری

اور پھر ظفر بھائی کی شادی سے ایک ہفتہ پہلے وہ راولپنڈی پہنچ گئی۔ بابا اور اماں نے دو دن پہلے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہاں سب نے گرجوٹی سے اس کا استقبال کیا۔ اور ناسک تو بے حد خوش تھا۔ خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

”پتا ہے، چھوٹے ماموں ناسک سے تمہارا رشتہ کرنا چاہ رہے ہیں۔“ تنہائی ملتے ہی چھوٹی آپا نے بتایا ”لیکن ممانی کی خواہش اپنی بھانجی کے ساتھ ہے۔“ اس کے چہرے پر رنگ سے اتر آئے تھے۔

”فیصلہ ناسک پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور میرا خیال تمہارے حق میں ہی فیصلہ کرے گا۔ ظاہر ہے، وہ تمہارے ساتھ اٹیچڈ ہے اور پھر یہاں بھی اکثر وہ بر ملا تمہاری تعریف کرتا ہے۔“ اس کی لانی پلکیں جھک گئیں اور چہرے کے رنگ اور گہرے ہو گئے۔ چھوٹی آپا نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔

”تمہارا اور ناسک کا جوڑا خوب بچے گا اور وہ روزی تو بس معمولی سی شکل و صورت کی ہے۔“

اور واقعی چھوٹی آپا نے صحیح کہا تھا۔

وہ چھوٹے قد اور سانولے رنگ کی عام سے نقش و نگار والی لڑکی تھی۔ البتہ اس نے خود کو سنوارنے کی بہت کوشش کی تھی۔ بال خوبصورت اسٹائل میں کٹے ہوئے تھے۔ آنکھوں کو کاجل سے حسین بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میک اپ نے اسے قدرے بہتر بنا دیا تھا۔

”یہ روزی ہے۔“ شام کو چائے پر ناسک نے اس کا تعارف کروایا۔

”اور یہ اسرئی ہے۔ لیکن تمہاری طرح ڈرپوک اور بزدل نہیں۔“

”ہم تو بس بزدل ہی اچھے ہیں۔“ اس نے اٹھلا کر کہا۔

اسرئی کو وہ کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی تھی..... اس میں مصنوعی پن اور بناوٹ زیادہ تھی۔ اور باتوں میں عامیانہ پن تھا۔ پھر ہر وقت میک اپ کیے رکھتی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں، ناسک اسے بہت اہمیت دیتا تھا۔ اور ناسک کے سامنے وہ نخرے بھی بہت دکھاتی تھی اور ناسک اس کی مدد کرنے کو بے چین سا ہو جاتا۔

اس شام ظفر بھائی کی مہندی لے کر انہیں لڑکی والوں کی طرف جانا تھا۔ صبح سے ہی سب لڑکیاں اپنی اپنی تیاریوں میں مشغول تھیں۔

اس نے اپنے کپڑے پرہیں کیے اور سوچا، ناسک کے کمرے میں لٹکا دے۔ ادھر تو بے حد رش تھا۔ کل شام بھی اس نے اپنے کپڑے استری کر کے سعدیہ آپا کے وارڈ روب میں لٹکائے

لگوا چکا تھا۔“

”اچھا کوئی خاص بات ہے۔“

”نہیں، بس یونہی۔ پتا ہے، آج بڑا مزہ آیا۔ وہ روزی ہے نا، میری خالہ کی بیٹی۔ آج کل کراچی سے آئی ہوئی ہے۔ تو بے اس قدر بے وقوف اور بزدل لڑکی ہے وہ۔ آج می کے کہنے پر میں اسے اسلام آباد کی سیر کرانے لے جا رہا تھا..... ہم باہر نکلے تو جانے کیسے وہ سامنے بٹ صاحب ہیں نا، نیلی کٹھی والے ان کا کتا ایک دم اچھل کر ہماری طرف چھپتا اور روزی چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اور پتا ہے، بعد میں بھی اس کی کچکی ایک گھنٹے تک ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسے صاف صاف تمہارے متعلق بتایا کہ اگر تم ہوتیں تو کتے کو بھگا دیتیں۔“

”اچھا!“ اسے مایوسی ہوئی مگر اس نے ظاہر نہیں کیا۔ اور ناسک نے ادھر ادھر کی چند باتیں کر کے فون بند کر دیا۔

پھر اکثر وہ روزی کا ذکر کرنے لگا ”بچی اسرئی، اتنی بزدل ہے، وہ اتنا چھوٹا سادل ہے اس کا۔ اس روز چاقو سے ذرا سی انگلی کٹ گئی تو رو رو کر برا حال کر دیا۔ کتنی دیر تک وہ تسلی دیتا رہا لیکن اس کے آنسو ہی نہیں رکتے تھے۔“

اور یوں ہی ایسی ہی باتیں ہوتی تھیں۔ پندرہ منٹ کی گفتگو میں بارہ منٹ تو وہ روزی کی باتیں کرتا رہتا اور تین صفحات کے خط میں دو صفحے روزی کے متعلق ہوتے۔

”روزی بہت خوبصورت ہے کیا؟“ ایک روز یونہی اس سے پوچھ لیا۔

”تمہارے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ ناسک نے سچائی سے بتایا۔ ”عام سی ہے، جیسی سب لڑکیاں ہوتی ہیں۔“

”اچھا!“ اس کے اندر اطمینان سا اتر آیا۔

”ظفر بھائی کی شادی ہے۔ اسرئی تم دس پندرہ دن پہلے آنا۔“ ناسک نے اصرار سے کہا۔ ”بچی تمہارے بغیر بہت ادا اس ہو گیا ہوں۔ اگر جاب کا پرائلیم نہ ہوتا تو اب تک دو چکر لگا چکا ہوتا۔“

”اچھا کوشش کرو گی۔“ وہ خود بھی تو اس کے لیے اداس ہو رہی تھی۔ دو سال مسلسل دن رات ساتھ رہا تھا۔ صبح اکٹھے یونیورسٹی جانا، اکٹھے ناشتا کرنا اور پھر دن کے بیشتر حصے میں اکٹھا رہنا۔

”کوشش نہیں اسرئی، وعدہ۔“

اس نے اصرار کیا تو اسے وعدہ کرنا ہی پڑا۔

تھے اور شام جب وہ تیار ہونے کے لیے ادھر گئی تو اس میں ڈھیروں کپڑے لٹکے تھے مگر اس کے کپڑوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کافی تلاش کے بعد وہ سعدیہ کے بیڈ پر اس حالت میں پڑے ملے کہ انہیں اس حالت میں پہننا ممکن نہ تھا، چنانچہ اسے دوبارہ استری کرنے پڑے اور لڑکے شور مچاتے رہے کہ وہ تیار ہونے میں دیر لگا رہی ہیں۔

صبح ناسک نے ہی چھتر کا پروگرام بنایا تھا۔ اور آج تو مہندی کا دن تھا۔ مہمانوں کا رش بھی زیادہ تھا۔ ناسک کا کمرہ سب سے الگ تھا۔ چھوٹے ماموں کے حصے میں اوپر والی منزل آئی تھی۔ اس نے سوچا، وہ وہاں آرام سے تیار ہو سکے گی۔ الچیڈ باتھ، ڈریسنگ، ساری سہولتیں تھیں وہاں۔

سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ کمرے کے سامنے پہنچی تو اندر سے ظفر بھائی کی آواز آئی۔
”یار، تم فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے۔ چچا جان کا خیال ہے کہ آج کل سب اکٹھے ہیں تمہاری منگنی بھی کر دی جائے۔“
وہ غیر ارادی طور پر رک گئی۔

”فیصلہ تو کر لیا ہے۔“ ناسک نے اطمینان سے کہا۔ ”آپ ابو کو سمجھا دیجئے گا کہ میرے خیال میں روزی میرے لیے مناسب رہے گی۔“
”نہیں۔“ ظفر بھائی کے لہجے میں حیرت تھی اور اسری ایک دم ساکت کھڑی رہ گئی۔
”ہمارا خیال تو تھا کہ تم اسری میں انٹرنلڈ ہو اور اسری روزی کے مقابلے میں بہت اچھی ہے۔ اور تمہاری اس سے انٹرنیشنلنگ بھی ہے۔“

”مجھے پتا ہے، وہ بہت اچھی ہے۔“
”پھر تم نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟“
ظفر بھائی کے لہجے میں ابھی تک حیرت چھپی تھی۔

”اسری بہت اچھی ہے۔ میری بہت اچھی دوست ہے۔ اور ہمارے درمیان انٹرنیشنلنگ بھی بہت ہے۔ پھر بھی ایز اے وائف وہ مجھے سوٹ نہیں کرتی۔“
”کیوں؟“ ظفر بھائی نے پوچھا ”اس میں اتنی بے شمار خوبیاں ہیں اور میرے خیال میں وہ خاندان کی سب سے خوبصورت اور اچھی لڑکی ہے۔ محبت کرنے والی۔ یار، تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لو۔“

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے ظفر بھائی۔“ ناسک نے سنجیدگی سے کہا۔
”وہ اچھی دوست ہے اور رہے گی لیکن وہ میرے آئیڈیل پر پوری نہیں اترتی۔“

”مگر کیوں ناسک کیوں؟“

ظفر بھائی پھر پوچھ رہے تھے اور باہر دیوار پر ایک ہاتھ رکھے اسری ساکت کھڑی تھی۔
”پتا نہیں ظفر بھائی، شاید میں صحیح طور سے اپنے احساسات کو Explain نہ کر سکوں لیکن ظفر بھائی، اس میں اسری میں ایک محبوبہ والی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ تو سراپا شفقت ہے۔ اس کی گود میں سر رکھ کر اپنے دکھ کہنے کو دل چاہتا ہے لیکن اس میں محبوبانہ ادائیں نہیں ہیں۔ وہ زندگی کی ہر مشکل کو فیس کر سکتی ہے۔ بے حد اعتماد ہے اس میں۔ وہ کام جو میں کرتے ہوئے جھجکتا ہوں، وہ بڑے آرام سے کر لیتی ہے۔ مرد تو بیوی کا محافظ ہوتا ہے لیکن وہ تو میری محافظ ہے۔ بہت زیادہ حوصلہ، بہت جرأت ہے اس میں۔ پتا ہے، ظفر بھائی، ایک بار وہاں لاہور میں ڈرائیور کے بیٹے نے جانے کیسے آگ لگائی خود میں۔ سب لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ چوکیدار، مالی اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ جلتی ہوئی کوٹھری سے اس ننھے بچے کو نکالے لیکن یہ اسری جو ہے نا، اس نے اسے وہاں سے نکالا۔ اس کوٹھری سے جہاں لکڑیوں کا برادہ بھرا تھا اور اس میں بیٹھ کر اس بچے نے بورے کو آگ لگائی اور ساتھ ہی خود بھی جل گیا۔ میں بھی تھا وہاں لیکن مجھے ہمت نہیں ہوئی تھی۔ بچے کی ماں چیخ رہی تھی۔ پھر اسری آگئی وہاں اور اس نے اسے وہاں سے نکالا اس کے اپنے ہاتھ جل گئے تھے اور میں اسے Appreciate کرتا ہوں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے چھوٹی موٹی سی لڑکیاں پسند ہیں۔ ڈری ڈری، سبھی سبھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر شوہر کا سہارا ڈھونڈنے والی، روزی جیسی نسوانیت تو اسی میں ہے نا ظفر بھائی۔“

پتا نہیں، وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اسری کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ پتا نہیں کیسے وہ وہاں سے نیچے آئی تھی۔ اور کیسے چھوٹی آپا کے کمرے تک پہنچی تھی۔ وہلیز پر ہاتھ رکھ کر اس نے ذرا کی ذرا چھوٹی آپا کی طرف دیکھا جو بیگنر میں جنید کے کپڑے لٹکا رہی تھیں۔
”چھوٹی آپا۔“ بمشکل اس کے ہونٹوں سے نکلا تھا اور پھر وہ وہیں لڑکھڑا کر گر گئی تھی۔
جانے کتنی دیر وہ بے ہوش رہی تھی۔ جب ہوش آیا تھا تو سب اس کے کمرے میں اکٹھے تھے اور چھوٹی آپا کے آنسو اس کے رخساروں پر گر رہے تھے۔

”کیا ہوا تھا اسری؟“ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر کئی آوازیں ایک ساتھ آئی تھیں۔
”پتا نہیں۔“ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

”لیٹی رو ہو۔ لیٹی رہو۔“ چھوٹی آپا نے اسے کہا۔

”نمالا گرمی سے دل گھبرا گیا تھا۔“ سب کا خیال تھا۔

”شاید۔“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

لیکن تم آتے ہی بستر پر پڑ گئیں۔ تم تو اتنی بہادر، اتنی مضبوط لڑکی ہو۔ مار بھگاؤ اس بیماری اور کمزوری کو۔“ ناسک کو اس کے یوں پڑے رہنے سے الجھن ہو رہی تھی۔

رات کو ظفر کا ولیہ تھا اور اس نے بابا سے کہہ دیا تھا کہ صبح ہی واپس چلے جائیں گے۔ اور اس وقت ناسک اس کے پاس بیٹھا الجھ رہا تھا۔

”تم دو چار دن اور نہیں رک سکتیں؟“

”بہت رہ لی ناسک لیکن شاید اب کے یہاں کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آئی۔“

”میری خواہش تھی، اسرئی کہ تم میری مفتی تک تو کم از کم رک جاتیں۔ تم میری بہت اچھی دوست ہو اور مجھے شاید اس کائنات میں سب سے زیادہ عزیز ہو۔“

”تمہاری مفتی ہو رہی ہے، مبارک ہو کب؟“ اسرئی نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم بیمار پڑ گئی تھیں ناس لیے تم سے ذکر نہیں کر سکا۔ وہ روزی ہے نا، میں نے اس کے حق میں فیصلہ کیا ہے..... سوری اسرئی، اس رات میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ابو نے مجھ سے تمہارے متعلق رائے پوچھی تھی۔ تو جو رائے اس وقت میں نے ابو کو دی تھی، وہی آج بھی ہے۔ لیکن یہ دل کے معاملے ہوتے ہیں نا اسرئی اور تم نے کہا تھا کہ میں سوچ لوں اور میری سوچ تم تک ہی آ کر ٹھہر جاتی تھی۔ شاید میرے مقابل اور کوئی نہیں تھا لیکن پھر روزی آ گئی اور میں نے کہا کہ میں روزی کے متعلق بھی سوچوں۔ اور جب میں نے تمہارا اور روزی کا مقابلہ کیا اسرئی تو میرے دل نے کہا کہ روزی میرے لیے موزوں شریک حیات ثابت ہوگی۔ شاید میرے لاشعور میں کسی ایسی ہی لائف پارٹنر کی شبیہ تھی۔ ایسی بیوی جو میری محتاج ہو۔ ایسی بیوی جس کا میں محتاج نہ ہوں۔ پتا نہیں کیوں اسرئی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے میں ہمیشہ تمہارا محتاج رہوں گا۔ تمہارے سہارے کا۔ تم میری زندگی میں شامل ہو گئیں تو.....“

”میں نے تم سے کوئی شکایت یا گلہ تو نہیں کیا ناسک۔ اسرئی نے اس کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں۔ تم بتاؤ مفتی کب ہے؟“

”ہاں، مجھے پتا ہے اسرئی تم بہت گریٹ ہو۔“ وہ ایک دم خوش دکھائی دینے لگا تھا۔

”روزی اچھی ہے نا، تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ دل کے معاملے ہوتے ہیں۔ تمہیں اچھی لگتی ہے تو بس

اچھی ہے۔“

”تم رکو گی نا۔“

”کوشش کروں گی۔“

اور ناسک نے سب کو باہر جانے کے لیے کہا۔

”پلیز، اسے سکون کی اور آرام کی ضرورت ہے۔ کچھ دیر سو لے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔“

سب لوگ ایک ایک کر کے باہر چلے گئے لیکن ناسک وہیں بیٹھا رہا۔

”دراصل اوور ورک نے تمہیں تھکا دیا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں اسرئی کے لیے بے پناہ خلوص اور محبت تھی۔

اسرئی نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس وقت کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے اندر عجیب سی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ ناسک نے اس کی دوستی، اس کی محبت، اس کے خلوص کسی کی قدر نہ کی تھی اور اس پر روزی کو ترجیح دی تھیں اس لیے کہ وہ بہت بولندہ تھی۔ بہت خود اعتماد تھی۔ اور اس کے دل میں بے حساب محبت تھی۔ سب کے لیے..... ناسک کے لیے..... اور وہ کہہ رہا تھا۔

اس کے اندر مانتا ہے، مجبوریت نہیں۔

”تم نے دیکھا تو ہوتا۔“

”کبھی اس طرح محبت کا اظہار کیا تو ہوتا۔“

”پھر دیکھتے کہ.....“

اور ناسک اسے سوتا سمجھ کر باہر چلا گیا..... اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ بہت دیر تک رونے کے بعد اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ کیا مجھ میں نسوانیت نہیں؟

وہ تو بہت نازک بہت دلکش تھی۔

کیا اس کی بولندہ، اس کی خود اعتمادی اس کا جرم بن گئی تھی۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس سے غلطی کہاں ہوئی ہے۔

اگلے دو تین دن وہ جھوٹی آپا کے کمرے سے نہ نکلی۔ صالحہ خاتون اور بابا بھی آگئے تھے۔ بابا اسے یوں بستر پر لیٹے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ اس نے چاہا بھی کہ وہ بابا کی خاطر امی کی خاطر بستر سے اٹھ کر شادی کے ہنگاموں میں حصہ لے لیکن لگتا تھا، جیسے اس کی ساری توانائیاں کسی نے ختم کر دی ہیں۔ جنید بھائی نے ڈھیر سارے ٹاک اسے لکھ کر دیئے تھے۔ ناسک دن کا بیشتر حصہ اس کے پاس گزارتا۔ ادھر ادھر کے ہزاروں قصے اور ہر دس منٹ بعد روزی کا ذکر۔ وہ ہوں ہاں کر دیتی۔ اس کا دل چاہتا، وہ اسے منع کر دے۔ اپنے پاس سے ہٹا دے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے اسرئی تمہیں؟ میں نے تو سوچا تھا، تم آؤ گی تو خوب انجوائے کریں گے

کے پورشن کی طرف گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو۔
اور بابا سے چھپ کر صالحہ خاتون اور چھوٹی آپا اس کے لیے تعویذ اور دم درود کروانے لگیں۔ وہ بے بسی سے انہیں دیکھتی۔

”اماں، آپ کو پتا نہیں، میرے ساتھ کیا ہوا ہے..... کسی نے میرا دل نوج کر پھینک دیا ہے۔ بہت بلندی سے گری ہوں اور کچی کچی ہو گئی ہوں۔“ وہ دل ہی دل میں کہتی۔
”بیٹی کی شادی کر دو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ بڑے مولوی صاحب نے مشورہ دیا تو صالحہ خاتون شوہر کے پیچھے پڑ گئیں، اسرئی کی شادی کر دیں۔

وہ اداس رہتی ہے، چپ رہتی ہے۔

”مگر.....“ بابا تو اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجنا چاہتے تھے.....

”مگر کیا، لڑکی ذات ہے، اسے لڑکی ہی رہنے دو۔ بیٹا ہمارے نصیب میں نہیں تھا۔“

”میرا خیال ہے، میں کسی اچھے ڈاکٹر.....“

”ڈاکٹروں کو چھوڑو۔ اور ملنے جلنے والوں سے بات کرو۔“

صالحہ خاتون جس بات کے پیچھے پڑ جاتی تھیں، اسے کر کے ہی دم لیتی تھیں۔ اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ انہی دنوں بابا کے ایک عزیز ترین دوست نے اپنے بیٹے عارف کے لیے اسرئی کو مانگ لیا۔

عارف ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ با اخلاق، وجہہ، اعلیٰ خاندان اچھی پوسٹ پر فائز۔ اکلوتا بیٹا، والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ساس مندوں کا بھگڑا نہ تھا۔ ایک بے چارے سرسختے صالحہ خاتون کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اسی وقت قدر صاحب کا منہ میٹھا کروا کے بھیجتیں۔

”سوچ کر جواب دیں گے۔“

بابا نے کہا تو قدر صاحب کے جانے کے بعد اماں ان سے الجھ پڑیں۔

”بھلا سوچنے کی کیا بات تھی۔ لڑکا خاندان سب دیکھے بھالے۔“

”اسرئی کی رائے بھی ضروری ہے۔“ بابا نے حتیٰ لچھے میں کہا۔

”جو آپ کی مرضی بابا۔“ اسرئی کی مرضی معلوم کی گئی تو اس نے جواب دیا۔

اسرئی کے اندر جیسے ہر امنگ مر گئی تھی۔ وہ کون تھا۔ کیسا تھا۔ کیا تھا۔ اس نے کچھ بھی جاننے کی کوشش نہ کی۔ اور عارف کے سنگ بیاہ کر اس کے گھر میں آ گئی۔

عارف بہت اچھا تھا۔ بہت چاہنے والا۔ اس نے اسے ٹوٹ کر چاہا۔ ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھا۔ اسے سر درد بھی ہوتا تو پریشان ہو جاتا۔ چھ ماہ پلک جھپکتے میں گزر گئے تھے۔

اس نے وعدہ کیا لیکن وہ رکی نہیں۔ اسے لگتا تھا، جیسے کچھ دن اور وہ یہاں رہ گئی تو اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ جو کچھ اس پر گزر رہی تھی، وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔
محبتوں کے لئے کا دکھ۔

ناسک کو کھودینے کا دکھ۔

اور سب سے بڑھ کر یہ دکھ کہ ناسک کو اس کی خود اعتمادی پسند نہ تھی۔ ناسک کو اس کی مضبوطی سے الجھن ہوتی تھی۔ اسے تو چھوٹی موٹی سی کمزور لڑکیاں پسند تھیں۔

ناسک اس سے محبت کرتا تھا۔

ساری کائنات میں سب سے زیادہ عزیز جانتا تھا۔

لیکن اس کی شادی نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ وہ.....

اور وہ بدلتی چلی گئی۔ بابا آفس جانے کو کہتے لیکن وہ ٹال دیتی۔ صالحہ خاتون بیمار پڑتیں تو وہ چپ چاپ دیکھتی رہتی کہ بابا آئیں اور انہیں اسپتال لے جائیں۔

”اسرئی بیٹے، تم لے جاتیں امی کو۔“ بابا کہتے۔

”بابا، مجھے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“

”مگر کیوں بیٹا، پہلے تو تم.....“

”پتا نہیں بابا۔“ وہ رونے لگتی اور روئے چلی جاتی۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھتی رہتی۔

”کیا مر دیمیری ایسی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے؟“

”اور بابا مجھے کتنا Appreciate کرتے ہیں۔ کتنا فخر کرتے ہیں مجھ پر۔“

”مگر وہ ناسک.....“

اس نے آفس جانا چھوڑ دیا اور آفس کے معاملات میں دلچسپی لیتا بالکل بند کر دیا۔ ہر وقت گھر میں پڑی رہتی۔

”اے ہے ظفر کی شادی میں کسی نے کچھ کرا دیا ہے میری بچی کو۔“ صالحہ خاتون نے چھوٹی آپا سے کہا۔

”نہیں امی، بھلا کسی نے کیا کرنا ہے۔“

”تمہاری چھوٹی ممانی کو تو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ بھائی جو اسے بہو بنانا چاہتے تھے اور وہ اپنی بھانجی کو لانا چاہتی تھیں۔“

”ہاں، شاید۔“ چھوٹی آپا کو بھی شک گزرا۔ اچھی بھلی ہنستی مسکراتی وہ چھوٹے ماموں

اپنی محبت کے پھڑ جانے کا دکھ عارف کی بے تحاشا محبت نے ماند کر دیا تھا لیکن روکیے جانے کا درد اسی طرح تازہ تھا۔ اس زخم سے تو یونہی خون رستا رہتا تھا۔

عارف دفتر میں تھا، اس کے ڈیڈی کا بی بی ہائی ہو گیا، گھر میں ایک گاڑی موجود تھی لیکن ڈرائیور نہیں تھا۔ ڈیڈی بہت تکلیف میں تھے۔ کئی بار اس نے دفتر فون کیا۔ عارف سیٹ پر نہ تھے۔ ڈیڈی کی حالت دیکھتی تو قدم پورج کی طرف اٹھتے۔

وہ ڈیڈی کو اسپتال لے جائے لیکن پھر جیسے ناسک اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتا تو وہ ٹھٹھک کر رک جاتی۔

”نہیں۔ کیا خبر عارف کو یہ بات اچھی نہ لگے۔ اور وہ..... وہ بھی مجھے رد کر دے.....“

نہیں، اب وہ ناسک کے بعد عارف کی محبت کھونا نہیں چاہتی۔
وہ دوبارہ آکر فون کرنے لگتی۔ خدا خدا کر کے عارف ملا تو اس نے ڈیڈی کا بتایا اور جب وہ ڈیڈی کو گاڑی میں بٹھا رہا تھا تو اس نے تاسف سے کہا۔

”اگر تم ڈرائیور کر سکتیں تو اس وقت ڈیڈی اسپتال پہنچ چکے ہوتے۔ ایسا کرو اسری، تم بھی ڈرائیونگ سیکھ لو۔ کبھی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔“

اور ایسے ہی بے شمار مواقع ان چھ سالوں میں آئے تھے، جب اسے اپنے اوپر جبر کرنا پڑا تھا۔ جب مانی سیڑھیوں سے گر پڑا تھا، جب شانی کو موٹن آرہے تھے اور اس کا پانی بالکل ختم ہو گیا تھا۔ جب عارف کا ایکسڈنٹ ہوا تھا۔ ہر بار اس کا جی چاہا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کرے لیکن ہر بار ایک انجانے خوف نے اس کے قدموں کو زنجیر کر دیا تھا۔
”نہیں۔ مرد ایسی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے۔“

’اتنی بولڈ اور خود اعتماد۔‘

’نہیں تو ڈری سہمی، چھوٹی موٹی سی، ذرا ذرا سی بات پر مرد کا سہارا ڈھونڈنے والی لڑکیاں پسند ہوتی ہیں۔‘

اور مانی کا خون زیادہ بہہ گیا۔ بروقت ٹانگے نہ لگنے سے زخم کا نشان اس کے ماتھے پر رہ گیا تھا۔

شانی کی زندگی کے لالے پڑ گئے۔

مگر۔

اور آج ابھی ابھی عارف کیا کہہ کر گیا تھا۔

شانی نرسری میں اور مانی پریپ میں تھے۔

عارف پچھلے دو ماہ سے بے حد مصروف تھا۔ آفس کی طرف سے کبھی کراچی کبھی ملتان اور کبھی اسلام آباد جانا پڑ رہا تھا۔ یوں پچھلے دو ماہ سے ان کی فیس جمع نہیں ہو پا رہی تھی۔ کچھل بار جب وہ آیا تھا تو اسری نے اسے نوٹس دکھایا تھا، فیس کے متعلق جو اسکول سے آیا تھا تو اس نے کہا تھا۔

”دیکھو اسری، تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں کسی دن ڈرائیور بھیج دوں گا۔ عارف کو ڈرائیور دفتر کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ لہذا وہ صرف آفس ٹائم میں ہی ہوتا تھا۔ مگر کام کی مصروفیات میں اسے یاد ہی نہیں رہا۔ تب دوبارہ نوٹس آیا تو اس نے پھر اسری سے کہا کہ وہ کسی کے ہاتھ فیس بھجوا دے گا لیکن وہ پھر بھول گیا۔ ان دنوں آفس میں کام کی زیادتی تھی اور اب پھر نوٹس آیا تھا اور والدین کو پرنسپل سے ملنے کے لیے کہا تھا۔ اور عارف جو ابھی ابھی آفس سے آیا تھا، نوٹس دیکھ کر غصے میں اسے سب کچھ کہتا باہر چلا گیا تھا اور وہ ساکت بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اس نے تو خود کو تو عارف کی پسند میں ڈھالنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ اپنی ساری شخصیت کو مسخ کر دیا تھا۔ لیکن ابھی ابھی عارف یہ کیا کہہ گیا تھا۔ بالکل ناسک کی طرح اس نے لمحوں میں اس کی شخصیت کو زیر کر دیا تھا۔

اس کی چھ سال کی ریاضت پر پانی پھیر دیا تھا۔

اور وہ جو اپنے اوپر اتنا جبر کرتی رہی تھی، وہ سب بے کار تھا۔ بے فائدہ تھا۔

اور یہ کہ وہ غلط تھی۔

مگر پہلے بھی تو سب کچھ غلط تھا شاید۔

اور وہ کاٹنا ابھی تک اس کے دل میں چبھ رہا تھا۔

اور اب بھی۔

اس کی زندگی میں دو مرد آئے تھے۔

دونوں ہی نے اس سے محبت کا دعویٰ کیا تھا۔

دنیا بھر میں سب سے زیادہ عزیز جانا تھا۔

اور دونوں ہی نے اسے زیر کر دیا تھا۔

ناسک نے کہا تھا۔

وہ اچھی شریک زندگی نہیں ہو سکتی۔

اس لیے کہ اس میں مامتا ہے، محبوبیت نہیں۔

وہ بولڈ ہے۔ خود اعتماد ہے۔

جبکہ عورت تو کمزور، ڈری سہی اچھی لگتی ہے۔
 اور جب اس نے اپنی مامتا کو مار دیا۔
 اپنی خود اعتمادی کو لوریاں دے دے کر سلا دیا تو یہ دوسرا مرد کہہ رہا تھا۔
 کہ وہ اس کے پراہمز کو شیر نہیں کرتی۔
 اسے حوصلہ نہیں دیتی۔ اس کے زخموں پر مرہم نہیں رکھتی۔
 اس میں خود اعتمادی نہیں۔

حالانکہ کتنی بار اس کا جی چاہا تھا۔ اس کی تھکاؤوں کو اپنی انگلیوں کے پوروں سے چن لے لیکن پھر اس نے سوچا کہ کہیں وہ محبوب سے مامتا کے درجے تک نہ پہنچ جائے۔
 کتنی بار اس کا جی چاہا تھا، اس کا بوجھ بٹالے۔
 لیکن پھر خوفزدہ ہو گئی۔
 کہیں وہ نوانیت کے درجے سے گرنے لگے۔

”اف۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا غلط تھا اور کیا صحیح تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سوالیہ نشان تھا جو لمحہ بہ لمحہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اور کوئی نہیں تھا جو اس کے اس سوال کا جواب دیتا کہ کیا وہ پہلے غلط تھی یا اب غلط ہے۔ اور خود اس کے اپنے پاس بھی اس سوال کا جواب نہ تھا۔ اسے لگا جیسے اس کی ساری زندگی ایک سادہ پیپر کی طرح ہے جس پر صرف ایک سوالیہ نشان ہے اور کہیں کوئی جواب رقم نہیں۔ بس صرف ایک سوالیہ نشان؟

پس لفظ

”تو تم نے سنا صلو۔“

اماں نے میرے سامنے کھانا رکھتے ہوئے کہا تو میں نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اماں کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا کر نوالہ توڑنے لگا۔
 اماں کی عادت تھی کہ کھانے کے دوران مجھے دن بھر کی رپورٹ دیتی تھیں۔ یہ رپورٹ بھی کیا ہوتی تھی بھلا آس پڑوس محلے والوں کے متعلق دن بھر اکٹھی کی جانے والی خبریں.....
 ”ماسی زریہ کا پوتا پیدا ہوا۔“
 ”افسر خالہ کا بیٹا دئی چلا گیا۔“

”سلیم چنوں والے کی بہن نے ڈورسٹیپ میں نوکری کر لی۔“

بس ایسی ہی خبریں ہوتی تھیں اماں کے پاس..... مجھے ان خبروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان ساری خبروں میں یا باتوں میں جو اماں مجھ سے کیا کرتی تھیں، میرے لیے کوئی ایک خبر یا کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہوتی تھی جو مجھے خوشی دے اور جو میری دن بھر کی تھکاوٹ دور کر دے۔ سارا دن گاڑیوں کے نیچے لیٹ کر میری کمر دکھنے لگتی تھی اور آنکھیں درد کرنے لگتی تھیں۔
 میں ایک ورکشاپ میں کام کرتا تھا جہاں گاڑیوں کی مرمت وغیرہ ہوتی تھیں میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا جب میرے ابا کو ایک وگین نے پکڑ دیا تھا۔

مجھے اپنے ابا سے ہمیشہ ہی شکایت رہتی تھی کہ وہ ورکشاپ میں کام کیوں کرتا ہے۔ کوئی بڑا سا جنرل اسٹور کیوں نہیں کھول لیتا جیسا میرے دوست ساجد کے ابا کا ہے۔ ساجد گوہارے ہی محلے میں رہتا تھا لیکن اس کی مالی حالت مجھ سے بہت بہتر تھی۔ اس کا ابا محلے کے واحد جنرل اسٹور کا مالک تھا۔ اس کا لباس شاندار ہوتا تھا۔ اس کی کلانی پر بندھی خوبصورت رسٹ وایج کو میں حسرت

”میں لے آتا ہوں، پیسے دے دیں۔“

”پیسے نہیں ہیں۔ سب ختم ہو گئے۔“ اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ابا کی زندگی میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی روز گھر کا چولہا نہ جلا ہو۔ دال ساگ ہی سہی لیکن کھانا دونوں وقت ملتا تھا۔ ناشتے پر چائے کے ساتھ روٹی اور رات کا بچا سالن ہوتا تھا۔ میری روٹی پر اماں تھوڑا سا کھجور لگا دیتی تھیں اور میں چائے کے ساتھ روٹی کھا کر اسکول جاتا تھا۔ صبح رات کا بچا سالن کھانے کو میرا جی نہ کرتا تھا۔

”اماں، میں خالہ زرینہ سے دودھ اور پتی کے لیے ادھار پیسے لے آؤں؟ کا کے کو چائے بنا دے، اس نے اسکول جانا ہے۔“ میری سب سے بڑی بہن نے اماں سے پوچھا۔

”میں رات گئی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ پہلے بھی پچاس روپے دینے ہیں اس کے۔“

میں نے باری باری اپنی تینوں بہنوں کو دیکھا پھر اماں کو..... اور کتابیں واپس کمرے میں رکھ دیں۔ اس وقت پہلی بار مجھے ابا مجھے یاد آیا اور میں کتنی ہی دیر تک کمرے میں چار پائی پر بیٹھا بلک بلک کر روتا رہا۔

کیا تھا اگر ابا زندہ رہتا.....

کچھ دیر بعد آپا نے اندر جھانکا۔

”کا کے، تو فکر نہ کر۔“ وہ اندر آ گئی اور اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں آج سڑک پار کوٹھیوں میں جاؤں گی کہیں کام مل جائے گا برتن دھونے اور صفائی وغیرہ کا۔“ نام تو میرا اصلاح احمد ہے لیکن بچپن سے ہی سب مجھے کا کا کہہ کر بلاتے تھے۔ حالانکہ میں اس نام سے بہت چڑتا تھا اور سب سے کہتا تھا کہ مجھے نام لے کر بلائیں لیکن اس وقت میں نے آپا کو ٹوکا نہیں۔

میری تینوں بہنیں پانچ پانچ جماعت پاس تھیں۔ ابا شاید مجھے پڑھا کر افسر بنانا چاہتا تھا اس لیے انہیں مزید تعلیم نہیں دلوائی تھی۔ حالانکہ مجھے یاد ہے میری چھوٹی بہن نے جو مجھ سے صرف سال بھر چھوٹی تھی، بہت شور مچایا تھا کہ کا کا پڑھ رہا ہے تو میں بھی پڑھوں گی لیکن اماں نے اسے ڈانٹ دیا۔

میں نے بہت غور سے آپا کو دیکھا۔ آپا مجھ سے چھ سال بڑی تھیں۔ دہلی پتلی، بیس اکیس سال کی عمر میں بھی وہ سترہ اٹھارہ سال کی لگ رہی تھیں۔ رنگ گورا تھا، نقشہ تیکھے تیکھے سے تھے۔ یعنی اچھی خاصی خوبصورت تھی۔

سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ سیل سے چلنے والی سوروپے والی گھڑی نہ تھی جو ابا نے عید پر مجھے لے کر دی تھی بلکہ وہ اصلی سٹیزن تھی جو اس کے مامے نے سعودی عرب سے بھیجی تھی۔ جب سے اس کا ماما سعودی عرب گیا تھا، ان کے اسٹور کی حالت بھی بہت اچھی ہو گئی تھی۔ پہلے تو چھوٹی سی دکان ہی تھی جسے اپنے سالے کے مشورے پر ساجد کے ابا نے وسیع کر کے اسٹور بنالیا تھا۔ اماں کہتی تھیں کہ ساجد کے مامے نے ہی اسٹور میں پیسہ لگایا ہے، اب تو سڑک پار کوٹھیوں اور بنگلوں کے ملازم بھی ڈبل روٹی، انڈے اور جیم وغیرہ یہاں سے ہی لینے آتے تھے۔

مجھے دل ہی دل میں ابا سے بڑے شکوے تھے۔ رات کو جب وہ گریں اور تیل سے لتھڑے ہاتھوں کے ساتھ گھر آتا تو مجھے بڑی کراہیت آتی تھی حالانکہ گھر آ کر پہلے وہ یہ گریں لگے کپڑے اتارتا تھا اور نہا کر کھانا کھانے بیٹھتا تھا لیکن شاید مجھے دل ہی دل میں ابا پر غصہ آتا رہتا تھا کہ وہ ایک غریب شخص کیوں ہے اس لیے میں ابا سے زیادہ بات چیت نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ میں نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ ابا رات کو جب صحن میں کچھی چار پائی پر بیٹھا ہوتا ہے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ میں اس کے پاس جا کر بیٹھوں اس سے باتیں کروں لیکن میں جان بوجھ کر کتابیں کھول کر بیٹھ جاتا یا کمرے میں جا کر سو جاتا تھا۔

پتا نہیں ابا مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتا ہوگا۔ شاید اپنے خواب..... یا پھر شاید اپنے بچپن کی باتیں میرے مستقبل کا ذکر..... بہنوں کے متعلق کچھ..... اب جب ابا نہیں رہا تھا تو میں اکثر سوچتا تھا اور جب ابا اچانک چلا گیا تو مجھے چند دن بعد ہی احساس ہو گیا تھا کہ ابا کا وجود اس گھر کے لیے کتنا اہم اور قیمتی تھا۔ یہ ابا ہی تھا جو ہم پانچ جانوں کا پیٹ بھرتا اور ہمارا تن ڈھانپتا تھا۔ میرے اسکول کی فیس، میری کتابیں، پتا نہیں کیسے ابا سب پورا کرتا تھا بلکہ ہر روز صبح مجھے دو روپے خرچ کرنے کے لیے بھی دیتا تھا۔ کبھی پانچ بھی دے دیتا تھا۔ لیکن جب سے میں نویں جماعت میں آیا تھا، میں نے ابا سے کہہ دیا تھا کہ مجھے روز دو روپے دینے کے بجائے پانچ دن بعد دس روپے اکٹھے دے دیا کریں اس طرح یہ ہوتا تھا کہ میں بریک کے وقت دس روپے کا جوس یا بوتل لے لیتا تھا۔

ابا کی وفات کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد ایک صبح میں نے دیکھا اماں چولہے کے پاس خاموش بیٹھی ہے اور مجھ سے بڑی تینوں بہنیں بھی چپ چپ ہیں۔

”اماں ناشتہ نہیں بنائے؟“

میں اپنے اسکول کا یونیفارم پہن کر کتابیں اٹھا کر باہر آیا تو اماں سے پوچھا۔

”دودھ اور پتی نہیں ہے۔“

کردی۔

”استاد جی ابا کے بعد گھر کی دال روٹی مجھے ہی چلانی ہے۔ آپ تو بہت سے لوگوں کو جانتے ہوں گے، کہیں نوکری دلوا دیں۔“

استاد جی نے ایک نظر مجھے جانچتی نظروں سے دیکھا۔ میں قد کاٹھ کا اچھا تھا۔

”صبح درکشاپ آجانا۔ تیرا باپ بڑا اچھا ملکینک تھا، تجھے اس کی جگہ رکھ لوں گا۔“

”لیکن مجھے تو الف ب بھی نہیں آتی گاڑیوں کی۔“

”سیکھ جائے گا چند دنوں میں۔“ استاد نے مسکرا کر میری پیٹھ پر تھکی دی۔ ”سکھائی کے

دوران آدمی تنخواہ دوں گا جب کام سیکھ جائے گا تو پوری۔“

میں اللہ کی اس مہربانی پر اللہ کا بہت شکر گزار تھا۔ میں خوش تھا کہ بہر حال مجھے نوکری مل گئی تھی اور میری بہن کو کسی کوٹھی میں جا کر کہیں کام نہیں کرنا پڑے گا۔ میں ایک ہی دن میں بڑا سیانا ہو گیا تھا۔

تنخواہ تو ایک ماہ بعد ملنی تھی اور یہ پورا ماہ بھوکے پیاسے تو نہیں گزر سکتا۔ رات کو میں چار پائی پر کرٹیں بدلتا ہوا یہی سوچتا رہا۔

یہ میری زندگی کی پہلی رات تھی جس میں ہم سب فاقے سے تھے۔ صبح میں سیدھا ساجد کے ابا کے جزل اسٹور پر گیا تھا۔

”چاچا مجھے نوکری مل گئی ہے۔“

”کیا پڑھائی چھوڑ دی تو نے؟“ اس نے ایک تاسف بھری نظر مجھ پر ڈالی اور افسوس

سے سر ہلایا۔

”مجھے مہینے بھر کے لیے کچھ سودا چاہیے۔ رجسٹر میں ہمارا حساب لکھ لو تنخواہ ملنے پر ادائیگی

کر دیا کروں گا۔“

میں نے دیکھا تھا کہ محلے کے کئی گھروں کا حساب چلتا تھا۔

”کیا نوکری ملی ہے؟“

انہوں نے پوچھا تو میں نے بتا دیا۔ پھر مزید کوئی سوال کیے بنا انہوں نے رجسٹر میں میرا

نام لکھا اور حسب ضرورت سامان مجھے دے دیا۔

مجھے ابا کے گریس اور تیل سے لتھڑے ہاتھوں اور کپڑوں سے گھن آتی تھی لیکن اب میں

جب شام کو گھر لوٹتا تو میرے ہاتھ اور کپڑے یوں ہی تیل اور گریس سے کالے اور گندے ہو رہے

ہوتے تھے۔

میری عمر پندرہ سال تھی لیکن میں اچھا خاصا میچور تھا۔ ساجد اور دوسرے دوستوں کے ہاں وی سی آر تھا اکثر اس کے ساتھ اس کی بیٹھک میں بیٹھ کر فلمیں بھی دیکھی تھیں اور پھر ہم لڑکے آپس میں ہر طرح کی باتیں کرتے رہتے تھے پھر میں آج کے دور کا لڑکا تھا۔ کوٹھیوں میں کس طرح کے لوگ رہتے تھے..... کیا خبر..... اچھے، شریف، برے ہر طرح کے لوگ ہیں اور میری بہن پر کوئی بری نظر ڈالے.....

غیرت نے میرے خون میں جوش مارا تو میں نے اپنے آنسو صاف کیے۔

”نہیں کوئی ضرورت نہیں کسی کوٹھی میں جا کر کام کرنے کی۔“

میں یکا یک پندرہ سولہ سالہ لڑکے سے پورا جوان مرد بن گیا..... جو اس گھر کا سربراہ تھا اور جس کے ناتواں کندھوں پر یکا یک پورے گھر کا بوجھ آ پڑا تھا۔

”میں دیکھ لوں گا خود۔“

”لیکن کا کے تیری پڑھائی.....“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”پڑھ لیا جتنا مقدر میں لکھا تھا۔“ میں نے زیر لب کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”میری بات سمجھ میں آ گئی ہے نا، کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے تجھے۔“ میرے لہجے

میں خود بخود ہی رعب سا آ گیا تھا۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔ میں اسے کمرے میں ہی چھوڑ کر

باہر نکلا۔

”اماں میں جا رہا ہوں۔ کوئی نوکری دیکھتا ہوں۔“

”صلو..... کا کن.....“

اماں پکارتی رہیں لیکن میں صحن کا دروازہ کھول کر باہر گلی میں نکل آیا۔

مجھے کوئی کام نہیں آتا تھا اور میں نوکری ڈھونڈنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ میں نے تو

کبھی گھر سے خود پانی ڈال کر بھی نہیں پیا تھا، محاورتا نہیں حقیقتاً، اماں اور بہنیں ہمہ وقت میرے کام کرنے کے لیے تیار رہتی تھیں۔

میں کسی کو جانتا بھی نہ تھا۔ سارا دن یونہی پھرتا رہا۔ ایک دو دکانوں پر جا کر پوچھا۔ کچھ

سمجھ نہ آتا تھا کہ کہاں جاؤں، تھک ہار کر شام کو گھر کی طرف لوٹ رہا تھا کہ استاد جی نظر آ گئے۔ ابا

انہی کی درکشاپ پر کام کرتے تھے۔

میں صبح سے خالی پیٹ تھا۔ مجھے چکر آرہے تھے اور قدم اٹھ ہی نہیں رہے تھے کہ اچانک

ان پر نظر ڈالی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر رک گئے۔ حال احوال پوچھا تو میں نے یکدم ہی نوکری کی بات

”زمانہ بہت خراب ہے، جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائیں تو اچھا ہے۔“

ان دنوں اکثر اماں کہا کرتی تھیں لیکن میں جانتا تھا کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اول تو ہماری غربت کی وجہ سے کوئی ادھر کا رخ ہی نہیں کرتا تھا اور اگر کوئی آ بھی جاتا تو میرے لیے سادگی سے شادی کرنا بھی ممکن نہ تھا بلکہ کئی بار جب اماں نے بتایا کہ آج ماسی زرینہ کے ساتھ کوئی آپا کو دیکھنے آئے گا تو میں ڈر سا گیا کہ کہیں وہ آپا کو پسند ہی نہ کر لیں اور اگر انہوں نے پسند کر لیا تو پھر شادی کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ کم از کم بھی دس پندرہ ہزار روپے تو چاہیے ہوں گے۔ یہ میرا خیال تھا جبکہ اماں کا کہنا تھا کہ پچیس ہزار ہوں تو تب کہیں جا کر شادی کا کام خوش اسلوبی سے ہو سکتا ہے۔ باراتیوں کو کھانا کھانا، دولہا اور اس کے خاندان کے کپڑے تو ضروری ہیں۔ اماں نے میکے میں کچھ اچھے حالات دیکھے تھے۔ کم از کم یہاں سے بہتر تھے۔ تین چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں اور بھائی سب ہی کمانے والے تھے۔ سو اماں کو ذرا اچھے طریقے سے رخصت کیا تھا۔ اس لیے آپا کی شادی کے ذکر کے ساتھ وہ اپنی شادی کا ذکر ضرور کرتی تھیں کہ سات جوڑے کپڑے ان کے، تین ابا کے..... ابا کی گھڑی، انگٹھی، باراتیوں کو پلاؤ، زردہ اور سالن.....

مجھے اماں نے یہ سب اتنی بار بتایا تھا کہ ازبر ہو گیا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اتنے پیسے ضرور ہوں کہ جس طرح اماں کو بھائیوں نے رخصت کیا تھا اس طرح میں بھی آپا کو رخصت کر سکوں۔ اس لیے رات کو جب بستر پر لیٹتا تو میرے لاشعور میں یہ بات ہوتی کہ اللہ کرے آپا کو دیکھنے والے انہیں ناپسند کر جائیں اور پتا نہیں یہ میری لاشعوری خواہش تھی یا آپا کی قسمت ہی سوئی ہوئی تھی کہ جو آتا پھر دوبارہ مڑ کر نہ آتا تھا۔

”ساتم نے صلو۔“

اماں نے دوپٹے کے پلو سے مجھے پنگھا جھلنے ہوئے پھر کہا۔

”وہ..... وہ جو ہے نارضو.....“ ان کی آواز دھیمی ہو گئی۔

میں نے سر جھٹک کر ان کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں اماں کس رضو کا ذکر کر رہی تھیں۔ محلے میں تین چار رضوتھیں۔ شاید کسی کی منگنی ہو گئی ہوگی۔ اماں ایسی خبریں بہت شوق اور رازداری سے سنایا کرتی تھیں۔

”وہ تیرا دوست ہے نا سلم بٹ، اس کی بہن.....“

اماں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ آپا باہر برآمدے میں درمی پٹی کسی دوپٹے پر کڑھائی کر رہی تھی۔ آپا سے چھوٹی صحن میں حمام کے پاس بیٹھی برتن دھو رہی تھی اور سب سے چھوٹی شاید برآمدے میں ہی آپا کے پاس بیٹھی تھی یا پھر سو رہی تھی۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد کہ کوئی

زندگی کی گاڑی چل پڑی تھی۔ میں نے جلد ہی سارا کام سیکھ لیا تھا۔ لیکن ابا پتا نہیں کیسے اس تنخواہ میں سب پورا کر لیتا تھا۔ اب تو مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی پیسے ختم ہو جاتے تھے، بقول اماں کے مہنگائی بھی تو پہلے سے دگنی ہو گئی تھی۔ صرف آٹے کی قیمت پہلے سے تین گنا ہو گئی تھی اور تنخواہ وہی تھی جو ابا کو ملتی تھی۔ ایسے میں آپا نے کڑھائی وغیرہ کا کام شروع کر دیا تھا۔ ماسی زرینہ سڑک پار کے بنگلوں میں کپڑے استری کرنے جاتی تھی۔ وہ جدی پشتی دھوبی تھے۔ اسی نے آپا سے پہلی بار کڑھائی کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ کسی بنگلے سے ایک نمیش لائی تھی۔

”تیرے ہاتھ میں اتنی صفائی ہے۔ میں نے بڑی تعریف کی ہے تیری بیگم صاحب سے۔ یہ کڑھائی اس نمیش پر کر دو تو کچھ پیسے ہاتھ آ جائیں گے۔“

میں اس وقت صحن میں حمام کے پاس بیٹھا منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ آپا نے ڈرتے ڈرتے مجھے دیکھا۔ میں نے نظریں چرائیں۔ مجھے اس میں کوئی برائی نظر نہ آئی تھی۔ بیگم صاحبہ نے اس نمیش کے ڈیڑھ سو روپے دیے تھے جو اماں نے دودھ والے کودے دیے۔ میں زیادہ تو نہیں جانتا تھا لیکن مجھے اتنا اندازہ تھا کہ اگر وہ بیگم صاحبہ یہ کڑھائی کسی بوتیک سے کرواتیں تو ہزار سے کم کی نہ ہوتی لیکن غریب کی مجبوریوں سے سب ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

یوں ماسی زرینہ کے طفیل آپا کو کام ملنے لگا تھا جس سے تھوڑی سہولت ہو گئی تھی لیکن شاید اماں اس میں سے کچھ پیسے بچا کر بھی رکھنے لگی تھی کہ اسے ہر وقت اب آپا کی شادی کی فکر رہنے لگی تھی۔ اس نے آس پڑوس سب سے کہہ رکھا تھا۔

کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اگر کوئی رشتہ آ بھی گیا تو بھلا شادی کیسے ہوگی۔ بہت ہوا تو چند جوڑے کپڑے اور چند برتن اماں نے ابا کی زندگی میں ہی لے رکھے تھے۔ شاید کوئی ایک انگٹھی اور ایک جوڑی جھسکے یا بالیاں بھی ہوں گی مگر وہ لوگ جو رشتہ کریں گے ان کی بھی تو کوئی دیماند ہوگی اور پھر انہیں کھانا وانا بھی تو دینا ہوگا اور یہ سب کہاں سے ہوگا؟

ایک بار میں نے ماسی زرینہ کو اماں سے کہتے سنا تھا۔

”لڑکی تو انہیں پسند ہے لیکن وہ کہتے ہیں۔ خالی لڑکی تو لے کر نہیں جانی۔ چار بندوں میں ہماری بھی عزت ہے۔“

تب اماں کا یہ ذرا سامنہ نکل آیا تھا۔

جہاں تک شکل و صورت کی بات تھی، آپا ہی نہیں باقی دونوں بہنیں بھی بہت خوبصورت تھیں۔ بالکل اماں کی طرح لمبے قد، دلکش سراپا..... اس غربت میں بھی گلابی رنگت پر چمک سی نظر آتی تھی۔

ان کی آواز نہیں سن رہا، اماں نے بات مکمل کیں

”وہ گھر سے بھاگ گئی ہے کسی کے ساتھ۔“

”کیا؟“ روٹی توڑتے ہوئے میرے ہاتھ رک گئے۔

”ہاں ماسی زربہ کہہ رہی تھی دودھ والے کے ساتھ بھاگی ہے۔ تھا بھی تو یہ مشنڈا۔“

میرا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ اسلم میرا دوست تھا۔ اس نے صرف سات جماعتیں پڑھی تھیں اور یہیں محلے میں اس کی قلعی کی دکان تھی۔ اس کا باپ اکثر بیمار ہی رہتا تھا۔ اس لیے وہ بہت چھوٹی عمر سے ہی باپ کے ساتھ دکان پر بیٹھنے لگا تھا۔ کسی زمانے میں ان کی دکان برتنوں سے بھری رہتی تھی لیکن اب تائیے کے برتنوں کا استعمال کم ہو گیا تھا یا پتا نہیں کیا بات تھی کہ اس کے پاس پہلے جتنا کام نہیں آتا تھا۔ ہاں کسی امیر کے ہاں شادی ہوتی تو پھر اسے گھر بلا لیا جاتا تھا۔ جہاں جا کر وہ جہیز کے برتن قلعی کرتا تھا تو کچھ اچھی آمدنی ہو جاتی تھی بہر حال گزارہ ہو رہا تھا۔ اس کی ایک بڑی بہن تھی رضو۔

”بے غیرت نے سب کے سر جھکا دیئے۔ بے چارہ باپ اور بھائی تو کسی کو منہ دکھانے جو گے نہیں رہے۔“

اماں اب افسوس سے ہاتھ مل رہی تھیں اور مجھے بار بار اسلم کا خیال آ رہا تھا۔ میرا یار تھا۔

۔۔۔

”بھائی غلام رسول تو کہہ رہے تھے کہ نظر آ جائے تو قتل کر دوں گا بے غیرت کو۔“

میں نے ہاتھ سے چنگیر پرے کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں کبھی کبھی کھانا کھا کر کچھ دیر کو باہر نکلتا تھا اور ساجد کے ابا کی یا دینو چاچا کی دکان کے تھڑے پر ہم سب دوست یار بیٹھ کر گپ شپ لگاتے تھے۔ ہاں کبھی بہت تھک جاتا تو کھانا کھا کر لیٹ جاتا تھا۔ اسلم بٹ بھی وہیں تھڑے پر بیٹھا کرتا تھا اور ہم گلی میں بچوں کو کرکٹ کھیلتے ہوئے دیکھتے رہتے تھے اور پسینے لگاتے رہتے تھے۔

”باہر جا رہے ہو تو آتے ہوئے دوڈ سپرین کی گولیاں لیتے آنا۔“

اماں نے برتن سیٹھے ہوئے کہا تو میں سر ہلاتا ہوا باہر نکلا۔ آپا پر ایک نظر ڈالی۔ آپا کے چہرے پر ہمیشہ جیسی سنجیدگی تھی۔ چھوٹی آپا کے پاس دری پر لیٹی تھی۔ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ رضو، آپا کی سہیلی تو تھی، آپا کو پتا ہوگا اس کے چکر کا۔۔۔۔۔

میں نے بغور دیکھا، لیکن بھلا آپا کے چہرے سے مجھے کیا اندازہ ہوتا۔۔۔۔۔

میں تیزی سے باہر نکل گیا۔

تھڑا خالی تھا، میں اسلم کی دکان کی طرف چل پڑا۔ حالانکہ میرا خیال نہیں تھا کہ وہ آج دکان پر ہوگا لیکن وہ دکان پر تھا اور آگ دہکا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ روک لیے۔

”آ جا بھئی، بڑے دنوں بعد آیا ہے۔“

میں دکان سے باہر کھکی لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے اسے دکان پر دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ میں تو یونہی اس کی طرف سے ہو کر ساجد کے جنرل اسٹور کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔ شاید اماں کو کسی نے غلط بتایا ہے۔

”ابا تو ٹھیک ہیں نا تیرے؟“

”کھانسی کچھ زیادہ ہے ان دنوں، ساری رات بیٹھا رہتا ہے۔ ذرا لیٹا تو سانس اکھڑ گئی۔ کسی نے ادھر ساتھ ساتھ والے گاؤں میں ایک حکیم کا بتایا ہے۔ کسی روز لے جاؤں گا۔“

وہ ساتھ ساتھ سامان بھی سیٹھا جا رہا تھا اور سارے بے قلعی برتن بوری میں ڈال رہا تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ غصے میں پاگل بنا ہر جگہ رضو کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوگا، مارنے کے لیے۔۔۔۔۔ میں نے پھر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا، تو وہ ہمیشہ کی طرح ہی لگا۔ کوئی انہونی نہیں تھی اس کے چہرے پر۔۔۔۔۔ وہ میرا دوست تھا لیکن مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں خود سے رضو کے متعلق اس سے کوئی بات کرتا، سو کچھ دیر بیٹھ کر اٹھ آیا۔ جنرل اسٹور سے ڈسپرین لی تو ساجد مل گیا۔

”چل یار، پٹھان سے قہوہ پیتے ہیں۔“

اس نے کہا تو ہم دونوں قہوہ پینے چل پڑے۔ راستے میں اس نے بھی مجھے رضو کے متعلق بتایا۔

”بے چارہ اسلم، میری تو ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ اس سے افسوس کروں۔“

”دراصل ہماری معاشی حالت اور غربت ہی ان برائیوں کی جڑ ہے۔ غربت نہ ہوتی اور اسلم بٹ اپنی بہن کو عزت و آبرو سے رخصت کر سکتا تو یہ نوبت نہ آتی۔“

ساجد نے بارہ جماعتیں پڑھ لی تھیں اور اب اپنے ابا کے جنرل اسٹور پر بیٹھنے لگا تھا۔ پھر ان کے گھر میں ٹی وی بھی تھا۔ وہ شاید ہم سب سے زیادہ سمجھداری کی باتیں کرتا تھا۔

”میں نے سمجھایا ہے اسے کہ اس میں قصور رضو کا نہیں غربت کا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے ساری غریب لڑکیاں۔۔۔۔۔“ میرے اندر جیسے پنی چھبی تھی۔

”نہیں یار، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ ساجد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”کچھ صابر ہوتی ہیں، حالات کے ساتھ سمجھوتا کر لیتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں، رضو کی طرح۔۔۔۔۔“

میری آنکھوں کے سامنے میری بہنوں کے چہرے آ گئے۔ صابر اور حالات سے سمجھوتا

کرنے والی..... میں نے بچپن سے لے کر اب تک کبھی انہیں کسی بات پر ضد کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اماں نے جو پہنایا، پہن لیا۔ جو کھلایا، کھلایا۔

میں نے اپنے دل میں بڑی طمانیت محسوس کی۔

گھر آ کر میں نے تینوں کو باری باری غور سے دیکھا تھا بلکہ یہ صرف اس دن کی بات نہ تھی میں روز ہی ان کے چہروں کو غور سے دیکھنے لگا تھا لیکن مجھے کبھی ان میں کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ آپا نے پیسے جمع کر کے سلائی مشین لے لی تھی اور آس پاس والوں کے کپڑے بھی سینے لگی تھیں کچھ دن ایک سلائی سینٹر میں جا کر اس نے سلائی کی تھی۔ جن دنوں وہ سلائی کیٹھنے جا رہی تھی تو میں بہت غور سے اسے دیکھتا تھا۔ وہ ایک بار تو میں بھی اس کے پیچھے ہی نکلا تھا کہ کہیں راستے میں وہ رکتی تو نہیں، کہیں اس کے صبر کا پیمانہ لبریز تو نہیں ہو گیا؟ مٹی بھی اب اس کے ساتھ مل کر کڑھائی کرنے لگی تھی۔ ہاتھ کچھ کھلا ہو گیا تھا اتنا کہ اب سردیوں گرمیوں میں موسم کی مطابقت سے سب کے کپڑے بننے لگے تھے۔ آپا اور اماں میرے لیے دو جوڑے لے آئی تھیں۔ قسطوں پر ٹی وی بھی لے لیا تھا اور ٹی وی دیکھ کر تینوں کو پہننے اور اوڑھنے کا سلیقہ بھی آ گیا تھا۔ چھوٹی تو خاصی شوقین تھی۔ اپنے اور میرے کپڑوں کو کلف لگا کر کوئلے دہکا کر خوب جما جما کر استری کرتی تھی۔ کولوں والی یہ استری وہ ماسی زرینہ سے لے آئی تھی جو اب بجلی کی استری استعمال کرتے تھے۔ مجھے بھی شام کو نہا کر کلف لگے کپڑے پہن کر تھڑے پر بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ تھڑے پر شام کو ہم سب دوستوں کی محفل اکثر جیتی تھی۔ کبھی کبھی ساجد موج میں آ کر پیپسی پلا دیتا تھا اور کبھی ہم پٹھان سے قہوہ لے کر پیتے تھے۔

استاد نے میری تنخواہ میں سو روپے کا اضافہ کیا تھا۔ اس خوشی میں اس روز میں نے سب کو اپنے پیسوں سے قہوہ پلایا تھا۔

”یار، تو کب مٹھائی کھلا رہا ہے؟“

ساجد نے اسلم بٹ کے کندھے پر ہاتھ مارا تو میں چونکا۔ ”کس بات کی مٹھائی؟“

”تجھے نہیں پتا؟ اس کی اماں آج کل اس کی شادی کی تیاریاں کر رہی ہے۔“ سلیم نے

بتایا۔

”ارے سچ، کب، کہاں؟“

”کب کا تو پتا نہیں لیکن میری پھوپھی کے گھر اماں نے بچپن سے ہی بات کر رکھی ہے۔

پھوپھی تو بہت عرصے سے اماں کے پیچھے پڑی تھی کہ اپنی امانت لے جاؤ لیکن اماں ابا کا اور میرے

خیال بھی تھا کہ پہلے رضو.....“

کہتے کہتے اسلم بٹ کا ایک خاموش ہو گیا۔

یہ غریبوں کا محلہ تھا یہاں سب کے اپنے اپنے مسائل تھے۔ لوگوں نے چند دن تک رضو کا ذکر کیا تھا پھر اس قصہ کو بھول بیٹھے تھے اور اب اسلم بٹ.....

”اور اب ہمارے یار کے سر پر سہرا باندھنے ہی والا ہے۔“ ساجد نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

”ہاں اماں کہہ رہی تھیں بس ایک چھوٹا سا گلے کا زیور اور دو چوڑیاں بنوائیں تو پھر..... جوڑے تو بن گئے ہیں اور ویسے کے کھانے کے لیے بھی کمیٹی ڈال رکھی ہے۔“

اب رضو نہیں تھی، اس کی ذمہ داری نہیں تھی اور اس کی اماں اپنی بہو کے لیے آرام سے تیاری کر سکتی تھی۔

مجھے یکدم اپنے کندھوں پر بے حد بوجھ محسوس ہوا۔ میں تو شاید..... نہ جانے کب..... ابھی تو..... اماں نے چند دن پہلے ہی بتایا تھا کہ مٹی کی بات کچی ہی سمجھو۔ اپنے استاد سے بات کرنا۔ کچھ ادھار دے۔ وہ لوگ شادی میں جلدی کریں گے۔

”لیکن آپا.....“ میں نے اعتراض کیا۔

”ارے پاگل جھلے، اس کے انتظار میں دوسری کو کیوں بٹھائے رکھوں؟ وہ لوگ چھوٹی کے لیے کہتے تو چھوٹی کا ہی سہی، کچھ تو بوجھ کم ہو۔ کل کلاں کو یہ تینوں پار چڑھ جائیں تو تیرا بھی بیاہ کرنا ہے۔“

”چھوڑو ماں میرے بیاہ کا مت سوچو، مجھے نہیں کرنا بیاہ، خوا خواہ کا خرچہ..... پہلے ہی پوری نہیں پڑتی۔ یہ تینوں پار لگ جائیں تو رب کا شکر ادا کروں۔“

میں نے اماں سے تو یہی کہا تھا لیکن دل میں اس وقت گدگدی سی ہو رہی تھی۔

سب اسلم بٹ قلعی گر کو چھیڑ رہے تھے۔ کھلے ڈلے مذاق ہو رہے تھے۔ وہ کبھی قہقہہ لگاتا، کبھی جھینپتا، کبھی ہنس پڑتا اور میرے دل میں عجیب سے احساسات جاگ رہے تھے۔ میرے سارے وجود میں سنسناء ہو رہی تھی۔ میں پہلی بار اس احساس سے دوچار ہوا تھا۔

”تو کیا سوچ رہا ہے شہزادے؟“ ساجد نے حسب عادت میری پیٹھ پر دھموکا مارا۔

”کہیں تیری اماں بھی تو تیرے سر پر سہرا باندھنے کا نہیں سوچ رہی؟“

”نہیں۔“ میں چونکا۔ ”ابھی تو پہلے بہنوں کی شادیاں کرنا ہیں۔“

میں نے ایک حسرت بھری نظر اسلم پر ڈالی۔

”ادہ ہاں۔“ ایک لمحے کو ساجد چپ ہو گیا۔ پھر سلیم ملی نے کرکٹ کا موضوع چھیڑ دیا تو بہت دیر تک سب اسی پر تبصرہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ عشاء کی اذان ہو گئی اور ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو میری عجیب حالت تھی۔ دوستوں کے ہنسی مذاق میں کہے گئے ذومعنی جملے میرے اندر تلاطم پیدا کیے ہوئے تھے اور انوکھی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ میں دیر تک سوچتا رہا۔ پھر یکے بعد دیگرے آپا، منجھلی اور چھوٹی کے خیال نے اس تصور کو مدھم کر دیا۔ میرے خواہشوں کے سمندر میں بھی ہولے ہولے سکون آ گیا اور نہ جانے کب میں سو گیا۔

ان دنوں انہونی خواہشوں نے میرے وجود میں آگ سی دھکا رکھی تھی کام کرتے ہوئے بھی میں کھوسا جاتا۔ کئی بار استاد نے ٹوکا تھا لیکن میں کیا کرتا، جب سے اسلم بٹ کی شادی کا ذکر چلا تھا۔ دوستوں نے تو جیسے اسلم کا پیچھا ہی لے لیا تھا۔ ہر وقت چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق اور سب کی چھیڑ چھاڑ سے میں بچھ سا جاتا تھا۔ اسلم خوش قسمت ہے اور میں..... میرے کندھوں پر تو تین بہنوں کا بوجھ ہے، ان کو نمٹاتے نمٹاتے تو میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔ جذبے مرجائیں گے اور.....

میرے اند ایک کمین سی سوچ نے کئی بار سراٹھایا لیکن میں نے خود کو ڈپٹ کر اس سوچ کا گلہ گھونٹ دیا اور گھنٹوں اپنے آپ پر نفرتیں بھیجتا رہا۔ تنگ آ کر میں نے تھڑے پر بیٹھنا چھوڑ دیا۔ ساجد، سلیم، اسلم کئی بار بلانے آئے لیکن میں تھکاوٹ کا بہانہ کر دیتا۔

منجھلی کی بات چل رہی تھی لیکن لین دین کا معاملہ سیٹ نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بھی اماں پر یقین تھی کہ معاملہ سیٹ ہو جائے گا۔ انہوں نے آپا کو سستی کریپ اور سلک کے دو تین سوٹ نکال کر دیئے تھے کہ وہ ان پر کچھ موتیوں ستاروں کا کام کر دے۔ اس لیے آپا نے ایک بار پھر سلائی سینئر جانا شروع کر دیا تھا تاکہ وہاں اڈے پر لگا کر منجھلی کے سوٹوں پر کام کر سکے۔ اماں نے مجھے کہا تھا کہ میں استاد سے دس ہزار روپے ادھار مانگ لوں کیونکہ اماں نے لڑکے والوں کو شاید کچھ کم پر راضی کر لیا تھا۔ پہلے تو انہوں نے ایک موٹر بائیک کا مطالبہ کیا تھا کہ لڑکی کو دیں یا نہ دیں لیکن ہمارے بیٹے کو ایک موٹر سائیکل ضرور دے دیں لیکن شاید معاملہ دس ہزار پر طے ہو گیا تھا۔ تب ہی اماں مجھے استاد سے ادھار مانگنے کو کہہ رہی تھیں لیکن استاد نے صاف انکار کر دیا۔

”مجھے کیا خبر دو مہینے بعد ہی تو مر جائے تو ادھار تیرا باپ قبر سے آ کر اتارے گا۔“

استاد کی سفاکی پر میرا دل جیسے کرچی کرچی سا ہو گیا تھا اور میری طبیعت بھی خراب سی ہو گئی تھی ایک گاڑی کا انجن چیک کرتے ہوئے میں چکرا کر گر پڑا تو چھٹی لے کر وقت سے پہلے ہی

گھر کی طرف چل پڑا۔ سڑک کر اس کر کے میں گلی کی طرف مڑا ہی تھا کہ میں نے آپا کو گلی سے نکلنے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑوں کا شاپر تھا۔ شاید وہ سلائی اسکول سے آرہی تھی۔ چادر کو اچھی طرح سر پر لپیٹے وہ تیز تیز چل رہی تھیں میں اسے آواز دینا ہی چاہتا تھا کہ اسی گلی سے ایک لڑکا نمودار ہوا۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا آپا کے پیچھے چل پڑا تھا۔

میرے دل کی دھڑکنیں یکدم تیز ہو گئیں۔ پیشانی کی رگیں پھول گئیں۔

وہ لڑکا تیز تیز چلتا ہوا آپا کے پاس پہنچا تھا پھر شاید اس نے آپا سے کچھ کہا تھا کہ آپا کے چلتے قدم لمحہ بھر کور کے تھے مگر پھر وہ تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ وہ ان کے پیچھے ہی تھا۔ پھر شاید اس نے آپا کی طرف ہاتھ بڑھا کر کچھ دینا چاہا تھا۔

میری آنکھوں کے آگے دھند سی پھیل گئی۔ میں تیزی سے بڑھا اور لڑکے کو گردن سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

”بے غیرت، بہنیں نہیں ہیں تیری گھر میں.....“

میں نے دو تین جھانپڑا اسے لگائے اور ایک ٹھٹھا مارا۔

”چل دفعہ ہو یہاں سے، پھر گلی میں نظر آیا تو ٹکڑے کر کے گندے نالے میں پھینک دوں گا۔“

پھر ایک قہر بھری نظر آپا پر ڈالی۔ ”گھر چل۔“

اور مڑ کر اس لڑکے کو گلی سے نکلنے ہوئے دیکھنے لگا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں مڑا۔ آپا جا چکی تھیں۔

میں لال سرخ آنکھوں کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو آپا اماں سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

”کون تھا وہ؟“ میں نے اندر داخل ہوتے ہی آپا کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”کیا اسی لیے اسکول جاتی ہے۔“

”خدا کی قسم، بھائی مجھے نہیں پتا وہ کون تھا۔ میں نے تو اس سے بات تک نہیں کی۔ کل سے وہ میرے پیچھے آرہا ہے۔“

”تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟ ضرور تیرا چکر ہوگا اس کے ساتھ بے غیرت۔“

”نہیں..... نہیں ایسا مت کہو بھائی، ایسا نہیں ہے۔“ وہ زار و قطار رونے لگی۔

”یہ صحیح کہہ رہی ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ کوئی لڑکا اس کے پیچھے آتا ہے۔“ اماں نے اس کی صفائی پیش کی۔

”آئندہ سے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں دہازا۔
میرا خون کھول رہا تھا۔ کنپٹیاں جل رہی تھیں۔

”ہماری عزت ہے محلے میں۔“

میں نے اماں کی طرف دیکھا۔ منجھلی پانی کا گلاس بھر کر لے آئی۔
”بے غیرت نہیں ہوں میں کہ اسلم قلعی گر کی طرح چپ ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔ ٹوٹے
کر کے پھینک دوں گا۔ آئندہ اگر میں نے دیکھا تو۔“

میں نے منجھلی کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

اسلم کی طرح..... میرے دل نے سرگوشی کی اور میں گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھنا چلا گیا۔

کیا تھا..... کیا تھا اگر آپا بھی اسلم کی بہن کی طرح.....

ایک بوجھ مجھے اپنے کندھوں سے سرکتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے ایک شکوہ بھری نظر آپا

پر ڈالی۔

”میرا یقین کرو بھائی میں ایسی نہیں ہوں، میں تو.....“ آپا بے بسی سے مجھے دیکھتی یقین

دلا رہی تھیں۔

”میں بے غیرت نہیں ہوں۔ سنا تم نے، نہیں ہوں بے غیرت۔“

اپنے اندر کی آواز دبانے کے لیے میں زور سے چیخا اور ایک تھپڑ آپا کے چہرے پر لگایا

لیکن اندر کی آواز اور بلند ہو گئی تھی۔

کیا تھا کیا تھا اگر آپا بھی.....

اور میں یکدم رو پڑا۔ اماں نے مجھے سینے سے لگالیا۔

”یقین کر تیری بہنیں ایسی نہیں ہیں۔“

اماں مجھے سینے سے لگائے تسلی دے رہی تھیں، تھپک رہی تھیں اور میں اماں کے سینے سے

لگا رو رہا تھا۔ بلک رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ایک لڑکے نے میری بہن کا پیچھا کیا تھا اور میری غیرت

پر چوٹ پڑی تھی بلکہ اس لیے کہ..... اس لیے کہ کیا تھا اگر..... اگر آپا بھی.....!!

کھوٹا سکھ

سارے گھر میں بھگدڑ مچی تھی۔ تھکی ہاری آسیہ دروازے پر ہی ٹھنک کر رک گئی۔ دادی
جان کے زمانے کے بڑے بڑے نواڑی پلنگ باہر پڑے تھے اور اماں پورے زور شور سے اپنے
میلے کچیلے دوپٹے سے ان کے سرخ پاپوں کو چکانے کی کوشش کر رہی تھیں جن کا رنگ جگہ جگہ سے اڑ
چکا تھا۔ رنی، شلوار کے پانچے چڑھائے، برآمدے کا فرش دھو رہی تھی جب کہ غنی اور منیر کمرے سے
سالنخوردہ فرنچیز اٹھا اٹھا کر باہر لا رہے تھے۔

رنی نے اسے کھڑے دیکھ کر جھاڑو ہیں پھینکا اور اس کی طرف لپکی۔ ”آسیہ آپا!.....
آسیہ آپا! وہ.....“ مگر وہ جملہ پورا نہ کر سکی اور گیلے فرش پر پھسلے پھسلے پچی۔

”ارے بھئی کیا آفت آگئی ہے! یہ ساری سرگرمیاں کس سلسلے میں؟“

”وہ آپا! وہ شہر یار بھائی آرہے ہیں۔“

”اوہ۔“ اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں بچی آپا۔ ان کا خط آیا ہے۔“ رنی نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ”وہ چند

دن قبل ہی امریکہ سے آئے ہیں۔ بھابی کے میکے سے خط لکھا ہے۔“

ہاں وہی تو اس کا اصل گھر ہے۔ اس نے بیزاری سے سوچا۔

”وہ اور بھابی اگلے بدھ کو آرہے ہیں۔“

”تو یہ سب.....“ آسیہ نے بکھرے ہوئے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیا استقبال کی

تیاری ہو رہی ہے؟“

”جی!“ رنو نے دانست نکال دیئے۔

”رہنے دے خیر سے میرا شہریار..... میں لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کما لیے ہوں گے۔“

”وہ آپ کا تھا ہی کب اماں؟“ آسیہ نے سر تکیے پر رکھتے ہوئے زیر لب کہا۔
 ”..... پھر تو اماں ہمارے عیش ہو جائیں گے۔ ہیں نا؟“ عفی نے پوچھا۔
 ”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں.....؟“ وہ زور شور سے پلنگ کے پائے چکانے میں لگی ہوئی تھی۔

”تو ٹھیک ہے اماں! میں شہریار بھائی سے کہوں گی ہمیں بس لگوا دیجئے۔ ہم سے پیدل اسکول نہیں جایا جاتا۔ ایمان سے اماں! پاؤں درد کرنے لگتے ہیں چل چل کر۔“ عفی ان کے قریبی ہی بیٹھ کر دوسرا پایہ چکانے لگی۔ ”اور پھر صبح کتنی جلدی اٹھنا پڑتا ہے۔ سارا دن کلاس میں جمایاں آتی رہتی ہیں۔ اماں بس لگوا دیں نا۔“ اس نے خوشامدی۔
 ”ہاں ہاں، کہہ جو دیا ہے چل اٹھ اب کام کر۔“

”اور ہمارا یونیفارم بھی تو کتنا پرانا ہو گیا ہے۔“ رنی نے بھی جھانڈو اور بالٹی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو کہوں گی شہریار بھیا سے، مجھے تو بس نیا یونیفارم اور جوتے لے دیں اور پتا ہے، میں حسنا بوتیک سے اپنا یونیفارم سلواؤں گی۔ مس نیلو وہیں سے اپنے کپڑے سلواتی ہیں۔ ہائے کیسے خوبصورت سلے ہوتے ہیں۔ ہیں نہ عفی؟“
 ”ہاں۔“

اماں کے چہرے پر چمک تھی اور آنکھوں سے روشنی سی نکل رہی تھی۔ آسیہ نے کھلے دروازے سے ان کے چمکتے چہرے دیکھے اور آنکھیں موند لیں۔ اس کا جی چاہا۔ وہ اماں سے جا کر صاف صاف کہہ دے کہ آپ جو خواب دیکھ رہی ہیں نا۔ اس کی تعبیر کبھی نہیں ملے گی۔ آپ یوں ہی آنکھوں میں چراغاں کیے بیٹھی ہیں۔ یہ وہ شہریار بھیا ہیں نا جو سات سال قبل اس گھر کو حقارت سے دیکھ کر اور یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ ”سوری اماں! یہ گھر گل رخ کے قابل نہیں ہے۔“ اور پھر انہوں نے وعدہ بھی تو کیا تھا نا ملنے کا، خط اور پیسے بھیجنے کا۔ ان سات سالوں میں ایک وعدہ بھی تو پورا نہیں کیا انہوں نے۔ آپ نے لوگوں سے سنا کہ وہ امریکہ چلے گئے ہیں، ڈالروں سے کھیل رہے ہیں۔ ان ڈالروں میں کوئی ایک ڈالر بھی آپ کے نام کا نہیں تھا اور وہ تو جانے سے پہلے ملنے تک نہیں آئے تھے پھر آپ کو یقین کیوں ہے کہ وہ آرہے ہیں اور وہ بھی گل رخ کے ساتھ! اب یہ ناممکن ہے۔ یوں ہی جانے کس رو میں خط لکھ دیا ہوگا۔“

”مگر ابھی بدھ میں تو بہت دن ہیں، پھر اتنا تھکنے کی کیا ضرورت ہے؟“ آسیہ کے لہجے میں تھکن سی اتر آئی۔ ”یہ گھر شہریار بھائی کے لیے نیا تو نہیں ہے۔ عمر کے بچپس برس اسی گھر میں گزارے ہیں۔ انہوں نے یہاں کے شب و روز ان کے لیے اجنبی تو نہیں ہیں رنو!“
 ”دراصل اماں کا خیال ہے کہ گل رخ بھابی تو پہلی بار آرہی ہیں نا! اور پھر شہریار بھائی تو اب بڑے آدمی ہیں نا! کیا کہیں گے؟“ رنو نے وضاحت کی۔

اسے نہ جانے کیوں غصہ آ گیا۔ ”بڑے آدمی ہیں تو ہوتے رہیں رنو! کس نے بنایا ہے انہیں بڑا آدمی؟ اسی گھر نے، اسی برآمدے نے، انہی کمروں اور اسی صحن میں پل کر بڑے ہوئے ہیں وہ، اور اگر گھر ان کے معیار کے مطابق نہیں ہے تو یہ ان کا فرض تھا کہ وہ اسے اپنے معیار کے مطابق بناتے.....“

”آپا۔“ رنو نے چور نظروں سے اماں کی طرف دیکھا جن کی پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی۔
 ”Sorry رنو۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ”دراصل آج بہت تھکی ہوئی ہوں۔“
 اور یہ حقیقت بھی تھی کہ آفس سے اٹھ کر جب وہ میوشن پڑھانے لگی تو مسز فاروق کے اصرار پر آج اسے معمول سے زیادہ دیر تک نمبرہ کو پڑھانا پڑا تھا۔ اس نے سوچا تھا گھر جاتے ہی رنو سے چائے بنا کر پیے گی لیکن یہاں نہ صرف گھر کا ہر فرد مصروف تھا بلکہ بکھرے ہوئے سامان کو دیکھ کر اس کی طبیعت اور بھی مکدر ہو گئی تھی۔ اسی لیے وہ کسی سے کچھ کہے بنا اپنے کمرے میں چلی گئی اور تھکی تھکی سی بستر پر گر پڑی۔

اماں نے کندھے اچکائے اور آپ ہی آپ بڑبڑائیں۔ ”پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے اس لڑکی کو۔ چار پیسے کیا کمانے لگی ہے کہ مزاج ہی نہیں ملتے صاحبزادی کے۔ ذرا جو بھائی کے آنے کا سن کر چہرے پر خوشی کی رقع اتری ہو۔“

”اماں!“ نے پانی کی بالٹی صحن میں رکھتے ہوئے احتجاج کیا۔ ”آپا نے اس گھر کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو.....“ اس کی آواز بھرا گئی ”پلیز اماں! آپ انہیں کچھ نہ کہا کریں۔“

”اچھا اچھا، سبق نہ سکھا مجھے۔ اب آرہا ہے میرا شہریار، سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ کہہ دے اسے، اب نہیں ضرورت اسے آفس میں سرکھپانے کی۔ بس دے دے استعفیٰ۔“
 منیر نے مکس ٹھینتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ ”آپا نے نوکری چھوڑ دی تو بھوکوں مریں گے۔“

”اے سنو آسیہ بیٹی؟“ باہر سے اماں نے آواز دی تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

”کھانا تو کھا لے آتے ہی پڑ گئی ہے۔ صبح کی بھوکی خالی پیٹ پڑی ہے۔ غنی بھی مصروف ہیں تو خود ہی اٹھ کر گرم کر لے۔“

”نہیں اماں! بھوک نہیں ہے۔ بس چائے پیوں گی۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر بنا لوں گی۔“

”اے رنی! رنو! بہن کو چائے تو بنا دے۔ تھکی ہوئی آئی ہے۔“

”اچھا اماں۔“

رنو اٹھ کر باورچی خانے کو چل دی تو ایک بار پھر آسیہ کا ذہن بھٹکنے لگا۔

ابا ایک معمولی کلرک تھے اور یہ تو وہی جانتے تھے کہ کس کس کی ضرورتوں کو مار کر، کیسے کیسے جبر کر کے، کہاں کہاں سے ادھار لے کر انہوں نے شہر یار کو پڑھایا تھا۔ کیسے کیسے خواب دیکھے تھے انہوں نے۔ لیکن جب شہر یار اس قابل ہوا کہ ان کے خوابوں کی تعبیر انہیں دے سکے تو اس نے اپنا آپ ہی ان سے الگ کر لیا گل رخ امیر والدین کی بیٹی تھی اور وہ ایک ذہین انجینئر، اس کا مستقبل تابناک تھا۔ گل رخ کے والدین نے اسے گھریا اور وہ ان کے جال میں پھنس گیا۔ گل رخ کے حسن میں جانے کیا طاقت تھی کہ وہ والدین سے اور خود سے کیے ہوئے سارے وعدے بھول گیا۔ کچھ بھی تو یاد نہ رہا اسے۔ ایک بڑے ہوٹل میں اس کی بارات اور دعوت ولیمہ کا فنکشن ہوا اور گھر والوں کو خبر تک نہ ہوئی۔ وہ تو اخبار میں کئی دن بعد شادی کی تصویر دیکھ کر آسیہ نے چپکے سے اماں سے کہا۔

”اماں، یہ شہر یار بھائی نے شاید ہم سے چوری چھپے شادی کر لی ہے۔ اخبار میں تصویر چھپی ہے۔“

”لو، مت مار گئی ہے تمہاری، وہ بے چارہ تو انٹرویو دینے گیا ہے۔ نوکری کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھان رہا ہے۔“ آسیہ نے اخبار اماں کی طرف بڑھا دیا۔

”ہیں! لگتا تو شہر یار ہی ہے۔“ وہ بولیں۔

پھر عینک لگا کر غور سے دیکھا اور بار بار پڑھا ”گل رخ غنی کی شادی شہر یار عظیم سے ہفتہ کے روز ہوئی.....“

”دماغ چل گیا ہے میرا بھی۔ بھی نام تو ہزاروں کے شہر یار عظیم ہوں گے۔ رہی شکل کی بات تو بس اتفاق سے ذرا سی شکل مل گئی ہے۔ ارے میرے شہر یار کی ناک تو اتنی پتلی سی ہے۔ یہ

اتنی چوڑی ناک کہاں ہے اس کی! انہوں نے اخبار آسیہ کو لوٹا دیا۔

پتا نہیں کیوں آسیہ کو یقین تھا کہ وہ نہ ہو یہ شہر یار بھائی ہی ہیں۔ یہ جو کراچی کا بہانہ کر کے، وہ گئے ہیں نا تو اصل میں یہ چکر ہے۔ اور اس کا یقین کچھ غلط بھی نہ تھا۔ پندرہ دن بعد جب وہ لوٹے تو قیمتی سوٹ اور خوشبو میں بے شہر یار کو دیکھ کر آسیہ ٹھٹکی۔ لمحہ بھر غور سے انہیں دیکھا اور پوچھا۔ ”گل رخ بھائی کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہیں۔“

”کم از کم شادی کی اطلاع تو دے دیتے۔“

”بس وہ.....“ انہوں نے اماں کی طرف دیکھا جو منہ کھولے حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”تم۔ تم نے شادی کر لی ہے شہر یار؟ ہمیں بتائے بغیر۔“ بڑی دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

”ہاں اماں۔ دراصل مجھے گل رخ پسند تھی اور پھر اس کے ڈیڈی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے شادی کے بعد امریکہ بھجوا دیں گے۔“

”تمہیں گل رخ پسند تھی تو ہم تمہیں روکتے تو نہیں تھے، پر تم نے ہمیں بتایا ہی نہیں۔“

انہیں یک دم بہت صدمہ پہنچا تھا اور ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

شہر یار سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ صدمے سے سنبھلیں تو انہوں نے گل رخ کے بارے میں پوچھا۔ ”اچھا اب بہو کو گھر کب لا رہے ہو؟“

”گھر! یہاں اس گھر میں؟“ شہر یار کو حیرت سی ہوئی۔ ”اماں! وہ یہاں کیسے آ سکتی ہے؟

یہاں تو ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی۔ یہ گھر اس کے رہنے کے قابل کہاں ہے۔ وہ تو کہہ رہی تھی کہ

اس تنگ گلی میں جہاں تمہارا گھر ہے، اتنا تعفن ہے کہ میرا تو دم ہی گھٹ جائے گا۔“

”آپ بھی تو اسی تنگ گلی کے رہنے والے ہیں۔ یا آپ سے تعفن نہیں آیا انہیں؟“

آسیہ نے سوچا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”پھر بہو کہاں ہے؟“ اماں نے دبے دبے لفظوں میں پوچھا۔

”وہیں، ڈیڈی کے گھر میں۔ ابھی ہم ادھر ہی رہیں گے۔ ویسے گل کے ڈیڈی نے ایک

کوٹھی جہیز میں دی ہے لیکن امریکہ سے واپس آ کر ہی ہم سیٹل ہوں گے۔ میں ملنے آتا رہوں گا اور

خرچ کے لیے ہر ماہ کچھ رقم بھیج دیا کروں گا۔“

سب خاموش بیٹھے رہے صرف آسیہ گیٹ تک اسے چھوڑنے آئی۔

”آپ نے کچھ خیال نہیں کیا۔ ابا نے کتنی محنت و مشقت سے آپ کو پڑھایا ہے

اور.....“

”یہ فرض تھا ان کا۔ احسان تو نہیں کیا انہوں نے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا اور آسیہ کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔

ابا کو پتہ چلا تو وہ ڈھسے سے گئے۔ وہ تو سوچ رہے تھے اب باقی سب کی ذمے داریاں شہریار سنبھال لے گا لیکن شہریار تو انہیں اکیلا ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس دکھ نے انہیں بیمار کر ڈالا۔ اماں تو ہر آہٹ پر چونک چونک جاتی تھیں مگر نہ شہریار آیا اور نہ ہی اس کے پیسے۔ آسیہ نے خود ہی ایک روز غنی صاحب کے گھر فون کیا تو پتا چلا کہ اسے تو امریکہ گئے بھی دو ماہ ہو گئے ہیں۔ تب بی۔ اے کے بعد اس نے ایک آفس میں نوکری کر لی اور ابا کا سہارا بن گئی۔

”آپا چائے لے لو۔“ رفعت نے چائے میز پر رکھی تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھی اور ایک نظر اس کے سر اچھے پر ڈالی۔ اس کا دوپٹا کئی جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔

”اگلی تنخواہ ملتے ہی سب سے پہلے تم دونوں کا یونیفارم بنواؤں گی۔ تم یاد دلادینا۔“ ارے آپ فکر نہ کریں آپا۔ اب تو شہریار بھائی آئیں گے نا تو مزے آجائیں گے۔ یونیفارم ہی نہیں میں اور غنی جاپانی کریپ کے بھی دو دو سوٹ لیں گے۔“

”رنی! شہریار بھائی نے سات سال تک تو خبر نہیں لیں اب کیا آئیں گے؟“ ”آپا! تھوڑی دیر تو خوش ہو لینے دیں نا۔“ رفعت نے منہ بسورا۔ ”سات سال سے تو وہ امریکہ میں تھے، خیر کیسے لیتے؟“

عفت بھی چائے کی پیالی اٹھا کر وہیں آ گئی۔ ”ہاں امریکہ سے تو نہ کبھی کسی کا خط آیا ہے نہ کوئی اطلاع۔“ ”چھوڑیں بھی آپا، غلطی ہو جاتی ہے نا اور پھر وہاں کی زندگی تو اتنی کلرفل اور تیز ہے کہ کسی کو یاد کرنے اور خط لکھنے کا وقت کہاں ملتا ہوگا۔“

”ہاں تم تو امریکہ سے ہو کر آئی ہو سب پتا ہے تمہیں۔“ منیر بھی ہنستا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا تو آسیہ نے پیار سے اسے دیکھا۔ مونو! میرے اچھے بھائی تم شہریار کی طرح نہ کرنا۔ ہمیں چھوڑ کر مت جانا۔“

”آپا! منیر نے اپنا بازو اس کے گلے میں ڈال دیا۔ آپ شہریار بھائی سے میری سفارش

کر دیجئے گا۔“

”کھن لگنا شروع ہو گیا نا۔“ غنی نے اسے چھیڑا۔

”ہاں! تمہیں کیا؟“ میں تو اسکوڑلوں گا:

”میں اور کاواسا کی۔“

”اک دو بجے کے ساتھی اونچے نیچے رستوں پر۔“

وہ اشتہار کی نقل کرنے لگا تو آسیہ کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ آ گئی۔

”کیا شہریار بھائی اسے اسکوڑ لے دیں گے؟“ رنی نے پوچھا۔

”کیوں نہیں لے دیں گے؟ ایک ہی تو بھائی ہوں میں ان کا۔“

باہر سے ابا کے کھانسنے کی آواز آ گئی۔

”ابا کی کھانسی تو ٹھیک ہونے میں نہیں آرہی اور یہ سینے کا درد تو جان ہی لے لیتا ہے ان

کی۔“ اس نے سوچا۔

”شہریار آجائے تو ابا کو کسی اسپیشلسٹ کو دکھالیں گے۔ اوہ نان سینس۔“ وہ خود ہی اپنی

سوچ پر شرمندہ ہو گئی۔ میں بھی ان کی طرح سوچنے لگی ہوں۔ حد ہے۔“

وہ انہیں وہیں چھوڑ کر ابا کو دیکھنے کے لیے باہر چلی آئی۔

جب سے شہریار کے آنے کی خبر آئی تھی، گھر میں ہر وقت اسی کا ذکر رہنے لگا تھا۔ اٹھتے

بیٹھتے، کھانا کھاتے، کام کرتے ہوئے، سب کسی نہ کسی بہانے اس کا ذکر لے بیٹھتے۔ پھر تقریباً

روزانہ ہی اس کے استقبال کے لیے کسی نہ کسی انداز میں تیاری ہوتی۔

گھر میں صرف تین کمرے تھے، دو چھوٹے اور ایک بڑا۔ ایک چھوٹے کمرے میں

اماں، ابا اور بے بی تھے۔ بڑے کمرے میں غنی، رنی اور منیر جب کہ دوسرا چھوٹا کمرہ آسیہ کے پاس

تھا۔ آسیہ سے پہلے وہ شہریار کے پاس تھا اور شہریار کے جانے کے بعد آسیہ نے وہاں ڈیرا جمالیا تھا

لیکن اب اماں کے اصرار پر اس نے شہریار اور گل رخ کے لیے کمرہ خالی کر دیا تھا اور خود دوسرے

کمرے میں اٹھ آئی تھی جبکہ اماں اور ابا بھی بڑے کمرے میں ہی آ گئے تھے اور ان کے کمرے کو

عارضی طور پر ڈرائنگ روم کی شکل دے دی گئی تھی۔ ڈرائنگ روم کے لیے صوفہ غنی صاحب کے گھر

سے آیا تھا۔ سنٹر ٹیبل چائے فیروزہ سے مانگی گئی تھی۔ کشن خالہ نازیہ سے لے لیے گئے تھے، اماں

نے محلے بھر سے مانگ مانگ کر چیزیں اکٹھی کر لی تھیں۔ آسیہ کو بڑی الجھن ہوتی۔ کئی بار تو وہ ان

سے الجھ بھی پڑی تھیں۔ ”آخر اس جھوٹی نمائش کی کیا ضرورت ہے؟ کیا شہریار بھائی کو نہیں پتا گھر

کی حالت کا؟ جب وہ یہاں سے گئے تھے تو دو وقت کی دال روٹی بھی مشکل سے چلتی تھی۔“
 ”ارے میں تو یہ سب گل رخ کے لیے کر رہی ہوں۔“ کیا پتا سب کے دن پھر جائیں۔“

”ہاں تو اور کیا۔“ ابا بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے۔

”میں نے تو سوچا ہے۔ شہریار سے کہوں گا، مجھے بیس پچیس ہزار ادھار دے دے، چھوٹی موٹی دکان کر لوں گا۔“

”اور میں۔“ بے بی اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں جھپکاتی۔ ”میں بھیا سے کہوں گی مجھے گڑیا ولادیں۔ وہ نیلی آنکھوں والی سوتی جاگتی گڑیا جو حیرا کے پاس بھی ہے۔“

”ارے بھئی، گڑیا تو بھیا وہاں سے لائیں گے تمہارے لیے۔ امریکہ سے۔“
 ”جی!“ اس کے گالوں کے ڈمپل گہرے ہو جاتے اور وہ بڑے اشتیاق سے رفعت کو دیکھتی۔ ”آپ کے لیے بھیا کیا لائیں گے وہاں سے؟“

”پتا نہیں۔“ رفعت کہتی ”مگر کچھ نہ کچھ تو بھیا لائیں گے ہی نا!“

اور آسیہ چڑ سی جاتی۔ آخر یہ سب لوگ اتنے اکسانڈ کیوں ہو رہے ہیں۔ مانا شہریار بھائی نے آنے کا لکھا ہے لیکن ضروری تو نہیں کہ سب کچھ ویسا ہی ہو جیسے یہ سب سوچ رہے ہیں اور یہ صرف انہی پر ہی موقوف نہیں تھا۔ پورا محلہ ہی ان کے ساتھ بے تاب ہو رہا تھا۔
 ”بھئی عظیم! میرے لیے دس بارہ سگریٹ کی ڈبیاں ضرور رکھ لیتا۔“ غنی صاحب یاد دلاتے۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ ابا وعدہ کرتے۔ آخر ادھر سے صوفہ آیا تھا۔

”شہریار کو کہنا بہن! عامر کے لیے بھی کچھ کرے۔ کسی طرح امریکہ بھیجوا دے۔ بس وہاں چلا جائے تو گرین کارڈ خود ہی حاصل کر لے گا۔ سنا ہے وہ کاغذی شادیاں ہوتی ہیں اور پکا ویزا لگ جاتا ہے۔ چاچی فیروزہ دن میں ایک بار ضرور دیوار پر سے یاد دلاتیں۔

خالہ نازیہ اور ماسی حلیمہ کو تو انگلش سویٹر چائیں تھیں وہ بھی اماں کو رنگ کے بارے میں تاکید کرتی رہیں اور آسیہ کڑھتی رہتی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ سب کی آنکھوں سے یہ خواب نوچ کر پھینک دے جن کی تعبیر مشکوک تھی۔ پتا نہیں، کیوں اسے شہریار کا یقین نہیں تھا۔ سات سال تک ان کی یاد نہیں آئی تھی تو اب کیسے؟ مگر شہریار کی آمد کا یقین نہ ہونے کے باوجود اماں کے اصرار پر اس نے بچا کر رکھی ہوئی ساری رقم اماں کے ہاتھ پر رکھ دی حالانکہ کتنے مہینوں سے وہ بچت کر

رہی تھی کہ منیر کا میٹرک کا رزلٹ آنے والا تھا، اس کی کتابوں اور داخلے کے لیے سب سے چھپا کر اس نے یہ رقم جمع کی تھی اور سوچ رکھا تھا کہ کسی اہم ضرورت میں بھی وہ یہ رقم خرچ نہیں کرے گی مگر اماں کی مایوس صورت اس سے دیکھی نہ گئی جو شہریار اور گل رخ کے لیے کچھ اچھی چیزیں پکانا چاہتی تھیں۔ گھر میں شاید سب سے زیادہ خوش اماں ہی تھیں۔ یوں دوڑ دوڑ کر کام کر رہی تھیں جیسے ان کے جسم میں بجلی سی بھری ہو۔ صبح ہی صبح انہوں نے کوفتے اور کباب بنا کر رکھ دیئے تھے، مرغ بھون لیا تھا۔ کسٹرڈ بنا کر غنی صاحب کے فرنیچ میں ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھوا دیا تھا۔ اماں کے اصرار کی وجہ سے وہ آفس سے جلدی آگئی تھی۔ بے بی اور رنی وغیرہ نے تو چھٹی ہی کر لی تھی۔ وہ دیر ہو جانے کے خیال سے رکشے پر آئی تھی لیکن شہریار بھائی ابھی نہیں آئے تھے اور سب انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ رکشے پر چھ روپے خرچ کر دیئے۔ اماں سب سے زیادہ مضطرب اور بے چین تھیں۔ کبھی باورچی خانے میں جاتیں اور کبھی غنی صاحب کے گھر سے آئے ہوئے صوفے کو اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھتیں جس کے سپرنگ ٹوٹے ہوئے تھے اور جو بیٹھنے پر صدائے احتجاج بلند کرتا تھا۔ یقیناً غنی صاحب نے اسے نیلام سے سستے داموں خریدا ہوگا۔
 ”اے رفو!“ اماں ماتھے کا پسینہ پونچھتیں۔ ”تم نے اچھی طرح خط پڑھا تھا نا! آج ہی کے دن آنے کے لیے لکھا تھا۔“

”جی اماں!“ وہ کئی بار بتا چکنے کے باوجود پھر یقین دلاتی۔

انتظار کرتے کرتے شام ہوگئی۔ چاچی فیروزہ کئی بار دیوار پر سے جھانک چکی تھیں۔ غنی صاحب کا پوتا دو بار بہانے بہانے سے چکر لگا گیا تھا مگر آنے والا نہیں آیا تھا اور جب آسیہ کو یقین ہو گیا کہ اب وہ نہیں آئے گا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ منیر اور رنی ایک ساتھ دروازے کی طرف دوڑے۔ اماں بھی ان کے پیچھے تھیں۔ وہ خود بھی بے اختیار کھڑی ہوگئی تھیں۔ ابا جاتے جاتے پلٹ آئے۔ ”کیا پتا کوئی اور ہو۔“

لیکن وہ شہریار ہی تھا۔

پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور صحت مند ہو رہا تھا۔ چہرے پر خوشی اور مسرت تھی اور ہونٹوں پر ایک پرغور سی مسکراہٹ۔

اماں نے بے اختیار اس کی بلائیں لیں۔ ابا گلے سے ملے۔ منیر، بے بی اور غنی نے سلام کیا۔ ”میٹھو بیٹا۔۔۔۔۔۔ میٹھو۔ ارے بہو کہاں ہے؟ کہاں چھوڑ آئے اسے؟“ اماں کو ہی سب سے پہلے خیال آیا۔

”اور آپ کا سامان؟“ منیر نے پوچھا۔
”ہوٹل میں ہے۔“

”مگر وہاں کیوں چھوڑ آئے ہو؟“ اماں نے پوچھا۔ ان کا جوش مدھم پڑ گیا۔
”ہوٹل میں ہی رہیں گے دو تین دن۔ گل کو اپنی دوستوں سے ملنا ہے اور کچھ کام ہے۔
مجھے یہاں دراصل گل کے ڈیڈی نے یہاں والا بنگلہ فروخت کر دیا تھا اور اسلام آباد سیشن ہو گئے
تھے۔ اس لیے ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا۔“
”مگر ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی، اپنا گھر جو ہے یہاں۔ میں نے تو بہو کے
لیے کمر بھی ٹھیک کروا دیا تھا۔“

”کمال کرتی ہیں اماں آپ! وہ تو یہاں ایک گھنٹہ بھی نہیں رہ سکتی چہ جائیکہ تین دن۔“
”بہو کو ملانے ہی آتے شہر یار۔“ اماں نے مری مری آواز میں کہا۔
”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”کیسے رہے تم شہر یار! امریکہ میں تو بڑی تنخواہیں ملتی ہیں۔“
”ہاں! لیکن مہنگائی بہت ہے۔ جتنا کمایا خرچ ہو گیا۔ کچھ بھی بچت نہیں ہوتی وہاں۔ اسی
لیے تو گل کے ڈیڈی نے یہاں بلوالیا ہمیں۔ اب یہاں ان کے ساتھ برنس کروں گا۔“
ابا ہولے سے کھانس کر چپ ہو رہے۔ شاید بات کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی
موضوع نہیں رہا تھا۔

اماں گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے انھیں۔ ”کھانا گرم کروں۔ چلو رنی اٹھو، بھائی کے لیے
کھانا لگاؤ۔“

”نہیں نہیں اماں! کھانا تو میں نے ہوٹل میں ہی کھا لیا تھا۔ پھر اب تو کوئی وقت نہیں
ہے کھانے کا۔ رات کا کھانا تو گل کی ایک دوست کے گھر ہے۔“

”چائے؟“ رفعت نے پوچھا۔

”نہیں چائے پی کر آیا ہوں۔“

”آسیہ نے ایک نظر سب کے پچھلے چہروں پر ڈالی۔ بے بی تو روہانسی ہو رہی تھی اور
فراک کا دامن بار بار انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔ شہر یار نے ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا اور
نہ ہی یہ کہا تھا۔“ ارے تم اتنی بڑی ہو گئی ہو۔ میں تو تمہیں اتنا سا چھوڑ کر گیا تھا۔“

سب خاموش بیٹھے تھے اور لاشعور میں چھپی ہوئی خواہشیں جو شہر یار کے آنے کا سن کر

شعور میں آ گئی تھیں، اب شعور کی دیواروں سے سرخسٹیاں پھٹ کر رو رہی تھیں اور آسیہ کو ان کے بین
صاف سنائی دے رہے تھے لیکن قصور بھی تو ان سب کا تھا جو کھولے سکے کو جیب میں ڈال کر شاپنگ
کرنے چلے تھے۔

”رنی آپا کہتی تھیں۔ بھائی جان امریکہ سے تمہارے لیے گڑیا لائیں گے۔“ بے بی سے
صبر نہ ہو سکا تو اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

شہر یار نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”وہاں ہم نے کوئی فضول شاپنگ نہیں کی۔ دراصل
ڈیڈی ہمارے لیے گھر بنا رہے تھے، سارا پیسا تو گھر بننے میں ہی لگتا رہا۔ گل چاہتی ہے کہ اس کا
گھر بہت خوبصورت اور منفرد ہو۔ اسے پرانی چیزوں سے عشق ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک
نظر بڑے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ لکڑی کے منقش ٹکڑوں سے بنا ہوا خوبصورت
دروازہ۔ شاید اس کے پردادا کے زمانے کا تھا۔ ابا بتاتے تھے کہ اس زمانے میں سال سال تک
مستری ایک ایک دروازہ بناتے رہتے تھے۔

”ابا، میں چاہتا ہوں، یہ دروازہ یہاں سے اکھڑا کر اپنے گھر میں لگواؤں۔ گل تو پاگل
ہو جائے گی اسے دیکھ کر۔“

”تو یوں کہو۔ اس لیے آئے ہو۔ میں بھی سمجھ رہا تھا، سات سالوں بعد ہماری یاد کیوں
آئی ہے؟“ ابا نے کھانٹے کھانٹے اس کی طرف دیکھا۔

”کیوں، کیا میرا حق نہیں ہے اس گھر پر؟“ اصولاً تو میں آدھے گھر کا مالک ہوں مگر میں
صرف یہ دروازہ مانگ رہا ہوں۔ کل میں اپنے منیجر کو بھجوا دوں گا۔ وہ یہ دروازہ اکھڑا کر لے جائے
گا اور یہاں دوسرا لگوا دے گا۔“
”اچھا۔“

وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

اماں خالی خالی نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہیں..... سب ساکت بیٹھے تھے۔ آسیہ کا
دل چاہا کہ وہ زور زور سے قہقہے لگائے اور کہے، دیکھا، میں نہ کہتی تھی۔ لیکن پھر اماں کا زرد اور کمکھلا
ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ان کے قریب ہو گئی اور ہولے ہولے ان کا ہاتھ سہلانے لگی۔

بہائی رہی۔

جب وہ کچھ اور بڑا ہوا تو اپنی گلی سے باہر جا کر بوٹ پالش کرنے لگا۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ ایک آنے کی کھٹی مٹھی گولیاں لے کر کھائے لیکن ہر بار اس نے اپنے دل کو مار لیا کیونکہ اسے اماں کی باتیں یاد آ جاتی تھیں اور وہ سارے پیسے مٹھی میں بھینچ کر گھر لے آتا اور ماں کے حوالے کر دیتا۔ خود بخود ہی وہ بہت سنجیدہ اور عقلمند ہو گیا تھا۔ اس نے کبھی کسی چیز کے لیے ضد نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی اس کا دل گلی میں بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے چلا تھا۔ صبح ہی وہ پالش اور برش والا تھیلا اٹھا کر چلا جاتا اور شام کو تھکا ماندا آتا تو سو جاتا۔ اسے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ اس کی عمر کے بچے کیا کیا کھیل کھیلتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اندر چار پائی پر لینا گلی میں ان کے کھیلنے اور شور مچانے کی آوازیں سنتا رہتا لیکن اٹھ کر باہر نہ جاتا۔

کچھ اور بڑا ہوا تو ماں نے اسے ایک پٹرول پمپ پر نوکر کروا دیا لیکن یہ بڑی سخت نوکری تھی۔ کڑکڑاتی جھوپ میں بھاگ بھاگ کر گاڑیاں صاف کرتا اور پٹرول پمپ کے مالک کی گالیاں سنتا۔ اس لیے وہ وہاں سے ”عظیم ریسٹونٹ“ میں چلا گیا۔ ریسٹورنٹ کے مالک عظیم انصاری بڑے ہمدرد اور اچھے انسان تھے چنانچہ وہ تب سے لے کر اب تک یہیں تھا۔ ماں کی اور اس کی مزدوری مل کر اچھی خاصی ہو جاتی تھی۔ ماں ہر ماہ چند روپے چھیمہ آپا کے جہیز کے لیے بچا بھی لیتی تھی۔ ماں بھی محنت کرتی تھی لیکن اس کی حیثیت گھر کے کماؤ مرد کی سی تھی۔ وہ شام گئے تھکا ہارا آتا تو کوئی بہن اسے پنکھا جھلاتی، کوئی کھانا گرم کر کے لاتی، کوئی جلدی جلدی اس کا بستر بچھاتی اور ماں پاس بیٹھ کر اسے دن بھر کی روداد سناتی اور ہر مسئلے پر اس سے رائے لیتی۔ لیکن دین کا مسئلہ، بیٹیوں کی شادی کا قصہ، وہ بڑے دھیان سے ایک مدبر اور ذمے دار مرد کی طرح ماں کی ساری باتیں سنتا اور سچ سچ میں مشورے بھی دیتا جاتا۔ ماں گھر کے اس ننھے سربراہ کی بات پلو سے باندھ لیتی اور وہی کرتی جو وہ کہتا۔

چھیمہ کا رشتہ بھی اس نے سلطان کی مرضی سے ہی طے کیا تھا۔ نصیر کی محلے ہی میں پھلوں اور سبز بوں کی دکان تھی۔ اچھا تختی لڑکا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ چھیمہ کو بھوکا نہیں مرنے دے گا۔ ماں نے چار جوڑے کپڑے اور دس پندرہ برتن اکٹھے کر رکھے تھے اور زیور کے نام پر بس ایک دو تولے کے جھمکے تھے جو اس کے جہیز کے تھے اور اس نے چھیمہ کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ چار آدمیوں کے کھانے کا بندوبست بھی ہو گیا تھا۔ انصاری صاحب نے پانچ سو روپے سلطان کو دیئے تھے کہ وہ تیس روپے ماہوار کے حساب سے اس کی تنخواہ میں سے کاٹ لیں گے۔ ماں نے جو بچت

انسان یا درندہ

”ہاں سلطان! تو نے بات کی پھر انصاری صاحب سے؟“ اماں نے کھانا اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

”نہیں اماں۔ آج انصاری صاحب بہت مصروف تھے۔“

لائسن کی مدہم روشنی میں انہوں نے اس کے متفکر چہرے کو دیکھا۔ تھکا ماندہ مضطرب چہرہ گیارہ برس کی عمر میں ہی چالیس سالہ تھکے ہوئے آدمی کا چہرہ۔ ان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اگر فضل حسین نہ مرنے تو آج سلطان جہانگیر متفکر ہونے کی بجائے کتابیں کھولے بیٹھا ہوتا یا پھر بچپن کی بے فکر نیند سو رہا ہوتا مگر اب تو فضل حسین مر گیا تھا اور چار جوان بہنوں کی ذمہ داری اس کے نازک کندھوں پر آ پڑی تھی۔ وہ بھائی تھا۔ بلا سے چھوٹا ہی سہی۔ اور یہ بات فضل حسین کے مرتے ہی اماں نے اس کے کان میں ڈالنا شروع کر دی تھی کہ وہ اس گھر کا اکلوتا مرد ہے اور ان کے کندھوں پر بہت بوجھ ہے حالانکہ اس وقت وہ ابھی چھ برس کا بھی نہیں ہوا تھا۔

کتنی منتوں اور مرادوں سے چار بہنوں کے بعد وہ پیدا ہوا تھا اور فضل حسین نے اس کی پیدائش پر بساط بھر خوشیاں منائی تھیں۔ پورے محلے میں بتائے بانٹے تھے اور داتا دربار پر دیگ چڑھائی تھی اور سوچا تھا کہ وہ اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنائے گا اس نے اس کا نام بھی سلطان جہانگیر رکھا تھا تا کہ وہ بھی بادشاہ جہانگیر کی طرح نامور ہو لیکن ابھی وہ چھ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ فضل حسین ٹرک کے نیچے آ گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ خواب بھی کچلے گئے جو اس نے سلطان جہانگیر کے لیے دیکھے تھے۔ سلطان جہانگیر گلے میں بستہ ڈال کر اسکول جانے کی بجائے گلی میں ٹافوں اور پکڑوں کا تھال لے کر بیٹھ گیا اور ماں دروازے کی اوٹ سے اسے دیکھ دیکھ کر آنسو

کر رکھی تھی۔ اس میں سے نصیر کا اور اس کی ماں کا جوڑا آ گیا تھا لیکن اچانک ہی نصیر کی ماں نے ”بالیوں“ کا مطالبہ کر دیا تھا۔

بس بہن میرا تو ایک ہی بیٹا ہے سوچا تھا اسے بیاہوں گی تو جوڑے بالے ملیں گے۔ جہیز کے نام پر بھی جھیمہ کا کچھ نہیں۔ ہمیں نہیں پروا اپنی بیٹی ہے۔ پر بہن میں تو بالیاں ضرور لوں گی۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ ماں بھی سمجھی سی ہنسی ہنس دی تھی۔

لیکن اب بالیاں کہاں سے آئیں ان کے لیے وہ روز سلطان سے کہتی ”سلطان! انصاری صاحب سے ہزار روپا اور ادھار مانگ لے۔ ہولے ہولے اتار دیں گے۔ میں دو تین گھروں کا اور کام اٹھالوں گی۔ بس ایک بار جھیمو اپنے گھر کی ہو جائے۔“

سلطان نے ابھی تک انصاری صاحب سے بات ہی نہیں کی تھی۔ ماں نے ٹھنڈی سانس لے کر سلطان کی طرف دیکھا جو کھانا اسی طرح سامنے رکھے متفکر سا بیٹھا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر لکیروں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی زیادہ سے زیادہ گیارہ برس کی۔ لیکن ذمے داریوں کے بوجھ نے اس کے کندھوں کو جھکا دیا تھا اور اس کے چہرے کی معصومیت چھین لی تھی۔ وہ گیارہ برس کی عمر میں ہی پختہ عمر کا مرد لگتا تھا۔

ماں کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ اس نے اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹالیں۔

”تو پھر کب بات کرے گا۔ دن تو بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔“

”کیا نصیر کی ماں کی ”بالیاں“ بہت ضروری ہیں ماں“ اس نے رک رک کر پوچھا۔

”ہاں سلطان“ ماں نے پھر ٹھنڈی سانس لی ”ورنہ ساری عمر جھیمو کو طعنہ ملے گا جہیز بھی تو کچھ نہیں ہے۔ جہیز نہ بھی ہو، پر ساس کا تو جوڑا اور کانوں ہاتھوں کا کوئی زیور ضرور ہونا چاہیے۔ زیادہ بھاری نہ سہی پر یہی تین چار ماشے کی تاریں سی ہی بن جائیں نام تو ہوگا کہ بالیاں ہیں۔“

اس کا دل چاہا، وہ ماں سے کہہ دے کہ ”بالیوں کا خیال چھوڑ ہی دے لیکن پھر کچھ کہہ نہ سکا اور سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔

”مجھے تو ڈر ہے اگر بالیاں نہ ہوئیں تو کہیں نصیر کی ماں رشتہ ہی نہ توڑ دے۔“

منہ کی طرف جاتا اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ اس نے نوالا واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ اور بولا ”رشتہ توڑ دے گی؟“

”کیا پتا، توڑ ہی دے۔“

”پھر ایسا کر ماں جھیمے اسے دے دے۔“

”جھیمے اسے دے دوں!“ ماں نے تڑپ کر اسے دیکھا ”ایک ہی تو زیور ہے جھیمو کا جھیمے میرے جہیز کے تھے سلطان نے جھیمو کے لیے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔“

”پھر؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے دور بیٹھی جھیمو کی طرف دیکھا۔ لالین کی زرد سی روشنی میں اس کا چہرہ اسے بڑا زرد سا لگا جیسے جھیمے دیئے جانے کے خیال سے وہ اداس سی ہو گئی ہو۔

”تم ایک بار انصاری صاحب سے کہو تو سہی سلطان“

”اچھا کہوں گا۔“

اس نے کھانا ایک طرف کر دیا۔

اور وہ یزدانی صاحب بھی تو ہیں نا۔ تو ان کی بڑی تعریفیں کرتا ہے۔ ان سے بات کرنا چھ سات ماہ کے لیے ادھار دے دیں۔“

”اچھا“ اس نے مری مری آواز میں کہا اور اٹھ کر بستر پر لیٹ گیا۔

بلاشبہ یزدانی صاحب بہت اچھے آدمی تھے اور اس سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ تھے بھی وہ بڑے ہمدرد، ہر وقت ہر ایک کی مدد اور خدمت کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چمکتی آنکھوں اور سیاہ گھنی مونچھوں والے یزدانی صاحب اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ اکثر چند ادیبوں یا شاعروں کے ساتھ ہوتے ان شاعروں اور ادیبوں میں لمبی لمبی بحثیں ہوتیں۔ انصاری صاحب اکثر اسے کہتے ”یہ لوگ قوم کا فخر ہوتے ہیں سلطان جہانگیر ان کی باتیں دھیان سے سنا کر۔ تیرے کام آئیں گی۔“

اور وہ بڑے دھیان سے ان کی باتیں سنتا اگرچہ اس کے پلے کم ہی پڑتی تھیں لیکن وہ انہیں سن کر سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یزدانی صاحب ہمیشہ انسانیت کی باتیں کرتے تھے۔ اونچی اونچی ناقابل فہم باتیں۔ انہیں غریبوں سے بڑی ہمدردی تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس سارے معاشی نظام کو ہی بدل کر رکھ دیں۔ کئی بار انہوں نے اسے تیزی سے میزیں صاف کرتے اور آرڈر سرور کرتے دیکھ کر بڑے دل گیر لہجے میں کہا تھا۔ ”اب سلطان جہانگیر کو دیکھو جس کے ہاتھ میں کتابیں اور قلم ہونے کے بجائے جھاڑن ہے۔ کاش میرے اختیار میں ہوتا تو میں پورے ملک کے بچوں کے ہاتھوں میں کتابیں اور قلم پکڑا دیتا۔“

میزیں صاف کرتے اس کے ہاتھ لمحے بھر کے لیے رک جاتے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے صاف ستھرے یونیفارم پہنے، بستے گلے میں لٹکائے، شگفتہ چہروں کے ساتھ اسکول جاتے بچے آ جاتے۔ صبح ریسٹورنٹ آتے ہوئے وہ انہیں دیکھتا۔ وہ خوش خوش اسکول جاتے کتنے

خوبصورت لگتے تھے۔ کئی دفعہ اس نے سوچا تھا کہ اگر وہ بھی نیلی نیکر اور سفید شرٹ پہنے، بستہ گلے میں لٹکائے اسکول جاتا تو کیا وہ بھی انہی کی طرح خوبصورت لگتا؟ پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس خواہش کو اندر ہی اندر کچل کر بھاگ بھاگ کر آؤر وصول کرنے لگتا اور اسے کچھ یاد نہ رہتا سوائے اس کے گھر میں آنا نہیں ہے۔ چھیمو آپا کا دوپٹا پھٹا ہوا ہے منی باجی کی قمیض بس جواب دینے ہی والی ہے اور چھوٹی آپا کے پاس جوتا نہیں ہے۔

اور یزدانی صاحب کہتے رہتے۔ ”یہ کتنی بڑی بد نصیبی ہے کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہمارے مستقبل کے امین ڈاکٹر اور انجینئر بننے کی بجائے بھکاری اور مزدور بن جاتے ہیں۔“

ہاں یزدانی صاحب ضرور میری مدد کریں گے، اس نے کروٹ بدلی..... چھیمو لائین کی مدھم روشنی میں اپنے سرخ دوپٹے پر ستارے ٹانگ رہی تھیں موٹے موٹے سنہرے ستارے جھللا رہے تھے یزدانی صاحب اتنے اچھے تو ہیں لیکن میں ان سے کہوں گا کیا؟ یہ کہ میری چھیمو آپا کی شادی ہے اور مجھے اس کی ساس کے لیے بالیاں بنوانا ہیں اور اماں کہتی ہے کہ اگر بالیاں نہ ہوئیں تو شاید..... شاید نصیر سبزی والے کی ماں رشتہ ہی توڑ دے جبکہ..... چھیمو آپا تو سرخ دوپٹے پر ستارے بھی ٹانگ رہی ہیں ممکن ہے یزدانی صاحب بالیاں ہی خرید کر لادیں۔ اتنے ہمدرد تو ہیں، یہ سوچتے ہوئے اسے کل کی باتیں یاد آ گئیں کل ہی تو وہ بڑے کرب سے انصاری صاحب سے کہہ رہے تھے۔

”انسانیت تو ہم میں بالکل نہیں رہی انصاری صاحب! ہم بڑے مادیت پرست ہو گئے ہیں اور اس مادیت پرستی نے ہمیں ظالم بنا دیا ہے۔ اتنا ظالم کہ ہم کسی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں۔ اتنا نہیں ہوتا کہ اس لب دم آدمی کو ہسپتال میں پہنچا دیں۔ ابھی پرسوں کی بات ہے، اخبار میں لکھا تھا کہ پرانی سڑک پر کوئی ٹرک ایک اسکوٹر سوار کو ٹکرا کر چلا گیا اور بے چارہ اسکوٹر سوار ساری رات وہیں سڑک پر پڑا رہا۔ صبح ایک اخبار فروش نے اسے دیکھا اور تھانے میں اطلاع دی..... ایکسیڈنٹ کے وقت سے صبح تک نہ جانے کتنے لوگ وہاں سے گزرے ہوں گے۔ کتنی گاڑیاں وہاں سے گزری ہوں گی لیکن ہمارے دل اتنے پتھر ہو چکے ہیں کہ ہم..... ان کی آواز بھرا گئی۔“ کیا معلوم، وہ زندہ ہوتا اور بروقت طبی امداد ملتی تو بچ جاتا لیکن انسانیت..... انسانیت تو مر گئی ہے۔ دم توڑ رہی ہے سسکیاں لے رہی ہے۔ ہم انسان نہیں درندے بن گئے ہیں۔ انصاری صاحب درندے۔“

”ہاں یزدانی صاحب“ ہم تو ایکسیڈنٹ میں زخمی ہونے والوں کو ہسپتال پہنچانے کے

بجائے ان کے پرس اڑانے کی فکر میں رہتے ہیں ابک بار میرا ایکسیڈنٹ ہوا تو کسی نے میری انگوٹھی ہی اتار لی۔

”ہاں یار انصاری۔ میں نے کہا نا ہم انسان کہاں رہے ہیں، درندے بن گئے ہیں۔“ باتیں کرتے کرتے انہوں نے قریبی میزیں صاف کرتے سلطان کی طرف دیکھا ”سنو سلطان جہانگیر! تم انسان بننا۔ درندے مت بننا۔ یہ دنیا تو درندوں سے بھری ہوئی ہے۔ انسان کم ہوتے جا رہے ہیں۔“

”جی یزدانی صاحب“ اس نے ان کی بات کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔ ”تم جاگ رہے ہو سلطان؟“ چھیمو دوپٹا ہاتھ میں پکڑے پکڑے اس کی چارپائی کے قریب آ گئی۔

”ہاں۔“ سلطان نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ ”تو..... تو فکر نہ کر سلطان۔ مجھے تو جھمکے پہننے کا کوئی شوق نہیں ہے بس یہ جھمکے ہی دے دیں گے۔“

”چھیمو آپا!“ گیارہ سالہ سلطان کی آنکھیں جانے کیوں نم ہو گئیں۔ ”میں تو کوئی فکر نہیں کر رہا۔ یزدانی صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ وہ ضرور ہزار ڈیڑھ ہزار ادھار دے دیں گے اور پھر میں اور اماں مل کر یہ ادھار اتار دیں گے۔“

”لیکن تو جاگ کیوں رہا ہے؟“

”بس ایسے ہی نیند نہیں آرہی تھی۔“

پر پہلے تو کھانا کھاتے ہی سو جاتا تھا نا۔

”تھکا ہوا ہوتا تھا نا۔ آج زیادہ کام نہیں تھا۔“

”سلطان!“ چھیمو اس کی چارپائی کے قریب بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ ”تو کتنی محنت کرتا ہے چندا۔ اگر اب زندہ ہوتے تو تو اسکول میں پڑھتا..... ہیں نا؟..... ابا کہتے تھے، تجھے بڑا افسر بنائیں گے۔ میں نے تو اماں سے بہت کہا تھا، مجھے اور منی کو کہیں کسی کوٹھی میں نوکر رکھوا دے ہم سلطان کو پڑھائیں گے اور بڑا افسر بنائیں گے لیکن اماں کہتی تھی زمانہ خراب ہے۔ پھر تمہارا بھائی ہے تمہارا سہارا۔“

”ہاں..... ہاں اماں ٹھیک کہتی تھیں۔“ سلطان کی آواز بھرا گئی۔

”پر میرا بڑا دل چاہتا تھا کہ تو پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنے لیکن..... کاش ہم چاروں نہ ہوتیں تو

پھر شاید اماں، وہ چار پائی کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگی۔

”بھیمو آ پا!“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور یوں ہولے ہولے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا جیسے وہ کوئی چھوٹی بچی ہو اور وہ اس کا بزرگ۔

رات وہ خاصی دیر سے سویا تھا لیکن صبح حسب معمول اٹھ گیا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح جلدی جلدی نلکے سے پانی کی بالٹیاں بھری تھیں۔ بھاری بالٹیاں اٹھاتے ہوئے اس کا ننھا جسم جھک جھک گیا تھا۔ پھر جلدی جلدی ناشتا کر کے وہ باہر نکل آیا تھا۔ جاتے جاتے ماں نے پر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے تاکید کی تھی کہ وہ آج یزدانی صاحب یا انصاری صاحب سے ضرور بات کرے۔

”بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں سلطان۔“ اماں نے کہا۔

”اچھا اماں۔“

وہ راستے بھر سوچتا آیا تھا کہ وہ کس طرح یزدانی صاحب سے بات کرے گا۔ دل ہی دل میں لفظوں کو ترتیب دیتا جب وہ ”کیف“ میں پہنچا تو اسے پتا چلا کہ آج ریٹورنٹ میں فنکشن ہے۔ کچھ شاعروں ادیبوں کا اجتماع تھا اور چائے پانی کا انتظام تھا۔ پھر تو شام کو یزدانی صاحب بہت مصروف ہوں گے اتنے بہت سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ کیسے یزدانی صاحب سے بات کرے گا وہ دن بھر سوچتا رہا۔ انصاری صاحب نے پوچھا ”کیا بات ہے سلطان، کچھ پریشان لگتے ہو۔ اپنی پرائیلم بوائے؟“

”جی۔“ اس نے جھجکتے جھجکتے ساری بات بتا دی۔

”ہوں۔ تم نے کیا بتایا تھا، جھمکے دو تولے کے ہیں؟“

”جی اماں نے تو یہی کہا تھا۔“

”تو پھر کیا مسئلہ ہے۔ جھمکے لے آنا۔ میں ذرا ہلکے جھمکے اور ایک جوڑا بالیوں کا اس کے بدلے لے دوں گا۔“

”جی۔“ اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

”ہاں بھائی، چھ ماشے کی بالیاں بنالیں گے اور ایک تولے کے جھمکے..... کچھ کاٹ وغیرہ ہوگی کچھ مزدوری لگے گی اور سو دو روپیہ بچ بھی جائے گا۔“

لیکن جھمکے کتنے خوبصورت ہیں، اس نے سوچا جب اماں کی شادی ہوئی ہوگی تو اماں پہنتی ہوگی بھلا اماں کا کہاں دل چاہے گا اتنے خوبصورت جھمکے بچ ڈالے۔ نہیں میں ایک بار یزدانی

صاحب سے ضرور بات کروں گا اس نے سوچا۔

لیکن وہ یزدانی صاحب سے بات نہ کر سکا۔ پارٹی کی وجہ سے وہ بہت مصروف تھے در ایک بار وہ جان بوجھ کر ان کی میز پر گیا۔ کبھی گلاس اٹھانے کے بہانے، کبھی یوں ہی جھاڑن لے کر میز صاف کرنے کے لیے لیکن یزدانی صاحب نے اس کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے ساتھ باتوں میں مصروف رہے.....

چلو کوئی بات نہیں کل بات کرلوں گا بالآخر اس نے سوچا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ پارٹی کی وجہ سے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ جب وہ تمام برتن کچن میں پہنچا کر اور میز صاف کر کے باہر نکلا تو یزدانی صاحب باہر داخلی گیٹ کے پاس کھڑے ملک صاحب اور آفتاب صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر وہ یونہی ایک طرف اندھیرے میں کھڑا رہا کہ یزدانی صاحب کی گفتگو ختم ہو اور وہ ملک صاحب اور آفتاب صاحب کے جانے کے بعد ان سے بات کر لے۔ یہ اچھا موقع ہے لیکن وہ تو یوں اطمینان سے کھڑے تھے جیسے ساری رات یہیں کھڑے رہیں گے۔ اور پہلے ہی بہت دیر ہو گئی تھی اماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔ جب کبھی ایسی پارٹیاں یا فنکشن ہوتے تو اسے دیر ہو جاتی۔ ایسے میں اسے ماں ہمیشہ گلی کے کنارے پر انتظار کرتی ملتی تھیں۔ وہ تھجے تھکے قدموں سے چل پڑا لیکن کبھی کبھی مڑ کر پیچھے بھی دیکھ لیتا کہ شاید یزدانی صاحب آ رہے ہوں کیونکہ یزدانی صاحب کا بھی یہی راستہ تھا۔

وہ بڑی سڑک پر بھی پہنچ گیا لیکن یزدانی صاحب نہیں آئے تھے۔ لمحہ بھر وہ سڑک پر کھڑا رہا پھر مایوس ہو کر وہ اس ذیلی سڑک کی طرف مڑ گیا جو اس کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ پتھوں بچ ایک گاڑی الٹی پڑی تھی کافی فاصلے پر دو انسانی ہیولے زمین پر پڑے دکھائی دیئے۔ وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا اسٹریٹ لیپ کی مدد سے روشنی میں اس نے دیکھا، گاڑی بری طرح تباہ ہو گئی تھی۔ اس کے دروازے ٹوٹ کر الگ ہو گئے تھے۔ اس نے جھک کر ان انسانی ہیولوں کو دیکھا۔ ایک مرد تھا اور ایک عورت..... بے اختیار بیٹھ کر اس نے ان کا جائزہ لیا چہرہ خون میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ مرد اوندھا پڑا تھا اور اس کے گرد خون بہ بہ کر جم گیا تھا۔

اسے خوف سے جھرجھری آ گئی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید یزدانی صاحب آ رہے ہوں کیونکہ وہ بھی اسی سڑک پر سے گزر کر گلیوں کی بھول بھلیوں میں سے کسی ایک گلی میں گم ہو جاتے تھے۔ لمحہ بھر اس نے سوچا کہ وہ رک جائے اور یزدانی صاحب کا انتظار کر کے پھر ان کے ساتھ مل کر ان کے دریا کو اطلاع دی جائے لیکن دوسرے ہی لمحے اسے خوف سا محسوس ہونے لگا۔

کیا پتا، یزدانی صاحب نہ آئیں۔ ہو سکتا ہے وہ ملک صاحب یا آفتاب صاحب کے ساتھ ہی چلے جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ انصاری صاحب کے ساتھ ہی ٹھہر جائیں اور وہ یوں ہی اکیلا اکڑا رہے۔ اس سڑک پر تو یوں بھی ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اکا دکا کوئی گاڑی آنکلتی تھی۔ پہلے تو طویل عرصے تک یہ سڑک بند رہی تھی۔ اب کھل تو گئی تھی لیکن بہت کم گاڑیاں ادھر سے گزرتی تھیں کہ ایک تو یہ بہت تنگ تھی دوسرا اس کی متبادل سڑک بن چکی تھی اور کوئی اجنبی ہی گاڑی ادھر لا با تھا۔ خوف اس کی ہڈیوں تک میں سرایت کر گیا تھا۔ اس نے ایک نظر عورت کے خون آلود چہرے پر ڈالی اور جانے کے لیے قدم بڑھایا مگر جاتے جاتے مڑ کر ایک نظر پھر تباہ شدہ گاڑی پر ڈالی اور ٹھنک گیا۔ (وہ سیاہ رنگ کا ہینڈ بیگ تھا جو سڑک کے کنارے پڑا تھا۔ یقیناً اس عورت کا ہوگا اس نے سوچا اٹھا کر عورت کے قریب رکھ دوں تاکہ یزدانی صاحب آئیں تو وہ اس بیگ کو سنبھال کر ان کے وارثوں کے حوالے کر سکیں۔

اس نے بیگ اٹھایا بیگ کا منہ کھلا تھا اور اس کے اندر سے نوٹ جھانک رہے تھے۔ سرخ سرخ نوٹ اس نے بے چینی سے پورے بیگ کی تلاشی لے ڈالی۔ ”ایک ہزار دو ہزار، تین ہزار ادھ! یہ تو پورے دس ہزار روپے تھے۔

”بالیاں نہ بنیں تو شاید رشتہ ہی ٹوٹ جائے“ اماں کی آواز اس کے کانوں میں گونجی ”جیسے تو میں نے کب سے جھیمو کے لیے سنبھال کر رکھے ہیں۔“

اور پھر جھیمو کا زرد افسردہ چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ اس نے بیگ بند کر کے بغل میں دبایا اور ارد گرد دیکھا۔ دور و نزدیک کوئی نہیں تھا۔

دس ہزار روپے سے تو بہت کچھ بن سکتا ہے، اس نے ایک مسرت سی اپنی رگ و پے میں دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ نصیر کی ماں کی بالیاں۔ اماں، منی باجی، شانو اور رانی آپا کے نئے جوڑے اور جوتیاں ایک منا سا ریڈیو خود نئے کپڑے اور جھیمو آپا کا خوبصورت سا سرخ جوڑا، ستار ساڑھی ہاؤس پر لٹکا ہوا سرخ غرارہ سیٹ اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ ہاں، میں جھیمو آپا سے کہوں گا یہ بھدے موٹے سنہرے ستاروں والا سوٹ گڈی کو دے ڈالو۔ خوش ہو جائے گی۔ اور خود اس کے لیے ستار ساڑھی ہاؤس سے وہی سرخ غرارہ سوٹ لاؤں گا۔ جھلمل جھلمل کرتا سنہرے ستاروں کے کام والا، اس نے بیگ بغل میں دبائے دبائے عورت کی طرف دیکھا۔ کھلی بے نور آنکھیں اور خون میں ڈوبا چہرہ۔ اس کی نگاہیں چہرے پر سے ہوتی ہوئی اس کی گردن پر رک گئیں۔ ہلکی سی روشنی میں سنہری مچھلی چمک رہی تھی۔ کسی اندرونی مسرت سے مغلوب ہو کر وہ بے اختیار آگے بڑھا۔ اور بے

قراری سے اس نے اس سنہری مچھلی کو چھوا۔ یقیناً یہ سونے کا لاکٹ ہے اور یہ سنہری مچھلی کتنی خوبصورت ہے۔

مچھلی کا منہ ذرا کھلا تھا اور اس میں سرخ یا قوت لگے تھے اور آنکھ کی جگہ سفید بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر وہ حیرت اور مسرت سے اسے دیکھتا اور سوچتا رہا۔ جھیمو آپا کے پاس تو گلے کا بھی کوئی زیور نہیں ہے اور انگوٹھیاں بھی نہیں ہیں نا۔

اس کی نگاہیں عورت کے بے جان ہاتھ پر پڑیں جن میں دو انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس نے لاکٹ کی زنجیر کی طرف دیکھا یہ..... یہ جانے کہاں سے کھلتا ہے؟ چلو پہلے انگوٹھیاں اتار لو۔“

یونہی اس نے ہاتھوں کو چھوا، ایک سردی لہر اس کے اندر اتر گئی اور اس نے خوف سے جھرجھری لے کر اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ کس قدر ٹھنڈا بخ اور سخت ہاتھ تھا۔ اکڑا ہوا۔ ڈرتے ڈرتے ایک بار پھر اس نے ہاتھ آگے بڑھایا سنہری مچھلی کو چھوتے ہوئے لاکٹ کی زنجیر ٹوٹی۔

”انسانیت تو ہم میں بالکل نہیں رہی انصاری صاحب! ہم انسان نہیں درندے ہیں درندے۔ اسے یزدانی صاحب کے الفاظ یاد آ گئے۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ ”ادھ“ وہ خوف زدہ انداز میں مسکرایا اور پھر ہاتھ آگے بڑھایا۔

”ارے ہم تو درندوں سے بھی بدتر ہیں انصاری صاحب اور ہمارے منہ کو اپنوں کا ہی خون لگا ہوا ہے۔“

اس کے ہاتھ سنہری مچھلی پر دھرے رہ گئے اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ انسان نہیں درندہ ہے اور اس کی باجھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ انسانی خون۔ خون کا ذائقہ اس نے اپنے حلق میں محسوس کیا اور اس کے سارے وجود پر کپکپی سی طاری ہو گئی اس نے ہاتھ اٹھالیا اور کھڑا ہو گیا ہے لیکن اس کی ٹانگیں اتنی شدت سے کانپ رہیں تھیں جیسے وہ ابھی گر جائے گا۔ دس ہزار ہی بہت ہیں، اس نے بیگ کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے سوچا اور لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا لیکن اسے لگا جیسے وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ پھر اسے لگا جیسے وہ چاروں ہاتھوں پاؤں پر چل رہا ہو۔

”نہیں“ اس نے چیخ ماری اور بیگ بغل سے نکال کر وہیں پھینک دیا۔ پھر اندھا دھند بھاگنے لگا۔ جب وہ سڑک سے ہٹ کر گلیوں میں پہنچا تو اس کا سارا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا لیکن

”میرے لیے تو خاص ہی تھی یار۔“ یزدانی صاحب نے ”اے سلطان جہانگیر صاحب بل لائیے۔“

وہ پلیٹ میں بل رکھ کر لے گیا۔
 یزدانی صاحب نے بنوا نکالا تو سلطان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سنہری مچھلی والا لاکٹ میز پر آگرا تھا۔ وہی سنہری مچھلی جس میں یا قوت جڑے تھے اور آنکھ کی جگہ سفید ہیرا جڑا تھا۔ سلطان کے ذہن میں خون میں ڈوبا چہرہ، کھلی بے نور آنکھیں اور گردن میں جھولتی سنہری مچھلی لہرا گئی وہ خوف سے جھرجھری لے کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔
 ”اماں یار یہ کیا ہے؟“ ملک صاحب نے سنہری مچھلی اٹھالی۔
 ”تھکے لیا ہے ایک دوست کے لیے۔“ یزدانی صاحب جھینپے اور لاکٹ لے کر جیب میں ڈال لیا۔

”ہوں تو یہ بات ہے مگر کون ہے وہ حسیۂ عالم؟“
 ”ہے ایک۔“
 خون میں ڈوبا چہرہ سلطان کی آنکھوں کے آگے ہلکورے لے رہا تھا۔
 ”لے لے یار سلطان جہانگیر تو بھی کیا یاد رکھے گا۔“ یزدانی صاحب نے بل سے زائد دس روپے پلیٹ میں رکھے۔
 ”نہیں۔“ سلطان کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ایک قدم مزید پیچھے ہٹ گیا اسے لگا جیسے یزدانی صاحب کی باجھوں سے خون ٹپک رہا ہو۔ انسانی خون اور وہ چاروں ہاتھوں پیروں کے بل بیٹھے ہوں۔

”کیا ہوا سلطان؟“ ملک صاحب نے اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کو دیکھا۔
 یزدانی صاحب نے بھی نگاہیں اٹھائیں وہی محبت بھری مہربان نگاہیں جن میں ایک جہان کے لیے درد سایا ہوا تھا لیکن سلطان کو یوں لگا جیسے یہ آنکھیں کسی انسان کی نہیں بلکہ کسی درندے کی بے رحم آنکھیں ہوں۔

”کیا ہوا اسے؟“ یزدانی صاحب بے اختیار اٹھ کر سلطان کی طرف لپکے۔ سلطان کو یوں لگا جیسے کوئی درندہ اپنے خونی جڑے کھولے اسے ہڑپ کرنے کے لیے اس کی طرف لپک رہا ہو۔
 ”نہیں۔“ وہ پیچھے ہٹتا ہوا چیختا۔ اس کی ٹھکی بندھ گئی تھی اور وہ بچاؤ بچاؤ ”چلاتا ہوا پورے ہال میں دوڑ رہا تھا۔“

اندھیری گلی کے آخری کونے پر ماں لائین لیے کھڑی تھی۔

”ماں۔“ وہ ایک دم ہی اس لے لپٹ گیا۔
 ”کیا..... کیا ہوا سلطان؟“ ماں نے گھبرا کر اپنے بازو اس کے گرو حائل کر لیے۔
 ”کچھ نہیں، ڈر گیا تھا ماں۔“

”رات بھی تو بہت ہو گئی ہے نا۔ انصاری صاحب سے کہنا تجھے دور جانا ہوتا ہے جلدی چھٹی دیا کریں۔“
 ”آج وہاں پارٹی تھی نا اس لیے دیر ہو گئی۔“

ماں کے ساتھ چلتے چلے اس نے غور سے اپنی طرف دیکھا وہ چاروں ہاتھوں پاؤں کی بجائے صرف اپنے دونوں پاؤں سے چل رہا تھا۔ اس کے دل میں سکھ اور اطمینان کی لہر ابھری۔ سانس لیتے ہوئے اس نے سوچا وہ صبح جھمکے لے جا کر انصاری صاحب کو دے دے گا تاکہ وہ بدل کر بالیاں اور ذرا ہلکے جھمکے لے لیں۔

صبح حسب معمول وہ ریستورنٹ میں آ گیا۔ انصاری صاحب نہیں تھے وہ کام میں مصروف ہو گیا۔ دل ہی دل میں وہ یزدانی صاحب کا ممنون تھا۔ اس نے سوچا، جب یزدانی صاحب آئیں گے تو وہ ان کا شکریہ ادا کرے گا کہ ان کی باتوں کے طفیل ہی وہ انسان سے درندہ بنتے بنتے رہ گیا تھا۔

انصاری صاحب کافی دیر سے آئے اور پھر اسے ساتھ لے کر سناں کی دکان کو چل پڑے۔

”چل یار تو بھی ساتھ چل۔ بالیاں اور جھمکے اپنی پسند سے لے لیتا۔“
 جب وہ واپس آیا تو یزدانی صاحب آچکے تھے اور اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے تھے۔ گل صاحب، ملک صاحب اور آفتاب صاحب ان کے ساتھ ہی تھے اور وہ بڑے چمک رہے تھے۔

”رات پارٹی بڑی شاندار رہی۔“ انہوں نے کئی بار کہا۔
 کام کرتے کرتے سلطان نے سوچا، شاید ابھی وہ بتائیں گے کہ کل رات پرانی سڑک پر ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا اور کس طرح ساری رات انہوں نے بھاگ دوڑ کر کے ورثا کو اطلاع دی۔ لیکن وہ تو پتھارے لے لے کر کل کی پارٹی کا ذکر کر رہے تھے۔

”ایسی کیا خاص بات تھی اس پارٹی میں؟“ ملک صاحب نے ”بھائی ایسی پارٹیاں تو پہلے بھی ہوتی رہی ہیں۔“

جب وہ باشعور ہو گئی تھی تو کئی بار اس نے حیرت سے سوچا تھا، کیا می کی اپنی کوئی پسند نہیں ہے؟ می کی اس لائق کی وجہ سے وہ ڈیڈی کے زیادہ قریب تھی اور ڈیڈی بھی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ اسے ذرا سا زکام بھی ہو جاتا تو اتنے پریشان ہو جاتے، جیسے اسے کوئی خطرناک بیماری ہو گئی ہو۔ اس نے ڈیڈی اور می کو آپس میں بہت کم بولتے دیکھا تھا۔ شاید وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کیے بغیر ہی ایک دوسرے کا مدعا سمجھ لیتے تھے۔

جب وہ ذرا اور بڑی ہوئی تو دل ہی دل میں پھپھو، می اور خالہ کا مقابلہ کرنے لگی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ می سب سے مختلف کیوں ہیں؟ عیشی آنٹی سے، نمبرہ پھپھو سے اور شانو خالہ سے۔ کئی دفعہ فرح نے ضد کر کے اسے روک لیا تھا اور وہ نانی کے گھر رہ گئی تھی۔ وہاں اسے فراز ماموں اور عیشی آنٹی کو می اور ڈیڈی سے بالکل مختلف پایا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ عیشی آنٹی ہر وقت چپکتی رہتی تھیں۔ ناشتے کی میز ہو یا کھانے کی ٹیبل، وہ سرفراز ماموں سے باتیں اور ہلکا پھلکا مذاق کرتے نہ تھکتی تھیں۔ خالہ اور پھپھو کے گھر میں بھی اس نے یہی سب کچھ دیکھا تھا لیکن اس کے اپنے گھر میں کیسی جامہ خاموشی ہوتی تھی! نہ ہنسی نہ مذاق، نہ ہی شوخ فقرہ کا تبادلہ، نہ می نے ناشتے پر کبھی یہ بحث کی تھی کہ آج کیا کپکے گا اور نہ ڈیڈی نے کبھی کوئی مشورہ دیا تھا۔ بس ناشتہ لگ جاتا تو وہ تینوں خاموشی سے ناشتہ کر لیتے۔ کوئی بات، کوئی تبصرہ کیے بغیر می کا جودل چاہتا پکوا دیتیں اور ڈیڈی کی جو مرضی ہوتی ملازم کو کہہ دیتے اور وہ سووا لے آتا کیسی مشینی سی زندگی تھی می کی۔ جیسے وہ کوئی روبوٹ ہوں۔ اپنی پسند ناپسند سے بے نیاز اور وہی کچھ کر رہی ہوں جو ان کے اندر فٹ کر دیا گیا ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ زندگی گزار نہیں رہی ہیں بلکہ زندگی انہیں گزار رہی ہو۔

کیا خبر می کو ڈیڈی پسند نہ ہوں، ایک بار اس نے سوچا تھا۔ یہ سوچ اسے وی۔سی۔آر پر دیکھی جانے والی انڈین فلموں نے بخشی تھی لیکن بہت غور کرنے کے بعد بھی اسے ڈیڈی میں کوئی ناپسند کرنے والی بات نظر نہیں آتی تھی۔ ڈیڈی خوبصورت اور وجیہ تھے، اعلیٰ عہدے پر فائز تھے، گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی، ہر قسم کی آسائشیں میسر تھیں اور لوگ مغیث احمد کی بیوی کی حیثیت سے می کی بہت عزت کرتے تھے۔

نہیں ڈیڈی بہت اچھے ہیں۔ می انہیں ناپسند نہیں کر سکتیں، اس کے من کی عدالت نے ڈیڈی کو صاف بری کر دیا تھا۔ وہ کسی بھی صورت ڈیڈی کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سوچ سکتی تھی، لہذا اس نے دل ہی دل میں یہ طے کر لیا کہ می ہی خاموش، کم گو اور چپ چاپ سی۔ وہ عیشی پھپھو، آنٹی نمبرہ اور شانو خالہ کی طرح نہیں ہو سکتیں نہ وہ ڈیڈی سے مہنگائی پر بحث کر سکتی ہیں

چھوٹی سی بات

جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اپنی می کو یونہی چپ چاپ خاموش اور سہا سہا سا دیکھا تھا۔ ایک جامد چپ تھی جس کے لہادے میں وہ ہمیشہ لپٹی نظر آتی تھیں کئی بار تو اسے یوں بھی محسوس ہوا تھا، جیسے می روئی ہوں۔ ان کی آنکھیں سو جی ہوئی اور سرخ سرخ لگتی تھیں۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے می کو کبھی کھل کر ہنسنے یا قہقہہ لگاتے دیکھا ہو۔ پتا نہیں، وہ اتنی کم گو اور خاموش کیوں تھیں؟

جب وہ بہت چھوٹی سی تھی تو اس نے اس بات پر زیادہ غور کبھی نہیں کیا تھا لیکن لاشعوری طور پر اس کا دل ضرور چاہتا تھا کہ اس کی می بھی دوسروں کی طرح ہوں۔ فرح اور عمیر کی می کی طرح، جو ریہ اور ٹیپو کی می ایسی۔ ہنس کھ، شوخ اور باتونی سی، ڈھیروں باتیں کرنے والی بچپن سے ہی اس کے دل میں می کی اس خاموشی سے خوف سا پیدا ہو گیا تھا اور وہ خود بھی می سے بلا ضرورت بات نہیں کرتی تھی، بلکہ اسے جو بھی بات کرنا ہوتی یا کوئی سوال پوچھنا ہوتا تو ڈیڈی سے پوچھتی اور ڈیڈی اس کے ہر سوال کا جواب بہت تفصیل سے دیتے تھے۔ می سے اگر کبھی غلطی سے کوئی سوال کر بھی لیتی تھی تو وہ صرف ہوں، ہاں میں جواب دیتی تھیں۔ چنانچہ اس عمر میں بچے جو لاڈ ماں باپ سے کرتے ہیں، وہ صرف ڈیڈی سے کرتی۔ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کی گود میں سر رکھ کر وہ مزے سے کہانیاں سنتی اور می ایک طرف چپ بیٹھیں اسے ڈیڈی کے ساتھ لاڈ کرتے دیکھتی رہتیں ڈیڈی نے کبھی اس کی فرمائش رد نہیں کی تھی۔ وہ کتنا بھی تھکے ہوئے کیوں نہیں ہوتے، اگر وہ کوئی فرمائش کر دیتی تو فوراً پوری کرتے۔ اس کے کپڑے، اس کے جوتے، اس کے رہن اور کلپ سب وہ اپنی پسند اور مرضی سے خریدا کرتے تھے۔ می نے اس معاملے میں کبھی دخل نہیں دیا تھا۔ ان کی حیثیت ایک خاموش تماشا کی سی تھی۔ ان کے کپڑوں کا انتخاب بھی ڈیڈی خود ہی کرتے تھے۔

اور نہ ہی نئی فلموں پر تبصرے، شاید انہیں باقی سب کی طرح فضول باتیں کرنا آتا ہی نہیں۔

پھر بہت سارے دن گزرے گئے وہ کچھ اور بڑی ہو گئی اس نے می کی کم گوئی سے سمجھوتا کر لیا تھا لیکن اس روز وہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اسکول نہیں گئی تھی اور اپنے بیڈ روم میں لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ اچانک شیراز ماموں آ گئے۔

”ماموں آپ!“ وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

شیراز ماموں اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ خوشی سے چلانے لگی۔ ”می! شیرازی ماموں آئے ہیں۔“

می کچن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر نکل آئیں۔ اس نے دیکھا، می کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

”کیسے ہو شیراز اور اچانک کیسے آ گئے ہو؟“

”بس یوں ہی باجی، ادھر سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کو دیکھتا جاؤں۔“

”بیٹھو!“

”نہیں باجی! بیٹھوں گا نہیں۔ باہر میرا ایک دوست ہے۔ ہم دونوں ٹی وی انشٹن جا رہے ہیں۔ اسے کوئی پروگرام ریکارڈ کرانا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“

شیراز ماموں نے جھک کر اس کے رخسار پر پیار کیا لیکن وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی

”جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔ اتنی جلدی جا رہے ہیں، یاد ہے نا کچھلی بار آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ میرے ساتھ وڈیو گیم کھیلیں گے۔“

”پھر آؤں گا تو کھیلوں گا اب دیر ہو رہی ہے بیٹے۔“

شیراز ماموں کے جانے کے بعد وہ ہاتھ روم کی طرف چلی گئی، تھمی باہر سے ڈیڈی کی

آواز سنائی دی۔

”ارے! ڈیڈی آ گئے اتنی جلدی۔“ اس نے خود کلامی کی اور جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ”آج ڈیڈی جلدی آ گئے ہیں تو پھر شام کو ضرور کہیں گھومنے چلیں گے۔“ اس نے سوچا۔ تھمی ڈیڈی کی آواز آئی۔ ”یہ شیراز آیا تھا یہاں؟“

”ہاں گزر رہا تھا یہاں سے تو.....“ می کی آواز ہمیشہ کی طرح بہت مدہم تھی۔

”وہ میری عدم موجودگی میں کیوں آیا ہے یہاں۔“

”بھائی ہے میرا۔ میں اسے آنے سے روک نہیں سکتی۔“

”بھائی! کزن بھائی نہیں ہوتا۔“ ڈیڈی زور سے بول رہے تھے وہ سہم کر ہاتھ روم میں ہی رک گئی۔

”ہم ایک ہی گھر میں اکٹھے پلے بڑھے ہیں۔ میں اسے بھائی ہی سمجھتی ہوں اور وہ بھی.....“

”وہ تمہیں بہن نہیں سمجھتا۔“ ڈیڈی کی آواز مزید بلند ہو گئی۔

”مغیٹ! خدا کے لیے اتنی گھٹیا بات مت کیا کریں، رشتوں کا احترام کرنا سیکھیں۔“

”میں ان رشتوں کے پس منظر اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک دنیا دیکھ رکھی ہے میں نے

”ڈیڈی خوب اونچا بول کر اور زور سے دروازہ بند کر کے چلے گئے تو اس نے ڈرتے ڈرتے باہر

جھانکا۔ می صوفے پر بیٹھی دھاروں دھار رو رہی تھیں۔ پہلی بار اس کے دل میں می کے لیے رحم کا

جذبہ پیدا ہوا۔

”می!“ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔ ”ڈیڈی کیوں خفا ہو رہے تھے؟“

”کچھ نہیں، بس ایسے ہی بیٹا۔“ می نے آنسو پونچھ لیے۔ ”تم جاؤ اپنے کمرے میں

آرام کرو۔ تمہارے پیٹ میں درد تھا نا۔“

”اب درد نہیں ہے می۔“ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ تھام کر اسے پیار

کرتے ہوئے بولی۔ ”می! یہ شیرازی ماموں کیا بہت برے آدمی ہیں؟“

”نہیں تو می نے تڑپ کر اس کی طرف کہا۔“ تم سے کس نے کہا؟“

”ابھی تو ڈیڈی کہہ رہے تھے۔“

”نہیں بیٹا! وہ کوئی اور بات کر رہے تھے۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئی ہوگی۔“

اس کی سمجھ میں تو آ گئی تھی لیکن اس نے می سے بحث نہ کی اور اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔

پھر چھ سات دن گزر گئے۔ وہ اس بات کو بھول چکی تھی کہ شیرازی ماموں آ گئے۔ اس نے

خاصے غور سے انہیں دیکھا۔ ڈیڈی ان سے بہت اچھی طرح باتیں کر رہے تھے۔

”آج تو بھی میں اپنی عنبرین گڑیا کے لیے آیا ہوں۔ چلو وڈیو نکالو اور ٹی وی پر سیٹ

کرو۔“ شیرازی ماموں نے اس سے کہا۔

وڈیو گیم کھیلنے اچانک اس نے ان سے کہا۔

”شیرازی ماموں! آپ ہمارے گھر نہ آیا کریں۔“

”بھئی وہ کیوں؟“ انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”اس لیے کہ آپ برے آدمی ہیں۔“
”برا آدمی!“

”شیزمی ماموں کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔“

”ہاں ڈیڈی کہتے ہیں، آپ برے آدمی ہیں۔ آپ ہمارے گھر نہ آیا کریں۔ وہ.....“
”عزیزین!“ می جانے کب ان کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ ڈیڈی فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔

”باجی! یہ عزیزین کیا کہہ رہی ہے؟“ شیراز ماموں کا رنگ ہلدی جیسا ہو گیا تھا اور می تو بالکل سفید ہو رہی تھیں۔

”کچھ نہیں شیراز۔ خدا جانے مغیث نے کیا کہا تھا اور اس نے کیا سمجھا۔ ایسے ہی بک رہی ہے۔“

لیکن شیراز ماموں اتنے بچے تو نہ تھے۔ وہ ساری حقیقت لمحہ بھر میں جان گئے اور اس روز کے بعد وہ ان کے گھر کبھی نہ آئے۔ می تو بالکل ہی بچہ کر رہ گئی تھیں وہ تو سمجھتی تھی کہ اس نے می اور ڈیڈی کے درمیان اختلاف کی جڑ ہی ختم کر دی ہے۔ کئی دن وہ لاشعوری طور پر منتظر سی رہی کہ اب می اور ڈیڈی ہنس ہنس کر باتیں کر س گے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

یہ صرف شیراز ماموں ہی کی بات نہیں تھی ڈیڈی تو ہر فرد پر شبہ کرتے تھے اور اس کا ادراک اسے تب ہوا تھا جب لڑکیاں اس عمر کو پہنچ جاتی ہیں جب مائیں اپنے دکھ ان سے کہنے لگتی ہیں مگر می نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اس نے خود ہی حقائق سے بہت سی باتیں اخذ کر لی تھیں اور اسے می کی اس جامد خاموشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی، لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ وہ می کے دکھ کس طرح بوائے۔ وہ می سے کیسے کہے کہ اس نے ان کے دکھ کو پالیا ہے اور یہ کہ وہ ان سے محبت کرتی ہے۔ بے حد، بہت زیادہ، تاہم وہ اکثر ان سے کہتی رہتی تھی کہ می آپ خوش رہا کریں، ہنسنا بولا کریں، باتیں کیا کریں۔“

اس روز کالج میں چھٹی تھی اور وہ می کے گھٹنے پر ٹھوڑی ٹیک کر بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی می کتنی خوبصورت تھیں۔ ایسا حسن اس نے کم کم ہی دیکھا تھا۔ اس کی سہیلیاں بھی می کی تعریف کرتی تھیں۔ ماہ و سال کی گردش نے ان کے حسن میں کوئی کمی نہیں کی تھی بلکہ وہ پہلے سے زیادہ سو بر اور دلکش ہو گئی تھیں۔ اس نے ان سے پوچھا۔ ”می! آپ اتنا کم کیوں بولتی ہیں؟“

”بیٹے! کیا بولوں؟ کچھ بولنے کے لیے۔“

”کپنے دل کی باتیں مجھ سے کیا کریں، آپ کیا سوچتی رہتی ہیں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں نامی۔“
”بیٹا! اب کیا سوچنا؟ سوچنے کی عمر تو گزر گئی۔“
”نہیں می آپ.....“

آج وہ ان سے صاف صاف بات کرنا چاہتی تھی۔ کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی اور اس نے بات ادھور چھوڑ دی۔

فون پر نانی اماں تھیں۔ انہوں نے حیات ماموں کی بیماری کی اطلاع دی تھی۔
”بیٹا وہ سخت بیمار ہیں۔ میں ادھر ہی جا رہی ہوں۔ رات بھی ہم لوگ گئے تھے۔ تمہیں بہت یاد کر رہے تھے۔ کہو تو تمہیں لیتی چلوں۔“ انہوں نے می سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے می! مجھے بھی لے لیں۔ عرصہ ہو گیا حیات ماموں سے ملے۔“
”تم تو بیٹا بس شادی کے بعد بالکل ہی ان سوشل ہو کر رہ گئی ہو۔“
جب می فون کا ریسپورڈ رکھ چکیں تو اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا می؟ نانی اماں کیا کہہ رہی ہیں؟“
”بیٹا حیات ماموں بیمار ہیں۔ ذرا ان کی مزاج پر سی کے لیے جانا ہے۔“
”حیات ماما کو کیا ہوا ہے؟“
”کچھ نہیں بیٹا۔“

می اندر اپنے بیڈروم میں چلی گئیں۔ شاید ڈیڈی کو بتانے گئی تھیں۔ آج پھر اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنی می کو ہنسنے بولنے اور خوش رہنے پر مجبور کر دے گی۔ خیر پھر سہی۔ اس نے ہولے سے سر جھٹکا، بھی اندر سے ڈیڈی کی تیز آواز سنائی دی۔ ”کوئی ضرورت نہیں ادھر جانے کی۔“
”مگر وہ بیمار ہیں۔“

”میں نے تم سے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے تمہارے یہ حیات ماموں بالکل پسند نہیں ہیں۔ تم جانتی ہو، فلرٹ آدمی ہیں۔ عیاش طبع۔“

”مگر میرا ان کا خون کا رشتہ ہے اور پھر بچپن سے ہی انہوں نے مجھے بیٹی بنا رکھا ہے۔“
”کچھ بھی ہو میں اسے پسند نہیں کرتا۔“

”مگر امی مجھے لینے آرہی ہیں۔“ می کی آواز میں آنسوؤں کی نمی اس نے صاف محسوس کی۔
”کوئی بہانہ کر دو۔“ ڈیڈی نے بات ختم کر دی تھی۔

”یہ ڈیڈی اتنے تھڑولے اور تنگ نظر کیوں ہیں؟ پہلی بار اس کے دل میں ڈیڈی کے

سب سے بڑھ کر ڈیڈی نے ممی کا قتل کیا تھا۔ وہ مجرم تھے لیکن وہ انہیں سزا نہیں دے سکتی تھی ان سے انتقام نہیں لے سکتی تھی۔ ان سے نفرت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس کے دل پر ایک بوجھ سا آگرا تھا۔ ایک ایسا بوجھ جو پتھر کی سل کی طرح اس کے دل کو پیسے جاتا۔ وہ ایک دم خاموش رہنے لگی تھی وہی جامد خاموشی اس کے وجود پر بھی چھا گئی تھی۔ اس نے بلا ضرورت بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ ڈیڈی نے کئی بار اس کی خاموشی کا سبب پوچھا لیکن اس نے ٹال دیا۔

انہی دنوں جب وہ بہت ڈپر لیس ہو رہی تھی اس کا پروپوزل آگیا۔ لڑکا، اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اچھے خاندان کا تھا، خوش شکل تھا۔ سورشتہ طے پانے اور شادی ہونے میں دیر نہ لگی فاروق ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ چاہنے اور محبت کرنے والا شوہر، لیکن اس میں سب سے بڑی خالی یہ تھی کہ وہ ہو بہو ڈیڈی کی کاپی تھا۔ ویسی ہی شکی طبیعت، ویسا ہی پارے جیسا مزاج۔

”فلاں کے گھر نہیں جانا۔“

”فلاں کی طرف مت دیکھو۔“

فراز ماموں کے گھر جانے کی پابندی کہ ان کے بیٹے جوان ہو رہے ہیں۔

پھوپھو کے گھر جانے پر پابندی کہ وہ لوگ بہت ماڈرن ہیں۔ حتیٰ کہ میکے جانے پر بھی بیزاری اور ناراضگی اس نے اپنی ممی کی طرح چپ چاپ ہر پابندی قبول کر لی کہ شاید اس طرح ڈیڈی کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو سکے۔ فاروق احمد نے میکے جانے پر بیزاری کا اظہار کیا تو وہ پورے دو مہینے تک میکے نہ گئی۔ ڈیڈی فون کر کر کے، بلا بلا کے تھک گئے۔ ممی نے بھی کئی بار فون کیا اس نے ہر بار یہی کہا۔

”فاروق مصروف ہیں۔ فارغ ہوں گے تو اکٹھے آئیں گے۔“

ڈیڈی ممی خود دو تین بار آئے۔

”ایک ہی شہر میں رہ کر فاروق بیٹے اتنے دن نہ آنا! ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کے جانے سے گھر سونا ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی شام کو آ جایا کرو نا۔“

فاروق وعدہ کر لیتے، لیکن جانا انہیں کبھی یاد نہ رہتا تھا۔

روز روز بیٹی کے گھر آنا بھی مناسب نہ تھا۔ اندر ہی اندر کس کر رہ جاتے۔ اس روز نہ جانے کیسے خود ہی فاروق کو خیال آ گیا۔ ”چلو تمہاری ممی کی طرف چلتے ہیں۔ شام کو آفس سے واپسی پر پریس جاؤں گا۔“

وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ ممی اسے دیکھ کر بے تحاشا خوش ہوئیں اور انہوں نے اسی

لیے غصہ اور ناراضگی پیدا ہوئی تھی۔ اس روز اس نے جان بوجھ کر ڈیڈی سے کوئی بات نہ کی۔ ممی حیات ماموں کے گھر نہیں گئی تھیں، لیکن سارا دن مضطرب اور بے چین سی رہی تھیں اور ان کی بے چینی اس سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

پھر حیات ماموں مر گئے۔ ممی کی حالت دگرگوں تھی۔ اس نے ممی کو بڑا دلاسہ، بڑی تسلی دی، لیکن ممی کے آنسو تھمتے ہی نہیں تھے۔ ڈیڈی نو دکنی بارمی کو لے کر حیات ماموں کے گھر گئے لیکن اب کیا فائدہ تھا؟ کیا ہو جاتا جو ڈیڈی پہلے ممی کو جانے دیتے، وہ زندگی میں ان سے مل لیتیں۔

”ممی! کیا آپ کو بہت دکھ ہے حیات ماموں سے نہ ملنے کا؟“

”ہاں۔“ ممی نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

”تو پھر اس روز آپ نے ڈیڈی سے ضد کیوں نہیں کی؟ بیویاں تو شوہروں سے بڑی

بڑی باتیں منوالیتی ہیں، پھر آپ.....“

”جب بات منوانے کی عمر تھی، تب مغیث نے مجھے ایک ہی بات سے پانی پانی کر دیا تھا، شک عورت کو مار دیتا ہے بیٹا! میں تو اسی روز مر گئی تھی۔ بیٹا جب پہلی بار تمہارے ڈیڈی نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا تھا۔ مجھے تو ان نظروں نے ہی مار دیا تھا بیٹا۔ اور پھر اس پر لفظوں کی مار! یوں سمجھو جیسے مرے ہوئے کو مارنا۔“ اس روز ممی نے اپنا سینہ اس کے سامنے کھول دیا اور اپنے سارے زخم اسے دکھا دیئے۔

”ممی! وہ سب اٹھی۔ ڈیڈی ایسا کیوں کرتے ہیں؟“

”وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں، خود جو ایسے ہی ہیں سمجھتے ہیں سب مرد.....“ ممی نے

بات نامکمل ہی چھوڑ دی۔

اس کے دل پر بڑا بھاری بوجھ آگرا تھا۔ وہ ڈیڈی سے نفرت کرنا چاہتی تھی، لیکن نہیں کر سکتی تھی۔ ڈیڈی نے اس سے اتنی محبت کی تھی اور اس نے ڈیڈی کو اتنا چاہا تھا کہ اب یہ چاہت نفرت میں نہیں بدل سکتی تھی۔

وہ سوچتی رہی کہ کس طرح ڈیڈی سے بدلہ لے؟ ممی کی بے مصرف زندگی کا، ان کے ان ماہ و سال کا جو ایک جامد چپ تلے بہم بہم کر گزر گئے تھے ان کے ان آنسوؤں کا جو انہوں نے تنہائی میں اکیلے بہائے تھے اور ان کے ان خوبصورت جذلوں کا جو برف میں ڈھل گئے تھے اور ان کی محبتوں کا جو شک کے پہاڑ تلے آ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھیں۔ کھری، سچی اور بے غرض محبتیں، شیریں ماموں کی محبت، حیات ماما کا پیار، طشی چاچا کی شفقت، ڈیڈی ان ساری محبتوں کے قاتل تھے اور

وقت مغیث احمد کو بھی فون کر کے اس کی آمد کی اطلاع دے دی۔ مغیث احمد بھاگتے چلے آئے۔
 ”ارے میری بیٹی آئی ہے، میری زندگی۔“ انہوں نے اسے بے اختیار گلے لگالیا اور ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”تمہارا انتظار کرتے کرتے تو ہماری آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ بیٹے! تم آتی کیوں نہیں ہو؟“ انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے پوچھا۔
 ”فاروق تو منع نہیں کرتا؟“ ممی کی نگاہیں اس کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔
 ”جی ممی! انہیں پسند نہیں ہے میرا میکے آنا۔“
 ”کیوں؟“ مغیث احمد نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”وہ کہتے ہیں ڈیڈی.....“ اس نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی، جس پر انفرنگی اور تھکن تھی۔ بیٹیوں کے باپ کتنے بے بس اور مجبور ہوتے ہیں لمحہ بھر کے لیے اس نے سوچا اور پھر ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ کر معدوم ہو گئی۔ ”وہ کہتے ہیں کہ تمہارے ڈیڈی فلرٹ آدمی ہیں ساری زندگی لڑکیوں کے ساتھ گھومتے پھرے۔“

”کیا؟ میں؟ تمہارا باپ ہوں میں۔“ ان کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ ”میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔“ وہ فون کی طرف لپکے ”اس نے اتنی چھوٹی، اتنی گھٹیا بات کی ہے۔“
 ”سوری ڈیڈی۔“ اس نے لمحے بھر کو نگاہیں اٹھائیں اور پھر ہاتھ میں پکڑے کی رنگ سے کھیلنے ہوئے بڑے رساں سے بولی۔ ”آپ بھی تو ممی سے ایسی ہی گھٹیا اور چھوٹی باتیں کیا کرتے تھے۔“

مغیث احمد پہلے تو کچھ سمجھے نہیں اور جب سمجھے تو انہیں یوں لگا جیسے ان کی بے حد لاڈلی اکلوتی بیٹی نے ان کے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو، وہ بھر بھری مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھتے چلے گئے اور عزیز احمد کو یوں لگا، جیسے اس کے سینے پر دھری پتھر کی بھاری سل سرک گئی ہو اور اس نے ممی کے خاموش آنسوؤں کا بدلہ لے لیا ہو۔ وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھامے نادم سے بیٹھے ڈیڈی کو دیکھ کر خود بہ خود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اطمینان اور سکون سے پر مسکراہٹ۔

پناہ گاہ

جوڑے میں نہیں لگا کر انہوں نے تنقیدی نظروں سے اپنا جائزہ لیا چھوٹے چھوٹے گلابی پھولوں والی نیوی بیو ساری میں ہمیشہ کی طرح وہ باوقار اور اچھی لگ رہی تھیں۔ ایک آخری نظر آئینے پر ڈال کر انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل سے چارلی کی شیشی اٹھائی اور اس پرے کر کے مڑی ہی تھیں کہ سہی سہی سی آمنہ بی نے اندر جھانکا۔ ناک سے سوں سوں کرتا اس کا پلو پکڑے اس کا بیٹا بھی پیچھے ہی تھا۔

”یقیناً میاں سے مار کھا کر آرہی ہوگی۔“ انہوں نے اس کی ناوقت آمد کے بارے میں اندازہ لگایا، اس وقت انہیں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے جانا تھا اور پہلے ہی دیر ہو رہی تھی۔ انہوں نے ایک بیزاری نظر آمنہ پر ڈالی۔ اس کی روٹی روٹی آنکھیں، پھٹی ہوئی اور زہنی اور ماتھے پر نیل کا نشان ان کے اندازے کی تصدیق کر رہا تھا۔

”کیوں، کیا پھر صدو نے پٹائی کر دی؟“ انہوں نے ایک نظر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر ڈالی۔

آمنہ نے سر ہلایا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی:

”بس جی اب جوڑ کے اس کے در پر جاؤں تو آمنہ نام نہیں۔ بس بیگم صاحب جی رات رہنے کی جگہ دے دو۔ صبح ہوتے ہی اپنے گاؤں چلی جاؤں گی۔ کہہ دیا میں نے صدو کو، چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں اور میرا باپ کوئی ایسا بھوکا بنگا بھی نہیں ہے۔ ساری عمر بٹھا کر کھلا سکتا ہے۔ بس جی اب تو کبھی مڑ کے نہ آؤں گی۔“

انہیں پتا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ صبح ہوتے ہی صدو آئے گا اور ہاتھ پیر جوڑ کر اسے منا کر

لے جائے گا اور آمنہ کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ضرور اسے لمبا چوڑا ٹیکچر دیتیں مگر اس وقت انہیں جانے کی جلدی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ اس وقت تو میں کہیں جا رہی ہوں ہو سکتا ہے دیر سے آؤں۔ تم کھانا وغیرہ کھا کر سو رہنا۔“

پھر انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے خانساماں کی بیوی کو بلا کر اس کے بارے میں ہدایت کی اور کار کی چابیاں ہاتھ میں گھماتے ہوئے باہر نکل آئیں۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی وہ غیر ارادی طور پر آمنہ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں۔ اتنی معاشی، سائنسی، تمدنی ترقی کے باوجود ہمارے ہاں کی عورت وہیں ہے۔ جہاں آج سے سینکڑوں برس پہلے تھی، وہی مجبور، مظلوم محکوم عورت..... اور مرد!..... وہی ظالم، وہی حاکم، خواہ اس کا تعلق نچلے طبقے سے ہو یا طبقہ اولیٰ سے، ہر جگہ مرد حاکم ہی ہے۔ برتری کے نشے میں چور..... اور عورت محکوم۔

عورت کو برابری کا درجہ دینے والے، اسے دوست سمجھنے والے مرد کہاں ہیں؟ سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں میں کوئی ایک مرد ایسا ہوگا، اور بے چاری عورت ہمیشہ سے مرد کی خدمت گزار ہے اس کے رنگ میں رنگ جانے والی۔

اس کے لیے اپنا آپ مٹا دینے والی۔
خود کو خاک کر دینے والی۔

مرد اس کا احترام کرنے کی بجائے ہمیشہ سے اسے دبا رہا ہے۔ اس کی محبت میں بھی حاکمیت ہے، برتری ہے۔ بچپن سے وہ یہی دیکھتی آرہی تھیں۔ انہوں نے اپنی اماں کو دیکھا تھا۔ اپنی دادی کو بھی، شاید ان کی ماں اور پھر ان کی ماں سبھی محکوم تھیں۔ مظلوم تھیں۔ گھر میں انہوں نے اپنے دادا کو دیکھا تھا جو عمر کے اس دور میں بھی جب ان کے پوتے پوتیاں جوان ہو چکے تھے، ان کا بھائی میڈیکل کے آخری سال میں تھا اور وہ خود ایف، ایس سی کی طالبہ تھیں، حکم چلاتے ہی دیکھا تھا۔ ان کی خلاف مرضی کوئی بات ہو جاتی تو وہ یوں چیختے چلاتے کہ بچپن میں تو وہ سب بہن بھائی خوف زدہ ہو کر کمروں میں دبک جاتے تھے اور اگر کبھی دادی غلطی سے کوئی جواب دے دیتیں تو پھر قیامت ہی آ جاتی۔ چھتر برس کی عمر میں بھی وہ دادی کو زبان ہلانے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی ہی مرضی چلے اور اپنے موقف پر یوں ڈٹ جاتے تھے جیسے ہٹلر کی فوجیں اتحادیوں کے خلاف جنگ لڑ رہی ہوں۔ خواہ ان کا موقف غلط ہی کیوں نہ ہوتا، دادی کو ان کی بات

ماننا پڑتی تھی۔ شروع شروع میں تو وہ سمجھتی تھیں کہ شاید بڑھاپے میں دادا کے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں اس لیے وہ جلدی مشتعل ہو جاتے ہیں لیکن پھر دادی نے بتایا:

”ارے وہ تو ہمیشہ سے ایسے تھے بیٹا۔ کیسا کیسا مجھے انہوں نے تڑپایا کسایا ہے۔ ایک بار کہہ دیا، بھائی کے گھر نہیں جانا اگر گئیں تو پھر مڑ کر نہ آنا، پورے دس برس بھائی کے گھر نہ گئی۔ دیکھنے کو ترس گئی تھی۔“

اور وہ آنکھیں پھاڑے حیرت سے دادی کی باتیں سنا کر تیں۔

”آپ نے کبھی احتجاج بھی نہیں کیا ان کے فیصلوں پر۔“

”احتجاج کرتی تو ساری عمر ماں کی دہلیز پر ہی بیٹھی رہ جاتی۔ تیرے دادا غصے کے بڑے تیز ہیں۔ جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ ذرا سالن میں نمک زیادہ ہوتا تو ہنڈیا چور ہے پر پڑی ہوتی تھی۔“
یہی بات انہوں نے اپنے باپ میں بھی دیکھی تھی۔ کھانے میں مرچیں یا نمک زیادہ ہونے پر سینکڑوں بار برتن ٹوٹے تھے اور پھر گھر میں بھی صرف انہی کا حکم چلتا تھا۔ بچوں کی تعلیم، شادی بیاہ کے معاملوں سے لے کر رشتے داروں سے لین دین تک سب میں انہی کی مرضی چلتی تھی۔ وہ سوچتیں، شاید باپ اور دادا کی رگوں میں ایک ہی خون دوڑ رہا ہے اس لیے دونوں ایک جیسے ہیں اور خالو امتیاز تو اسے ہمیشہ سے ہی بہت اچھے لگتے تھے۔ نرم مزاج، کم گو بہت آہستگی سے ٹھہر ٹھہر کر دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے مگر ایک بار جب انہیں خالہ کے گھر ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے خالہ کو چپکے چپکے روتے دیکھا۔ خالو امتیاز چپکے چپکے ہولے سے نشتر چھوٹتے تھے۔ شک اور شبہ کے زہر میں ڈوبے ہوئے الفاظ کے نشتر۔

”فلاں سے نہ ملو۔“

”فلاں سے بات مت کرو۔“

”تمہارا بہنوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔“

”ریاض بھائی سے بڑی ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی تھی۔“

انہیں حیرت ہوئی کہ پندرہ سالہ رفاقت کے باوجود انہیں اس عورت پر اعتماد نہیں تھا جس نے ان کے چار بچوں کو جنم دیا تھا اور محض ان کی خوشنودی کے لیے کئی رشتے داروں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

پھر معروف آپا تھیں جن کے میاں دانتوں سے پیسا پکڑتے تھے۔ وہ بے چاری ہمیشہ روتی ہی رہتیں۔ ایک ایک پیسے کا یوں حساب لیتے جیسے انہیں ڈر ہو کہ اپنے میکے والوں کو کھلا دیتی

ایک ایسا مرد جو فراخ دل ہو۔

جو محبت کرنے کا ہنر جانتا ہو۔

جو عورت کو محکوم نہ سمجھے، کمتر نہ جانے بلکہ برابری کا درجہ دے۔

جو عورت کو دوست رکھے، اس پر اعتماد کرے، اس کا احترام کرے۔

کبھی وہ سوچتیں، شاید عورت مرد کی دست نگر ہے اس لیے مرد عورت کو دباتا ہے.....

مگر..... میں خود کو مرد کا دست نگر نہیں بناؤں گی۔

یہ فیصلہ کر کے وہ پڑھتی چلی گئیں۔ بے حد بے حساب اماں بی نے بوکھلا بوکھلا کر انہیں روکنا چاہا لیکن وہ آگے ہی آگے پڑھتی گئیں یہ الگ بات تھی کہ جوں جوں ان کا علم بڑھا، مشاہدے میں اضافہ ہوا، انہیں پتا چلا کہ خود مختار عورت تو اور بھی مجبور ہے۔ وہ تو دہرے عذاب سے گزر رہی ہے۔ شوہر کی ناز برداریاں الگ، دفتر کی ذمے داریاں علیحدہ تب انہوں نے سوچا کہ وہ شادی ہی نہیں کریں گی۔

اماں مٹیں کر کر کے التجائیں کر کر کے ہار گئیں تو اللہ سے لو لگا بیٹھیں۔ سارا وقت جانماز بچھائے، ہاتھ اٹھائے دعا مانگا کرتیں۔

دادی نے سمجھایا ”دیوانی ہوئی ہے لڑکی۔ بھلا یوں بھی کبھی زندگی گزرے گی۔ ایسی لڑکیوں کی عزت نہیں ہوتی جن کا گھربار نہ ہو۔“

”گھر ہے تو۔“

”یہ تو تمہارے بھائیوں کا گھر ہے۔“

”اچھا تو میں اپنا گھر بنا لوں گی۔“

”اکیلی عورت بھی کبھی گھر بنا پائی ہے! گھر تو مرد سے بناتا ہے۔“

”مگر میں گھر بنا لوں گی، تنہا، اکیلے آپ دیکھیے گا۔“

انہوں نے ایل، ایل، بی کے بعد اس فیلڈ میں زیادہ اسکوپ نہ دیکھ کر یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا اور وہیں انہیں عرفان مرزا ملا۔

خوبصورت، وجہہ ذہین۔

”سنو سنو! میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ اگر تم اجازت دو تو میں اپنی والدہ کو تمہارے گھر بھیجوں؟“ ایک روز لائبریری میں شادی کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اچانک عرفان مرزا نے کہا تو وہ چونک پڑیں۔

ہوں گی۔

”آج آلو زیادہ کیوں پکا دیئے؟ حرام کی کمائی ہے کہ ضائع کی۔“

”یہ گوشت میں گھی اتنا زیادہ کیوں ہے؟“

معروف آپا کی باتیں سن کر ان کے سر میں درد ہونے لگتا۔

نچلے طبقے کی عورت تو بے چاری اور بھی مظلوم تھی۔ وہ ماسی فضل نور کو ترتم بھری نظروں سے دیکھتیں۔۔۔

نچلے طبقے کی عورت جب کنواری ہو تو باپ اور بھائی کے تھپڑ اس کا نصیب ہوتے ہیں۔

بیانی گئی تو میاں کی جوتیاں اور بیٹے جوان ہوئے تو ان کی لاتیں اور مکے۔ ماسی فضل نور اس کی زندہ مثال تھی۔

وہ ہر ایک کو اپنی ہی نظر سے دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں اس لیے اب انہیں دنیا کی ہر عورت مظلوم نظر آتی تھی کہ عاتکہ بھابی بھی جن کی خوشحال زندگی پر عورتیں رشک کرتی تھیں۔ وہ اکثر سہیل بھائی سے الجھ پڑتیں۔

”آخر آپ عاتکہ بھابی کو کیوں مجبور کرتے ہیں کہ وہ آپ کی پسند کے کپڑے پہنے؟

آپ کی پسند کا زیور، آپ کی پسند کا کھانا کھائے۔ آخر ان کی اپنی بھی تو کوئی پسند ہے۔“

عاتکہ بھابی کو شادی سے پہلے سرخ، نیلے، میرون، ان سب رنگوں سے چڑھتی جب کہ سہیل بھائی کو یہی رنگ پسند تھے اور شادی کے بعد عاتکہ بھابی انہی رنگوں میں نظر آتیں۔

”آخر سہیل بھائی آپ پر اپنی ہی پسند کیوں مسلط کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ چڑھتی لیکن عاتکہ بھابی مسکراتی رہتیں۔

”اے بنو جب تیری شادی ہوگی نا تو تجھے پتا چلے گا کہ محبت سے کوئی زہر بھی دے گا تو آب حیات معلوم ہوگا۔“

”یہی تو مرد کی عیاری ہے کہ جہاں طاقت سے کام نہیں چلتا وہاں محبت کے فریب سے کام نکال لیتا ہے۔“

پھر وہ مرد کی حاکمیت سے خوفزدہ ہو گئیں۔ مرد آخر حاکم ہی کیوں ہوتا ہے؟ دوست کیوں نہیں ہوتا؟ وہ سوچتیں انہوں نے عہد کر لیا کہ وہ کسی ایسے مرد کو اپنی زندگی میں داخل نہ ہونے دیں گی جو ان پر حاکم بن کر رہے۔ انہوں نے دل ہی دل میں ایک مکمل مرد کا آئیڈیل بنالیا، ایک پیکر تراش لیا۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ تم مجھے اچھی لگی ہو۔“

”اچھا۔“ وہ ہنس دیں۔

پتا نہیں، مرد عورت کی ذہانت سے متاثر ہوتا ہے یا اس کے حسن سے، یہ بات ان کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی تھی۔ شاید مرد عورت سے متاثر ہوتا ہی نہیں ہے۔ وہ محض اپنی ضرورت پوری کرتا ہے۔ اپنی انا کی تسکین کے لیے عورت کی طرف بڑھتا ہے۔ معلوم نہیں، عرفان مرزا ان کے حسن سے متاثر ہوا تھا یا ان کی ذہانت سے؟ انہوں نے دھیان سے اسے دیکھا۔

”تو پھر“ عرفان مرزا نے پوچھا۔

”ابھی نہیں“ یہ ان کا جواب تھا۔

انہوں نے سوچا، پہلے وہ اسے اچھی طرح پرکھ لیں۔ دیکھ لیں کہ کیا وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے جو انہوں نے بنا رکھا تھا۔

اب وہ گھنٹوں عرفان مرزا سے عورت کے حقوق پر بحث کیا کرتیں۔ عرفان کو ان کی اکثر باتوں سے اتفاق تھا۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ عرفان مرزا وسیع دل و دماغ کا آدمی ہے۔ اس کے دل میں عورت کے لیے احترام ہے، عزت ہے لیکن شاید سب مرد شادی سے پہلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وسیع القلب، نرم مزاج، معروف آپا کے میاں بھی تو شادی سے پہلے یوں ہی نظر آتے تھے۔ فراخ دل، محبت کرنے والے مگر ان ساری توجیہات کے باوجود وہ عرفان مرزا کی طرف کھینچ رہی تھیں اور ممکن تھا کہ وہ عرفان مرزا کے سامنے ہتھیار ڈال دیتیں کہ عین وقت پر انہیں دادی اماں کی وہ بات یاد آگئی جو ایک بار نہ جانے کس معاملے میں انہوں نے کہی تھی۔ ”شخصیت میں تو رو و بدل ممکن ہے لیکن سرشت نہیں بدل سکتی اور مرد کی سرشت بھی نہیں بدل سکتی، وہی حکم چلانے کی اور عورت کو محکوم سمجھنے کی۔“

چنانچہ انہوں نے بڑی شائستگی سے معذرت کر لی۔

”سوری عرفان! میرا فی الحال شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔“ اور عرفان کے چہرے کے

تاثرات دیکھے بغیر وہ وہاں سے چلی آئیں۔

پھر کچھ عرصے بعد یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لے کر وہ ایڈنبرا کی طرف پرواز کر گئیں اور اماں بی کے دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ اٹھے ہی رہ گئے۔ وہ اپنی اس ضدی اور سرکش بیٹی کو نہ روک سکیں جو یورپ کی عورت کو خوش نصیب سمجھتی تھی، لیکن وہاں جا کر اور بھی مایوس ہو گئیں

ان کے اپارٹمنٹ میں رہنے والی ہسپانیہ کی سوزینا جب راتوں کو چینیں مار مار کر روتی تو وہ بیزار سی ہو جاتیں اور سوچتیں کہ عورت ہر جگہ مظلوم ہے خواہ وہ دنیا کے کسی خطے، کسی ملک میں ہو۔

اسٹیلہ اور لورین لڑکوں کے گرد منڈلاتیں تو انہیں کوفت ہوتی اور اس نتیجے پر پہنچتیں کہ عورت نے خود اپنا مرتبہ گھٹایا ہے اور مرد کو موقع دیا ہے کہ وہ اس پر حکومت کرے انہیں ان لڑکیوں پر ترس آتا جو روزگار کی تلاش میں آنے والے پاکستانیوں کو جو ہوٹلوں میں برتن دھوتے اور بیرا گیری کرتے تھے، پاکستانی شہزادے سمجھ کر اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔

”یہی پاکستانی شہزادے جب تمہیں اپنے دو کمروں کے گھر میں لے جا کر بند کر دیں گے اور ذرا ذرا سی بات پر حکم چلائیں گے تب تمہاری سمجھ میں آئے گا احق لڑکیو۔“ وہ انہیں سمجھاتیں۔ ”یہاں کی عورت تو اور بھی قابل رحم ہے۔ ڈیپریشن کا شکار۔“

یہاں بھی انہوں نے اپنا ایک حلقہ بنالیا اور اکثر عورتوں کے حقوق پر دھواں دھار تقریریں اور مباحثے ہونے لگے۔

ولیم جوز ان کا مذاق اڑاتا۔ تمہاری ساری کوششیں بے کار اور بے فائدہ ہیں شامکہ ملک۔ دنیا جیسی ہے، ویسی ہی رہے گی اور تم رتی بھر بھی اس میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکو گی اور یہ جو تم ہر ہفتے لمبی چوڑی تقریریں کرتی ہو۔ بالکل بے اثر ہیں۔ عورت اپنی محکومی میں ہی خوش ہے شامکہ ملک اور تم تو آج تک سوزین کو صاحبزادہ اطہر علی سے ملنے سے نہیں روک سکیں۔ جو بقول تمہارے فلرٹ کرنے والا قطعی ناقابل اعتبار آدمی ہے۔ ارے تم تو اپنی صنف کو بھی نہیں سمجھا سکتیں۔ مردوں کو کیا سمجھاؤ گی۔“ مگر ولیم جوز کی باتیں انہیں بہکا نہیں سکتی تھیں کیونکہ وہ اپنے عقیدوں میں پختہ تھیں۔

ولیم جوز کو سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں والی پاکستانی لڑکیاں اچھی لگتی تھیں جن کی بے باکی میں بھی حجاب تھا۔

رنگوں میں ملاحظت تھی۔

آنکھوں میں کشش تھی۔

”سنو پیاری لڑکی! یہ آئیڈیل مرد وغیرہ کا چکر چھوڑ کر کسی سیدھے سادے بندے سے شادی کر لو۔“ ولیم کی نیلی آنکھیں شرارت سے چمکتیں۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے معاملات میں کبھی دخل نہیں دوں گا۔ کبھی تم پر حکم نہیں چلاؤں گا اور.....“ وہ ہنس دیتیں۔ ”شرارت نہیں ولیم جوز! مذاق مت سمجھو۔ میں سنجیدہ ہوں۔ عورتوں کی

غلامی ختم ہونے کے باوجود دنیا کے ہر خطے میں عورتیں زنجیروں سے بندھی ہوئی ہیں اور میں یہ زنجیریں توڑنا چاہتی ہوں لیکن المیہ یہ ہے کہ نوے فیصد عورتوں کو یہ زنجیریں نظر نہیں آتیں۔
”چہ۔ چہ۔۔۔۔۔ احمد رضا افسوس کرتا۔“

”تم کن عورتوں کی باتیں کرتی ہو شائلہ ملک؟“ سبحانی صاحب سنجیدگی سے کہتے۔ ”میں نے تو عورت کو ہمیشہ حاکم ہی پایا ہے۔ بے چارے میرے والد ہمیشہ میری ماں سے ڈرتے رہے اور میرے دادا، سنا ہے اکثر دادی کے خوف سے چارپائی کے نیچے چھپ جایا کرتے تھے۔“
اور یہ محفل جو بڑی سنجیدگی سے شروع ہوئی، اکثر ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتوں پر ختم ہو جاتی۔

وقت گزرتا رہا۔ انہوں نے ایم۔ فل کیا، پھر پی۔ ایچ ڈی کی اور ڈگریوں میں مزید اضافے کے ساتھ وطن آنے لگیں۔ سارے دوست انہیں خدا حافظ کہنے آئے تھے۔
”اگر کبھی تمہارے معیار میں کچھ لچک پیدا ہو جائے تو مجھے یاد کر لینا۔“ ولیم جونز نے ایئر پورٹ پر سرگوشی کی۔ اس وقت اس کی نیلی آنکھیں بے حد اداس لگ رہی تھیں۔

مگر وہ ان ساری نیلی، کالی اور براؤن آنکھوں کے سحر سے بچتی رہیں اور وطن میں ایک بڑے شہر کے بڑے کالج میں پرنسپل بن گئیں اب ان کے پاس سب کچھ تھا۔ دولت عزت، شہرت اور گھر اگر دادی اماں زندہ ہوتیں تو وہ انہیں دکھاتیں کہ انہوں نے گھر بنالیا ہے، خوب صورت، مضبوط گھر، مرد کے سہارے بغیر، تنہا۔

شہر کے ہنگاموں سے دور مضافات میں ان کی شاندار کوشی تھی۔ چاروں طرف سے اونچی مضبوط چار دیواری میں گھری یہ کوشی ان کے لیے ایک مضبوط اور محفوظ پناہ گاہ تھی۔ اس گھر میں رہتے ہوئے انہیں کئی برس بیت گئے تھے۔ ماں دعائیں مانگتے مانگتے قبر میں جاسوئی تھیں۔ بہن بھائی سب اپنے اپنے گھروں میں خوش تھے اور وہ خود اپنی زندگی سے بہت مطمئن تھیں زندگی کے طویں سفر میں انہیں عرفان مرزا کے بعد بھی بہت لوگ ملے تھے۔ اطہر علی، سبحانی صاحب، سجاد، رضا، حامد علی مگر کوئی بھی ان کے کڑے معیار پر پورا نہیں اتر سکا تھا۔ وہ سوچتی تھیں کہ وہ کیوں کسی کی محکوم بنیں۔ وہ خود کماتی ہیں۔ ان کے پاس زندگی کی ساری آسائشیں۔ ساری سہولتیں ہیں۔

وہ معاشی طور پر مرد کی دست نگر نہیں تھیں پھر بھی مرد کی رفاقت سے ڈرتی تھیں کہ مرد ان سے حاکمیت کے نقشے میں چور ہے، عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے۔ وہ مرد کے پاؤں کی جوتی نہیں بننا چاہتی تھیں اس لیے اپنی تنہا زندگی سے پورے طور پر مطمئن تھیں۔ ایک وہ تھیں جنہوں

نے مرد کی حاکمیت سے بچنے کے لیے اچھے اچھے مردوں کو ٹھکرا دیا تھا اور ایک آمنہ تھی جو صدو سے پٹ کر پھر وہیں گھسکتی تھی۔ انہوں نے سوچا آج واپس آ کر وہ آمنہ کو اچھی طرح سمجھائیں گی کہ آخر وہ کیوں صدو کی دھونس میں آتی ہے جب کہ معاشی جدوجہد میں وہ برابر کی شریک ہے۔

اس روز سیمینار میں خاصی دلچسپ گفتگو رہی۔ بحث کا موضوع ”آج کی عورت“ تھا۔ سیمینار میں شرکت کرنے والی ساری خواتین اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ اونچے آدرش، بلند معیار رکھنے والی، ان میں شادی شدہ بھی تھیں اور غیر شادی شدہ بھی۔ مختلف کالجوں کی پرنسپلز اور پروفیسرز بھی۔ یہ سیمینار انہی کے ایما پر ہو رہا تھا۔ وہ اکثر ایسے سیمینار پارٹیاں اور محفلیں، اربنج کرتی رہتی تھیں۔ آج انہوں نے اپنی تقریر میں بہ طور خاص آمنہ کا ذکر بھی کیا تھا۔ ڈاکٹر اکرام سلطانہ نے آخر میں اپنی تقریر میں انہیں سراہا اور ان کے لائف پیٹرن کو قابل رشک قرار دیا۔

اس کامیاب سیمینار کے بعد وہ گھر لوٹیں تو بہت تھکی ہوئی تھیں اس لیے انہوں نے سوچا کہ وہ صبح آمنہ سے بات کریں گی۔ مگر صبح ان کے اٹھنے سے پہلے ہی آمنہ صدو کے ساتھ جا چکی تھی۔ انہیں آمنہ کی حماقت اور جہالت پر بہت غصہ آیا اور جب وہ حسب معمول دوپہر کو کام کے لیے آئی تو انہوں نے اسے خوب جھاڑا؟ ”عجب عورت ہو ذرا بھی عزت نفس نہیں تم میں؟“

آمنہ بھی سر جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی ”کیا کروں جی مرد ہے نا، غصہ آ جاتا ہے۔ پھر منانے بھی تو خود ہی آیا تھا میں آپ چل کر تھوڑی گئی تھی۔“
انہوں نے بیزاری سے سوچا، صدیوں کی اس محکوم عورت کو سمجھانا فضول ہے وہ یونہی سر کھپا رہی تھیں۔ یہ اپنی محکومیت میں ہی خوش ہے جاہل عورت۔

وہ بیزاری اٹھ گئیں۔

☆☆☆

ساوان کا مہینہ انہیں ہمیشہ ہی بیزار کر دیتا تھا۔ بجلیاں اور بادل انہیں بچپن سے ہی خوف زدہ کر دیتے تھے وہ کھڑکیاں، دروازے بند کر کے لائین جلا کر بیٹھ رہتی تھیں اور اب کے تو جو ساوان شروع ہوا تھا تو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس روز بھی وہ کالج سے آئی ہی تھیں کہ یکا یک آسمان بادلوں سے بھر گیا۔ دن میں بھی رات کا سماں ہو گیا تھا۔ آمنہ کام ختم کر کے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ ”آج ادھر ہی رک جاؤ آمنہ! بارش ہونے والی ہے۔“

”قیوم گھر پر اکیلا ہوگا۔ بارش ہوگئی تو ڈرے گا۔ صدو بھی مزدوری کے لیے شہر گیا ہوا ہے۔“ اور وہ آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”بارش سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گی جی۔“

مضبوط، اونچی چار دیواری جس پر شیشوں کے نوکیلے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ پٹھان چوکیدار تھا۔ ان کا گھر تو ان کے لیے بڑی محفوظ پناہ گاہ تھی۔ بس کبھی کبھی وہ یوں ہی بچوں کی طرح خوف زدہ ہو جاتی تھیں..... یہاں اس گھر میں کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ یہاں وہ اپنی مرضی سے سانس لیتی تھیں اور اپنی مرضی سے زندگی گزار رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا۔ ”در اصل میں بورہ رہی ہوں۔“

لمبی چھٹیاں ہمیشہ ہی انہیں بیزار کر دیا کرتی تھیں۔ سو وہ ڈاکٹر اکرام سلطانہ سے ملنے چلی گئیں۔ پھر کبھی مسز کرامت سے، کبھی رابعہ یزدانی سے اور کبھی عارفہ احمد علی سے ملنے چلی جاتیں۔ کئی دن مصروف گزر گئے مگر گھر آتے ہی وہی بیزاری اور یوریت، اندر کا خالی پن بولنے لگتا اور سناٹا گہرا ہو جاتا گھنٹوں آمنہ اور خاندان کی بیوی سے ادھر ادھر کی لالچیں باتیں کرتی رہتیں مگر یہ ایک ایکی جوان کے اندر خلا سا پیدا ہو گیا تھا، پر ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

رفاقت کی تمنا۔

دوسرا ہٹ کی خواہش ان کے اندر کروٹیں لے رہی تھی۔

کوئی ہو جو ان پر حکم چلائے، جوان کے لیے، ان کی خاطر بارش میں گھر آئے۔ ڈھیروں ساریاں سامنے پھیلائے وہ گھنٹوں سوچا کرتیں کہ کون سی ساڑی باندھیں۔ یوں سوچتے ہوئے سہیل بھائی عاتکہ بھابی کے لیے اپنی پسند کے کپڑے نکالتے ان کی نگاہوں کے سامنے آ جاتے۔

پھر مدتوں بعد انہیں عرفان مرزا یاد آیا جو جینس تھا۔ پوری یونیورسٹی میں پاپولر تھا اور لڑکیاں اس کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں لیکن جوان کی ذہانت سے متاثر تھا۔

اور پھر ولیم جوز جس نے ایک بار سب کے سامنے قسم کھائی تھی کہ اگر شکالہ ملک اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو وہ اسی وقت مسلمان ہو جائے گا وہی ولیم جوز جو ان کے اصولوں کا مذاق اڑاتا تھا۔

اور سجاد حیدر، جو بہت مخلص تھا۔

حامد علی، جو ہر دم ہنستا ہنساتا رہتا تھا۔

اتنے بہت سارے مردوں میں سے کوئی ایک مرد بھی ایسا نہیں تھا جس کا ہاتھ وہ اعتماد اور یقین کے ساتھ تھام سکتیں۔ وہ تاسف سے سوچتیں۔ عرفان مرزا نے تو کبھی ان کی باتوں سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ حامد علی تو خود عورتوں کو برابری کا درجہ دینے کا حامی تھا اور سجاد حیدر تو تھا ہی

وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں اور پھر تو ایسی بارش ہوئی کہ بجلی کے تار ٹوٹ گئے اور ٹیلی فون کے کھمبے گر گئے۔ تین روز مسلسل دن رات بارش ہوتی رہی اور وہ تین راتیں سو نہ سکیں۔ چوتھے دن سہ سے سہ سے سورج نے بادلوں کی اوٹ سے سر نکالا۔ تو آمنہ بھی آگئی۔ آمنہ کی آواز سن کر وہ باہر آ گئیں۔

”بڑی تباہی ہوئی جی“ آمنہ نے کہا۔

”ہاں مجھے تو تین راتیں مارے خوف کے نیند ہی نہیں آئی“ وہ تھکی تھکی سی کرسی پر گر پڑیں ان کا سر بو جھل ہو رہا تھا۔ ”تمہارے گھر کا کیا حال رہا۔“

”اللہ نے بڑا کرم کیا جی ورنہ اگر گرد تو کئی گھروں کی چھتیں گر گئیں اور ادھر پیچھے پورے کے پورے جھونپڑے اڑ گئے۔“

”توبہ! بارش بھی تو بڑی طوفانی تھی نا۔“

”اور ہوائیں کیسے چیختی تھیں۔“

انہوں نے جھرجھری لی۔ ”تمہیں ڈر تو بہت لگا ہوگا۔“

”ڈر کس بات کا جی، اپنا آدمی پاس ہو تو ڈر کیسا۔“

”مگر صد تو شہر گیا ہوا تھا۔ تم نے یہی بتایا تھا نا۔“

”آ گیا تھا جی۔“

”اس طوفانی بارش میں! کیا شہر میں کوئی جاننے والا نہیں تھا؟“

”شہر میں رہنے کو تو بہت ٹھکانے تھے جی، پر میرے خیال سے آ گیا اور میں نے بھی جی شکر کیا۔ گھر میں یوں تو ساس سر بھی تھے۔ پر اپنے مرد کا بڑا سہارا ہوتا ہے جی۔ اپنا مرد پاس ہونا تو جی، مٹی کی چار دیواری بھی زنانی کے لیے بڑی محفوظ پناہ گاہ بن جاتی ہے۔ صد نہیں آیا تھا۔ تو جی مجھے بھی ڈر لگ رہا تھا۔“

انہیں لگا جیسے ان کا اندر ایک دم بالکل خالی خالی ہو گیا ہو۔ انہیں چپ دیکھ کر آمنہ انھی اور برتن دھونے چلی گئی۔

”اپنے مرد کا بڑا سہارا ہوتا ہے جی۔ صد نہیں آیا تھا تو جی.....“ سارا دن رہ رہ کر آمنہ کی باتیں ان کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ انہوں نے خود کلامی کی۔

”اوہ۔ نان سنس۔ جاہل لوگوں کی جاہلانہ باتیں۔“ انہوں نے گھوم پھر کر اپنے گھر کا

بہت مخلص، بہت ہمدرد، پھر کیا انہوں نے غلط کیا تھا..... نہیں جو کیا، اچھا کیا۔ آخر وہ مردوں کی دست نگر بن کر کیوں رہیں جبکہ وہ اپنے طور پر زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ جانتی تھیں۔ مگر آمنہ کی انجانے میں کبھی ہوئی باتیں ان کے برسوں سے بنائے ہوئے آدرش اور نظریات کو توڑ پھوڑ کر دیتی تھیں۔ عمر کے اس دور میں جب وہ زندگی کے بہت سارے سال تنہا گزار آئی تھیں، بغیر کسی تاسف اور پچھتاوے کے، لیکن اب کبھی کبھی دوسرا ہٹ کی خواہش ان کے اندر ہلچل مچا دیتی مگر انہیں اپنے آپ پر بڑا اختیار تھا۔

دراصل ساری بات یہ ہے کہ میرے پاس کرنے کی لیے کوئی کام نہیں ہے۔ انہوں نے سوچا اور کلب جو ان کرلیا یوں وقت اچھا گزرنے لگا۔ پھر چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں تو وہ کالج جانے لگیں وہ ایک بار پھر بے حد مصروف ہو گئیں تھیں سیمینار، پارٹیاں، مباحثے، آمنہ سے تو اب صرف چھٹی والے دن ہی ملاقات ہوتی تھی۔

”کیوں آمنہ اب صدمہ پٹائی نہیں کرتا؟“ کبھی کبھی وہ اس سے پوچھتیں۔
 ”نہیں جی۔“ وہ شرماتی۔ ”پٹائی کیسی جی، میاں بیوی میں تو کبھی اونچی نیچی بات ہو ہی جاتی ہے ناجی درنہ تو وہ میرا بہت خیال کرتا ہے۔“

انہیں آمنہ پر حیرت ہوتی۔ ”کیسی ہے یہ عورت، خوش مطمئن۔“
 کبھی کبھی وہ بڑی فلسفیانہ باتیں کرتی، بالکل دادی اماں کی طرح ”تہا عورت تو جی بڑی غیر محفوظ ہوتی ہے۔“
 ”اپنے گھر میں بھی؟“ وہ پوچھتیں۔

”ہاں جی۔ اینٹ پتھر کی دیواریں بھی کبھی سہارا ہوتی ہیں! سہارا تو اپنے مرد کا ہی ہوتا ہے۔“

”تو نے یہ اتنی ساری باتیں کہاں سے سیکھی ہیں آمنہ۔“
 ”شادی سے پہلے میں جن بیگم صاحبہ کے گھر کام کرتی تھی وہی بتایا کرتی تھیں پتا ہے بیگم صاحب جی، ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے بابا ان سے بہت پیار کرتے تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں ان کی موت کے بعد بھائی اور بھائیاں ان کے ساتھ برا سلوک نہ کریں۔ تو پتا ہے جی انہوں نے کہا تھا کہ یہ اینٹوں اور پتھروں کی چار دیواری مجھے کیا تحفظ دے گی بابا۔ آپ نے میرے نام کچھ کرنا ہی ہے تو ان سب کی جتنیں میرے نام کر دیں آپ بھی بیگم صاحب جی شادی کر لیں یہ اتنا بڑا گھر ہے ڈر نہیں لگتا جی آپ کو؟“

ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ آمنہ بی کو کیا سمجھائیں کہ ان کا موقف کیا تھا اور وہ مرد کی حاکمیت پسند نہیں کرتیں وہ جو سب کو اپنے دلائل سے قائل کر لیتی تھیں۔ آمنہ کو قائل نہیں کر سکتی تھیں جو جاہل تھی، ان پڑھ تھی۔

”نہیں ڈر کیا؟“ وہ آمنہ کو اطمینان دلاتیں چونکہ ہر وقت گیٹ پر موجود رہتا ہے۔
 ”پھر بھی جی۔“ آمنہ کی سوالیہ نظریں ان کے چہرے پر ٹک جاتیں۔ وہ عجیب نظروں سے انہیں دیکھتی۔ وہ نظریں چرا لیتیں۔ موضوع بدل دیتیں لیکن آمنہ کی باتیں اکثر تنہائی میں انہیں ڈسٹرب کرنے لگیں۔ اکثر راتوں کو وہ اٹھ کر بیٹھ جاتیں اور کوئی انجانا سا خوف انہیں گھیر لیتا۔

تنہائی کا خوف۔

اکیلے پن کا ڈر۔

آمنہ کی سوال کرتی، کھوجتی نظریں انہیں اپنے وجود میں چھپتی محسوس ہوتیں۔ اس کی باتیں کانوں میں نشتر چبھوتیں اور خود اپنے ہی قائم کردہ نظریات انہیں اپنا مذاق اڑاتے نظر آتے۔
 ولیم جونز کہتا تھا۔ ”دیکھنا..... دیکھ لینا شاکلہ ملک ایک دن تمہارے نظریات خود تم پر نہیں گے۔“

”اگر کبھی تمہیں عقل آ جائے حسین لڑکی تو مجھے یاد کر لینا۔ میں سر کے بل بھاگتا ہوا آؤں گا۔“ حامد علی سرگوشی کرتا۔

”اوہ نان سنسن یہ سب بکواس ہے۔“ وہ خود کو تنبیہ کرتیں لیکن اس کشمکش نے بالآخر انہیں بیمار کر ڈالا۔ وہ روز بہ روز کمزور ہوتی جاتی تھیں۔ ذہنی اور جسمانی تھکن سے ڈاکٹر نے انہیں آرام کرنے کی تلقین کی۔

کولنگز، دوست، احباب سب ایک ایک بار آ کر چلے گئے وہ دن بھرتیوں کے سہارے لیٹی پڑھا کرتیں۔ تھک جاتیں تو آنکھیں موند کر پڑ رہتیں۔ آمنہ کام کر کے کبھی کبھی ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتی اور اپنی بھاری مگر خوبصورت اور پرسوز آواز میں انہیں مایہ سنانی۔ وہ آنکھیں موندے سنا کرتیں۔

اس روز بھی وہ بڑی بوریت محسوس کر رہی تھیں۔ کچھ پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ آمنہ بھی چار دن سے نہیں آ رہی تھی۔ درنہ اسی سے کچھ سنیں، کچھ باتیں کرتیں تو دل بہل جاتا۔ خانساں نے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آنکھیں موندے اسی کے بارے میں سوچ رہی تھیں کہ آمنہ نے پردہ اٹھا کر انہیں سلام کیا۔ ”سلاما لیکم بیگم صاحب جی۔“

چونک کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور خوش ہو کر بولیں۔ ”میں تمہارے ہی بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔ کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں جی، بس بخار ہو گیا تھا۔ آپ تو ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں مگر پتا نہیں اندر سے کمزوری ختم نہیں ہوتی۔“

”آپ ابھی آرام کریں جی۔ کام بھی تو بہت کرتی ہیں نا آپ۔“

وہ اس کے غلوں پر مسکرا دیں۔ ”اچھا بتاؤ یہ نا وقت کیسے آگئیں؟“

”وہ جی“ آمنہ کچھ جھجک سی گئی پھر بولی:

”کچھ پیسے کی ضرورت تھی۔ آنا منگوانا تھا۔ اصل میں جی میں بیمار تھی نا تو صدو بھی کام پر نہیں گیا۔ بہت کہا کہ تم چلے جاؤ مگر وہ تو ایسا ہی ہے جی۔ ذرا میرا جی مندا ہوتا ہے تو پٹی سے لگ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب بھی تین دن سے مزدوری پر نہیں گیا تھا جی۔“

ان کے اندر وہی بے نام سے سنائے گونجنے لگے۔ آمنہ بولے جا رہی تھی۔ ”زبردستی اپنے ہاتھوں سے دوا پلاتا ہے۔ سرد باتا ہے۔۔۔۔۔ آج بھی میں نے فٹیں کر کے بھیجا ہے۔“

انہوں نے بے دھیانی سے اس کی طرف دیکھا اور تکیے کے پاس سے پرس اٹھا کر پیسے نکالے۔ ”شکریہ جی اللہ آپ کو خوش رکھے جی۔“ آمنہ انہیں دعائیں دیتی ہوئی کھڑی ہو گئی مگر انہوں نے شاید اس کی بات سنی ہی نہیں۔ ان کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا اور دل ایک دم خالی خالی ہو گیا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے آمنہ کو دیکھ رہی تھیں۔

”ایسٹ، پتھر کی چار دیواری نے بھی کبھی عورت کو سہارا دیا ہے جی۔ سہارا تو اپنا مرد ہی ہوتا ہے۔“ ان کے کانوں میں آمنہ کی آواز گونجی۔

انہوں نے حسرت بھری نظروں سے آمنہ کو دیکھا جو اپنے کچے مٹی کے گھر میں ان سے کہیں زیادہ محفوظ تھی۔

”سلام بیگم صاحب جی“ آمنہ انہیں سلام کر کے باہر نکل گئی۔

انہیں لگا جیسے ان کی مضبوط پناہ گاہ، سیمنٹ اور کنکریٹ سے بنی ہوئی مضبوط چار دیواری یکا یک کچی، بھر بھری مٹی کی دیواری طرح ڈھس گئی ہو اور وہ اتنی بڑی دنیا میں تنہا اور غیر محفوظ رہ گئی ہوں۔

”عرفان مرزا“ ان کے ہونٹ تھر تھرائے۔

”حامد علی“ انہوں نے سسکی لی۔

”ولیم جونز“ اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

چھاپ

مجھے مینو پر بہت ترس آتا ہے جب وہ زندہ تھی تب بھی اور اب جب وہ مر گئی ہے تب بھی۔ پتا نہیں کیوں میں اس سے کبھی نفرت نہ کر سکی۔ حالانکہ پورا حملہ ہی اس کا ذکر نفرت سے کرتا ہے۔ وہ اگر کہیں گلی میں نظر آ جاتی تو محلے کی عورتیں یوں کترا کر گزر جاتیں جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔ مجھے دکھ ہوتا تھا لیکن اسے اس کی پروا نہ تھی۔ وہ خود محلے والیوں کو کہاں اہمیت دیتی تھی۔ اس کے خیال میں سب محلے والیاں اس سے جلتی تھیں اس کے رکھ رکھاؤ سے اس کے پناوے سے اس کے فیشن سے۔

ایسے عرف مینو حنیف موچی کی بیٹی تھی۔ حنیف موچی کی دکان بالکل ہمارے گھر کے سامنے تھی۔ بس گلی کر اس کر کے سامنے اس کی دکان تھی۔ بڑا ہی بیا آدمی تھا نمازی اور پرہیز گار اور محلے میں اس کی بڑی عزت تھی۔ وہ حافظ قرآن بھی تھا اور پورا رمضان محلے کی مسجد میں تراویح پڑھاتا اور جب شبینہ ہوتا تو صبح تک قرآن ختم کرتا۔ وہ محلے میں سب کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف پرانے جوتوں کی مرمت کرتا تھا بلکہ نئے جوتے بھی بناتا تھا۔ پورے قصبے کے لوگ اسی سے جوتے بنوانا پسند کرتے تھے حالانکہ دوسرے محلوں میں دو تین اور موچی بھی جوتے بناتے تھے۔ لیکن حنیف موچی کے بنے جوتے زیادہ پائیدار اور مضبوط ہوتے تھے۔ اور ہی نہیں وہ ان میں جدت بھی پیدا کر لیتا تھا۔ مجھے یاد ہے بی جان کو تو بازار کے جوتے پسند ہی نہ تھے وہ ہمیشہ حنیف سے ہی جوتے بنواتی تھیں۔ قصبے میں اگرچہ دو تین دکانیں بنے بنائے جوتوں کی بھی تھیں شیشے کے شوکیں میں بچے جوتے بہت اٹریکٹ کرتے تھے۔ اس لیے جب میں نے ہائی سکول میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا تو میں نے ضد کی کہ میں سکول کے لیے نیا جوتا ”انگلش شو“ سے ہی خریدوں

گی۔ اور جب میں انگلش شوز سے ”سیاہ بچپی“ لے کر آئی تو کتنے ہی دن تک اتراتی پھری تھی لیکن وہ بٹے بعد ہی اس کا تالا الگ ہو گیا تھا۔

”یہ یہاں قصبے میں گھنٹیا میٹرل سے بنا ہوا مال لاتے ہیں۔“
بی جان نے مجھے سمجھایا۔

ان کے خیال میں گاؤں اور قصبوں کے سیدھے سادے لوگوں کو بیوقوف بنانا آسان ہوتا ہے۔ اور ہم ظاہر کی پوجا کرنے والے کم عقل لوگ ظاہری چمک دمک پر فدا ہو جاتے ہیں۔

جوتے کی دو تین بار حنیف موچی سے مرمت کروانے کے بعد بی جان نے حنیف سے کہہ کر آرڈر پر میرے لیے نیا جوتا بنوایا۔ جو نہ صرف پائیدار تھا بلکہ آرام دہ بھی تھا اور دیکھنے میں بھی خوبصورت لگتا تھا دائیں طرف ایک چھوٹے سے گولڈن بگل میں ننھی سی بولگا کر حنیف نے اس میں انفرادیت پیدا کر دی تھی اور یوں مجھے یہ جوتا پسند آ گیا تھا۔

اور میں نے سوچا تھا کہ مجھے بی جان کی بات پہلے ہی مان لینا چاہیے تھی لیکن شاید ہر زمانے میں ہماری نسل کے لوگ اپنے تجربوں سے سیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

حنیف موچی کا گھر اس کی دکان کے ساتھ ہی تھا بلکہ دکان گھر کے اندر ہی بنائی گئی تھی جس کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور ایک اندر گھر کے صحن میں۔ دکان کے ساتھ گلی میں کھلنے والا وہ سرد دروازہ گھر کا مین گیٹ تھا۔ گھر پختہ مگر چھوٹا تھا..... لمبی سی ڈیوڑھی پھر چھوٹا سا صحن برآمدہ اور برآمدے کے اطراف تین چھوٹے چھوٹے کمرے کچن کا کام برآمدے اور صحن سے لیا جاتا تھا۔

گرمیوں میں صحن میں چولہا جلایا جاتا اور سردیوں میں برآمدے میں تیل کا چولہا رکھ لیا جاتا۔ ان دنوں ابھی قصبے میں گیس نہیں آئی تھی۔ بچپن میں چند بار میں ان کے گھر گئی تھی۔ اور مجھے ڈیوڑھی میں لکڑی کی پھلیوں پر رکھے خشک ہوتے چمڑے کی بو سے گھبراہٹ ہوتی تھی اور دل متلا جاتا تھا۔ چمڑے کے یہ ٹکڑے دھوپ میں چھت پر پڑے رہتے تھے اور جب خشک ہو جاتے تو ڈیوڑھی میں ڈال دیے جاتے تھے۔ چونکہ امینہ میری سہیلی تھی اس لیے میں دو تین بار اس کے اصرار پر اس کے گھر چلی گئی تھی۔ ورنہ بی جان میرا ہر کہیں جانا سند نہیں کرتی تھیں۔ اگر محلے میں وہ کہیں جاتیں کسی شادی بیاہ میں تو خود مجھے ساتھ لے کر جاتی تھیں۔

مینو میری سہیلی تھی اور حنیف موچی کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس سے چھوٹے اس کے آٹھ بہن بھائی اور تھے تین بہنیں اور پانچ بھائی۔ مینو شکل و صورت کی اچھی تھی بلکہ سب بہن بھائی ہی خوش شکل تھے۔ مینو کا رنگ گورا تھا اور نقوش میں جاذبیت تھی۔ پھر غالباً پہلی اولاد ہونے کی وجہ

سے ماں باپ نے اسے توجہ بھی بہت دی تھی۔ وہ بچپن سے ہی ہمارے گھر آ رہی تھی اس وقت سے جب اس سے چھوٹے صرف دو بہن بھائی اور تھے۔ اس کی عمر صرف چھ سال تھی..... وہ عمر میں مجھ سے تھوڑی سی بڑی تھی ڈیڑھ یا دو سال تقریباً ماسی بانو صبح صبح جب لسی بلوتی تو مدانی میں لگے گھنگھروں کی بجنے کی آواز سے میں اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی اور پھر ماسی بانو کے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر اسے لسی بلوتے اور لسی میں سے مکھن اکٹھا کرتے دیکھتی رہتی تھی..... اور اسے ہر روز میں ایک سی دلچسپی سے دیکھتی تھی۔ اور عموماً اسی وقت مینو ہاتھ میں سلور کا جگ لیے آتی اور جگ ماسی بانو کے پاس رکھ دیتی۔

”ماسی مجھے جگ بھر کر لسی دینا۔“

وہ ہر روز یہ جملہ ضرور کہتی تھی۔

”میں سپارہ پڑھ کر لسی لے جاؤں گی۔“

ایک بار اس نے میری طرف دیکھا۔

”تم سپارہ نہیں پڑھتیں کیا؟“

”پڑھتی ہوں لیکن میں مسجد میں نہیں جاتی میری بی جان مجھے پڑھاتی ہیں۔“

”بی جان تمہاری استانی ہیں۔“

اس نے پوچھا۔

”نہیں وہ میری امی ہیں۔“

”اچھا۔“

اسے جیسے مایوسی ہوئی تھی۔

”میری اماں تو مجھے نہیں پڑھاتیں۔“

پھر وہ ادھر ادھر دیکھ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

”یہ بی جان تمہیں سبق یاد کرنے پر مارتی ہیں۔“

”نہیں..... میں تو سبق یاد کر لیتی ہوں لیکن نہ کروں تب بھی وہ نہیں مارتیں۔ بس کہتی

ہیں سبق یاد کر کے سنا دو اور پھر چلی جاتا۔“

”مگر ہمارے حافظ جی تو ہمیں بہت مارتے ہیں۔“

اور مجھے اس پر ترس آیا..... پہلی بار۔ اور پھر ساری عمر ہی مجھے اس پر ترس آتا رہا۔ حتیٰ

کہ اس کی موت کے بعد بھی۔

”میں بی جان سے کہوں گی وہ تمہیں بھی پڑھا دیں۔“
میں نے اپنے دل میں اس کے لیے بے حد ہمدردی محسوس کی۔
”وہ مجھے بھی پڑھا دیں گی؟“
اس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔
”میں کہوں گی تو پڑھا دیں گی۔“
میرے لہجے میں فخر تھا۔

ماسی بانو ہماری باتوں پر مسکرا رہی تھی۔ مجھے مینو اچھی لگی تھی۔ صاف ستھری، دو پٹیا کیے اور صاف ستھرا کپڑے پہنے آنکھوں میں خوب کا جل لگا ہوا۔ اور میں نے دل ہی دل میں اسے سہیلی بنالیا۔ ہمارے گھر میں سارا دن محلے کی عورتیں آتی جاتی رہتی تھیں عموماً ان کے ساتھ آنے والے بچے میلے کپڑوں میں ملبوس ہوتے تھے اس لیے مجھے مینو میں انٹرکشن محسوس ہوئی تھی۔ ہم سیدھے اور ہمارا گھر محلے میں سب سے بڑا تھا۔ قصبے میں شاہ جی کی عزت تھی اگرچہ شاہ جی زیادہ زمینوں پر رہتے تھے گاؤں میں بھی بڑا سا گھر تھا لیکن بھائی کی پڑھائی کی وجہ سے شاہ جی نے یہاں گھر لیا تھا۔ میں نے یہاں اسی گھر میں آنکھ کھولی تھی گھر کے ساتھ بڑا سا احاطہ تھا جس میں گائیں بھیئیں وغیرہ تھیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ملازم تھے میرے اور امجد شاہ کی عمر میں نو سال کا فرق تھا اس لیے میں گھر میں بہت تنہائی محسوس کرتی تھی۔ اس لیے مینو سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ میں نے بی جان سے اس کی سفارش کی تھی۔

”حافظ جی اسے بہت مارتے ہیں اور پھر میں نے اسے سہیلی بنالیا ہے۔“
”اچھا۔“

بی جان ہنس پڑی تھیں اور انہوں نے میری بات کبھی نہیں مانی تھی یوں مینو میرے ساتھ بی جان سے سیپارہ پڑھنے لگی تھی۔ اور پھر جب دو ماہ بعد میں سکول میں داخل ہوئی تو بی جان نے مینو کی اماں سے کہا.....

”حمید اے تم ہی مینو کو سکول میں داخل کرو دو۔ آج کل پڑھائی کی بڑی قدر ہے۔“
ہاں اس کا ابا بھی کہہ رہا تھا لیکن یہ گھر ہوتی ہے تو ذرا چھوٹے بھائی کو سنبھال لیتی ہے۔
اس وقت مینو کی عمر سات سال تھی اور یہ اس سے چھوٹا تیسرا بھائی دنیا میں آیا تھا۔
”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تعلیم بھی بہت ضروری ہے حمید اے میرے پیارے رسول ﷺ نے

بھی علم حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔“

اور یوں مینو میرے ساتھ ہی سکول میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ اکثر شام کو اپنا بیگ اٹھا کر ہمارے گھر چلی آتی اور ہم اکٹھے بیٹھ کر سکول کا کام کرتے پھر کام سے فارغ ہو کر گزیوں سے کھیلتے رہتے یہاں تک کہ اس کا کوئی چھوٹا بہن بھائی اسے بلانے آ جاتا۔ بی جان بھی اس پر بہت شفقت کرتی تھیں۔ اور کبھی کبھار جب میرے لیے کوئی چیز منگواتی تو اس کے لیے بھی منگوا لیتیں۔ مثلاً چوڑیاں کلپ اور ایسی ہی چیزیں۔ اب کبھی کبھار وہ یوں ہی بنا کنگھی کیے اور ان دھلے کپڑوں کے ساتھ آ جاتی تو بی جان کو بہت محسوس ہوتا تھا۔ دراصل اس کے بہن بھائیوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔

”تم نے کپڑے کیوں نہیں بدلے مینو۔“

”اماں نے دھوئے ہی نہیں۔“

ایک روز وہ بہت میلا یونیفارم پہن کر آئی تو بی جان نے اسے ٹوکا۔ تب ہم چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے اور میری عمر نو سال کی اور اس کی گیارہ سال تھی۔

”تو تم خود دھو لیا کرو۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ تمہاری اماں بے چاری تمہارے چھوٹے بہن بھائیوں میں مصروف رہتی ہے۔ بلکہ تم کو تو چاہیے کہ تم چھوٹے بہن بھائیوں کے بھی ننھے منے کام کر دیا کرو۔ گیارہ سال کی عمر میں میری ماں کی شادی ہوئی تھی اور میری تیرہ سال کی عمر میں۔“

بی جان نے اسے سمجھایا تو اسے بی جان کی بات سمجھ میں آ گئی اور اس روز کے بعد سے وہ کبھی میلے کپڑوں میں دکھائی نہ دی۔ بلکہ اب تو وہ استری بھی کرنے لگی تھی۔ ایک بار میں اس کے گھر گئی تو وہ لوہے کی استری میں کوئلے ڈال کر اپنے کپڑے استری کر رہی تھی۔ اس کے چھوٹے بھائی نے جو اس سے چھوٹا تھا اور سکول پڑھنے جاتا تھا۔ اس نے اپنے سکول کے کپڑے استری کرنے کے لیے کہا تو مینو نے صاف انکار کر دیا۔
”میں تمہاری نوکر نہیں ہوں تم خود کر لو۔“

مجھے حیرت ہوئی اس لیے کہ مجھے تو بڑا دل چاہتا تھا کہ میرا کوئی چھوٹا بہن بھائی ہو۔ امجد شاہ تو جب گھر پر تھے تو اپنی پڑھائی میں مصروف رہتے تھے اور اب شاہ جی نے انہیں لاہور بھیج دیا تھا پڑھنے کو۔ وہ تو بس چھٹیوں میں آتے مسکرا کر مجھے دیکھتے۔ شاہ جی کی طرح شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے اور میرے لیے لایا ہوا گفٹ مجھے دیتے۔
”اور سنا بی تیری پڑھائی کیسی چل رہی ہے۔“

اور مجھے مینو پر رشک آتا تھا کہ اس کے اتنے بہن بھائی ہیں۔ لیکن وہ اپنے بہن بھائیوں سے چڑتی تھی۔

حنیف موچی نے سارے ہی بچوں کو جو سکول جانے کے قابل تھے سکول میں داخل کروا دیا تھا لیکن مینو اپنے سارے بہن بھائیوں سے مختلف دکھتی تھی۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ فرق بہت نمایاں ہو گیا تھا۔ مینو ہر وقت صاف ستھری لٹکتی چمکتی رہتی تھی جبکہ بہن بھائی بہت میلے چیلے ہوتے تھے۔ جبکہ وہ میٹرک میں تھی تو اس کا سب سے چھوٹے والا بھائی پیدا ہوا تھا۔ ہم صبح اکٹھے ہی سکول جاتے تھے۔ ہمارا ملازم تانگہ لے آتا تھا اور تانگے میں وہ میرے ساتھ جاتا تھا۔ اور مینو بھی ساتھ ہوتی تھی۔ میں بڑی سی سیاہ چادر اوڑھ کر سکول جاتی تھی جبکہ مینو کو حنیف نے برقع بنا دیا تھا۔ اس صبح وہ ہمارے گھر آئی تو بی جان نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”مینو آج تم نے سکول سے چھٹی نہیں کی۔ تمہاری اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور رات کو ہی تیرا بھائی پیدا ہوا ہے۔“

بچے پیدا کرنے کے علاوہ اماں کو تو اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ اب میں اس کے لیے اپنی پڑھائی کا حرج نہیں کر سکتی۔ دو ماہ بعد تو امتحان ہونے والا ہے۔“

بی جان کو افسوس ہوا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ اس میں کچھ خود غرضی پیدا ہو گئی تھی۔ بی جان نے حسب معمول اسے سمجھایا۔

تمہینہ ہے نا گھر پر اور غمو نے بھی آج چھٹی کر لی ہے اس نے بی جان کی نصیحت کی پروا نہیں کی تھی اور میرے سامنے سکول چلی گئی تھی۔ بی جان کو اس کی خود سری غرور اور چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے اس کے خیالات ناگوار گزرتے تھے اس لیے وہ وقتاً فوقتاً اسے سمجھاتی رہتی تھیں۔ لیکن مینو کے کان پر جوں تک نہ رہتی۔ اب تو وہ بی جان سے بحث کرنے لگتی تھی۔ اور بی جان مسکرا مسکرا کر اسے قائل کرنے کی کوشش کرتیں۔ اسے اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ اس کے ماں باپ نے اتنی اولادیں پیدا کر لیں۔ وہ اکثر مجھ سے کہتی۔

”تم کتنی خوش قسمت ہو سیدہ رابعہ صرف ایک بھائی ہے۔۔۔۔۔ اور ہمارے ہاں ڈھیر لگے ہیں بہن بھائیوں کے۔“

تم ناشکری ہو مینو بچی میرا تو دل چاہتا ہے میرے بھی تمہاری طرح بہت سارے بہن بھائی ہوتے۔

یہ اس لیے کہ تمہارے بہت سارے بہن بھائی نہیں ہیں اور تم نہیں جانتیں کہ زندگی اس طرح کتنی عذاب ہو جاتی ہے۔ ہر وقت کی جج جج۔۔۔۔۔ کوئی رو رہا ہے کوئی لڑ رہا ہے کوئی بیمار پڑا ہے۔۔۔۔۔ توبہ۔“

وہ کوشش کرتی تھی کہ زیادہ وقت ہمارے ہاں ہی گزارے سو کسی نہ کسی بہانے چلی آتی۔ ہمارے ہاں بی جان اور میرے علاوہ اور کون تھا اسجد شاہ تو پاکستان میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ شاہ جی یہاں ہوتے تو زیادہ تر مردانے میں ہی رہتے رات کو ہی اندر گھر آتے۔۔۔۔۔ مرد ملازم بھی سب احاطے میں اور مردانے میں ہی ہوتے تھے سواں کے والدین نے اسے کبھی ہمارے ہاں آنے سے منع نہیں کیا تھا۔ بی جان کو بھی کبھی اعتراض نہ ہوا اور میں تو ویسے ہی اس کے آنے سے خوش ہو جاتی تھی۔ میری تنہائی بہل جاتی تھی۔

ایک روز وہ آئی تو خاصی غصے میں تھی۔

کیا ہوا مینو کیا بلویا تمہیں سے لڑائی ہو گئی ہے۔

میں نے پوچھا۔

”نہیں وہ ہے ناماسی برکتے پچھلی گلی میں جو رہتی ہے وہ ادھر سے کسی عورت کے ساتھ گزر رہی تھی اور میں اسی وقت تمہارے گھر آنے کے لیے گلی میں نکلی تھی۔ اس عورت نے پوچھا۔“

یہ لڑکی کون ہے تو پتا ہے ماسی برکتے نے کہا حنیف موچی کی بیٹی ہے۔

تو اس میں غصے والی کیا بات ہے۔ اس نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔ تمہارے ابا کا نام حنیف

نہیں ہے کیا؟

مجھے حیرت ہوئی۔

”ہاں نام تو یہی ہے رابی لیکن ساتھ موچی کہنا ضروری تھا کیا۔۔۔۔۔ یہ بھی تو کہہ سکتی تھی نا کہ حنیف کی بیٹی ہے“ لیکن

”میں کہنا چاہتی تھی کہ پہچان اور شناخت کے لیے اس نے ایسا کہا ہوگا ورنہ اس گلی میں حنیف نام کے اور بھی تو بندے ہوں گے۔“

لیکن تب ہی بی جان نے کسی کام سے مجھے بلالیا اور میں اسے بڑبڑاتا ہوا چھوڑ کر بی جان کی طرف چلی گئی۔ اسے اپنے باپ کے نام کے ساتھ موچی کا لفظ پسند نہیں تھا اور اب اس کا وہ وقتاً فوقتاً اظہار کرتی۔ اس گھر میں موجود چمڑے کی بو سے کراہت آتی تھی اور اس نے کئی بار باپ کو دبے لفظوں میں مشورہ دیا کہ وہ جوتوں کا کام چھوڑ کر کوئی اور کام کر لے۔

حنیف موچی اس کی بات پر ہنس دیتا۔

تو پڑھ لکھ گئی ہے مینولیکن میں اور کیا کام کروں باپ دادا سے یہی ہنر سیکھا ہے ”اور اب تو میری دکان کے ناگرے اور کھوسوں، کا آرڈر لاہور سے بھی آیا ہے۔ میں بھلا یہ کام کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“

اور یہ سچ تھا کہ جب سے بیٹا بڑا ہوا تھا اور دکان پر اس کے ساتھ بیٹھنے لگا تھا تو اس نے دو تین کاریگر رکھ لیے تھے جو جوتوں پر تلے کا کام کرتے تھے اور مہینے کے مہینے بیوپاری آکر مال لے جاتے اور آرڈر دے جاتے تھے۔ اب مینو مہینے میں ایک آدھ جوڑا بھی ضد کر کے سلوا لیتا تھا۔ اچھے کپڑے پہننے اور ہر وقت تیار رہنے کا اسے بہت شوق تھا۔ ہمارا میٹرک کا رزلٹ آؤٹ ہوا تو شاہ جی نے مجھے لاہور میں ایڈمیشن دلوا دیا یوں میرا اور مینو کا ساتھ چھوٹ گیا۔ بہت رونے دھونے اور بھوک ہڑتال کرنے کے باوجود حنیف موچی نے اسے مزید آگے پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ لڑکیوں کے لیے اتنی پڑھائی ہی کافی ہے۔ اگلے سال تیرا بھائی بھی دس کر لے گا تو اسے کالج پڑھنے بھیجوں گا۔

ہمارے قصبے میں کالج نہیں تھا۔ اگرچہ حنیف کما تا تو ٹھیک ہی تھا لیکن آٹھ نو بچے خود وہ اس کی بیوی ماں سب کھپ جاتا۔ سارے بچے تقریباً سوائے سب سے چھوٹے کے پڑھ رہے تھے۔ سب کی کتابیں، کاپیاں، یونیفارم بے شمار خرچے تھے۔ تو مینو کا ہوسٹل اور کالج کا خرچہ اسے اضافی لگتا جبکہ حمیدان نے بی جان سے کہا تھا کہ وہ جلد ہی مینو کی شادی کر دے گی ایک دولہ کے ہیں عزیز رشتہ داروں میں اور ان کے ماں باپ کی خود بھی مرضی ہے۔

”ٹھیک ہے حمیدان اچھے رشتے روز روز کہاں ملتے ہیں سترہ برس کی تو ہو ہی گئی۔“

نہ بی جان چار ماہ تک اٹھارہ برس کی ہو جائے گی حمیدان نے انگلیوں پر حساب لگا کر بتایا۔ اور خوش خوش گھر چلی گئی۔

میں چھٹیوں میں ہاسٹل سے آئی۔ تو خیال تھا کہ مینو کی منگنی ہو چکی ہوگی اور اب وہ اپنی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوگی لیکن بی جان نے بتایا کہ مینو تو کراچی چلی گئی ہے۔

”کراچی۔“

”مجھے حیرت ہوئی۔“

”ہاں حمیدان کی خالہ زاد بہن آئی تھی کراچی سے مینو کا پڑھائی کا شوق دیکھ کر اسے ساتھ ہی لے گئی بے اولاد ہے۔ کہنے لگی میرے پاس رہ کر پڑھتی رہے گی اچھے کھاتے پیتے لوگ

ہیں شوہر اس کا ایئر فورس میں ہے۔ بلکہ وہ تو کہہ رہی تھی بیٹی بنا کر رکھوں گی۔ حمیدان بھول جائے اسے شادی وادی بھی کر دوں گی۔ دونوں میاں بیوی بڑے بھلے مانس ہیں۔“

”اور مینو خوش خوش چلی گئی۔“

”ہاں اور کیا وہ تو اتنی خوش تھی بے وفائے جب سے گئی ہے مڑ کر خط بھی نہیں لکھا۔“

حمیدان اور حنیف یاد کرتے ہیں۔“

چلو اس طرح اس کا پڑھائی کا شوق بھی پورا ہو جائے گا اور چمڑے کی باس والے گھر سے نجات بھی مل جائے گی میں نے سوچا..... اور بی جان کو اپنی روم میٹ کے متعلق بتانے لگی۔ میں جب بھی آتی مینو کو ضرور یاد کرتی اور اس کے متعلق بی جان سے پوچھتی لیکن مینو تو ایسی گئی تھی کہ پورے چھ سال لوٹ کر نہ آئی ایک دو بار حنیف جا کر اس سے مل آیا تھا اور چاہا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے اس کے ساتھ چلی آئے لیکن اس نے ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیا۔ وہ وہاں خوش تھی اور پڑھ رہی تھی۔ حمیدان خالہ جب بھی مجھے ملنے آتی تو یہی بتاتی تھی۔ میں جب اپنا ایم۔ اے مکمل کر کے گھر آئی تو چند ماہ بعد ہی میری شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

میری شادی میرے ماموں زاد سید قاسم مہدی سے ہو رہی تھی۔ قاسم ڈاکٹر تھے اور انہوں نے یو۔ ایس۔ اے سے سرجری میں سپیشلائزیشن کی تھی۔ میں نے بچپن میں کئی بار قاسم کو دیکھا تھا البتہ جب وہ ہائر ایجوکیشن کے لیے باہر جا رہے تھے اور بی جان سے ملنے آئے تھے تب بھی انہیں دیکھا تھا لیکن چونکہ اس وقت بزرگوں میں یہ بات طے پا چکی تھی۔ کہ قاسم کی شادی مجھ سے ہونی ہے لہذا فطری حیا کی وجہ سے میں ان کے سامنے نہیں آئی تھی۔

اس روز بھی بی جان مجھے چند دوپٹے دے گئی تھیں کہ میں انہیں دیکھ لوں کہ کس پر کیا کام ہونا چاہیے۔ میں نے بی جان کو منع کر دیا تھا کہ وہ خواہ مخواہ میرے کپڑوں پر زری کا کام وغیرہ نہ کروائیں۔ کیونکہ میں نے پہنا نہیں ہے اور خواہ مخواہ بعد میں سوٹ بیکار جائیں گے۔ لیکن بی جان کی ضد تھی کہ شادی کے ابتدائی دنوں میں تو ایسے ہی فینسی کپڑے ہی ڈہنوں کو اچھے لگتے ہیں۔ تب میں نے ان سے کہہ دیا کہ کچھ دوپٹوں پر کام کروالیں اور سوٹ سارے ہی رہنے دیں تاکہ بعد میں کام آسکیں۔ میں دوپٹے پھیلانے بیٹھی تھی کہ مینو آ گئی۔

”رانی۔“

اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر مجھے بلایا تو ایک لمحہ کو میں اسے پہچان نہ سکی۔ اس نے باریک چٹا ہوا دوپٹا گلے میں ڈالا ہوا تھا۔ بال کندھوں تک کنٹوار کھے تھے اور اس کا ہیر

اسٹائل اس پر بہت سچ رہا تھا۔ ابرو خوبصورتی سے ترشی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر کافی کلر کی لپ اسٹک تھی۔ جو اس کے کپڑوں سے میچ کر رہی تھی۔
”میں تو تم۔“

دوسرے ہی لمحے میں اسے پہچان کر دوڑ کر اس کے گلے لگ گئی۔
”بے وفا مزکر خبر ہی نہیں لی۔“
”میں پڑھائی میں مصروف تھی۔“

”بندہ چھٹیوں میں تو آ سکتا ہے نا“ میں نے گلہ کیا۔ ”ہاں لیکن بس نہیں ملی۔“ وہ دوپٹے ایک طرف کر کے بیٹھ گئی۔

”تمہارے جہیز کے ہیں۔“

”ہاں۔“

میں نے سر ہلادیا۔

”مبارک ہو شادی کی۔ اماں نے آتے ہی بتایا تمہاری شادی کے متعلق۔“

”تھینک یو لیکن تم کب آئی ہو؟“

”رات کو آئی تھی تھکی ہوئی تھی دیر تک سوتی رہی ابھی سو کر اٹھی ہوں تو تمہاری طرف چلی

آئی۔“

”تم کافی بدل گئی ہو۔“

میں نے اس کے کئے ہوئے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔

”بدلتا ہی پڑتا ہے زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے ورنہ بندہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ میں

نے اکناکس میں ماسٹر کی ڈگری لی ہے۔“

اس کے لہجے میں فخر اور غرور تھا پھر اس کی سوالیہ نظریں میری طرف تھیں اور تم۔۔۔۔۔

میں نے انگلیں لٹیرچر میں ماسٹر کیا ہے۔

”چل چھوڑ یہ تاتیرا دولہا کون ہے کیسا ہے؟“

”میرے ماموں کے بیٹے ہیں قاسم ڈاکٹر ہیں۔“

”اچھا“

”مجھے لگا جیسے وہ بھڑی گئی ہو۔“

”بہت لکی ہو یار۔“

اس کا انداز گفتگو بھی خاصا بدل گیا تھا اور لہجے میں ہی نہیں لفظوں میں بھی بے باکی تھی۔“

”ابھی کچھ دن رہو گی نا۔“

”ہاں شاید۔“

اس کا انداز مبہم سا تھا۔

”میری شادی تک تو روکی نہیں۔“

”ہاں شاید کیا خبر چلی جاؤں۔ انکل اور آنٹی بہت محبت کرنے لگے ہیں مجھ سے آنٹی

میرے بغیر بہت اداں ہوں گی۔

وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ بی جان کو بھی اس کا انداز کچھ پسند نہیں آیا تھا۔

”وہاں کراچی میں جیسے بھی رہتی تھی کم از کم یہاں تو اسے بڑا دوپٹا یا چادر اوڑھ کر آنا

چاہیے تھا۔“

اس کے جانے کے بعد انہوں نے تبصرہ کیا۔

”ایک ہی تو گلی ہے بی جان۔“

میں نے اس کی سائیڈ لی۔

”پھر بھی لڑکی ذات کو دھیان رکھنا چاہیے اب یہ تو بورڈ نہیں لگا ہوا گلی میں کہ کوئی غیر مرد

ادھر سے نہیں گزرے گا۔“

”میں تو واقعی بہت بدل گئی تھی۔۔۔۔۔ میری شادی میں ابھی مہینہ باقی تھا۔۔۔۔۔ وہ تقریباً روز

ہی چلی آتی۔“

”بی جان بتائیے کوئی کام ہے تو۔“

اور بی جان ہر بار اسے نصیحت کرنا نہ بھولتیں۔

اس کے پاس خاصے ماڈرین تھے۔ کبھی چھوٹے چھوٹے پنپے ہوئے دوپٹے گلے میں

ڈالے اور کبھی سکارف لٹکائے خوب میک اپ کیے وہ ہمارے گھر آتی تھی۔

”کنواری لڑکیاں اتنا میک اپ نہیں کرتیں پھر لپ اسٹک لگانا تو ہمارے ہاں کنوارے

میں تو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔“

”چھوڑیں بی جان زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔“

وہ بے تکلفی سے بی جان سے کہتی اور بی جان حیرت سے اسے دیکھتی رہ جاتیں۔

”یار رابی تمہیں کیا بتاؤں تم تو گھر سے نکل کر بھی کنویں کی مینڈک ہی رہیں۔“
وہ جو کبھی مجھے سیدہ رابعہ کہہ کر بلاتی تھی۔ اب بڑے شائل سے ”یار رابی کہہ کر مخاطب

”وہاں جامعہ میں میرے دوستوں میں زیادہ لڑکے ہی تھے اور سب ہی پسند کرتے تھے

نئی دنوں جب وہ باقاعدگی سے ہمارے گھر آ رہی تھی ہم نے ادھر ادھر سے خبر سنی کہ مینو
کراسن خالہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی ہیں۔ بی جان کو کسی محلے والی نے ہی بتایا تھا۔

”ان لوگوں نے تو بہت محبت سے رکھا، پڑھایا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ لباس لے کر دیا لیکن مینو
نے ان کی عزت مٹی میں ملا دی۔ بدنام کر کے رکھ دیا انہیں۔ سنا ہے وہاں لڑکوں سے دوستی تھی۔ اور
نڑکے گھر بھی ملنے چلے آتے تھے۔ خالہ کے میاں نے دو تین بار پیار سے سمجھایا لیکن مینو پر اثر ہی
نہ ہوا تب ہی تو وہ لوگ یہاں چھوڑ گئے ہیں کہ سمجھالیں اپنی اولاد کو..... ہم سے نہیں سنبھلتی۔“

پتا نہیں اس نے کہاں تک سچ تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ مینو واپس نہیں گئی تھی۔ ایک دن
جب بی جان تالاب سے برتن قلمی کے لیے باہر نکلوا رہی تھیں اور میں مینو کے ساتھ اپنے کمرے میں
بیٹھیں تھی تو میں نے پوچھا۔

”مینو میں نے سنا ہے کہ تمہاری خالہ تمہیں یہاں چھوڑ گئی ہیں۔“

”یار انٹی بھی اتنے بڑے شہر میں رہ کر دقتا نوی ہیں وہ احسن وغیرہ کبھی گھر آ جاتے
تھے مٹنے تو ہمارے انکل کو یہ پسند نہ تھا۔ ایک روز بہت دیر ہو گئی تھی ہم لوگ گھومنے نکل گئے تھے پھر
ابدال نے ڈنر دیا تھا سو اس پر ان کا موڈ خراب ہو گیا بس اتنی سی بات تھی۔“

”بی جان قلعی گرا حاطے میں بیٹھے گا کیا؟“

تب ہی اسجد شاہ غالباً بی جان کو میرے کمرے میں سمجھ کر بی جان کو پکارتے اندر آئے
اور پھر مینو کو دیکھ کر واپس مڑنے لگے تو مینو نے انہیں پکار لیا۔

”ارے آپ واپس کیوں مڑ گئے میں مینو ہوں۔ بچپن سے ہی ادھر آ رہی ہوں۔ کیسے

ہیں آپ؟“

اسجد شاہ رک گئے۔

”کون مینو؟“

انہوں نے کچھ یاد کرتے ہوئے مینو کی طرف دیکھا اور پھر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا۔

”اچھا وہ..... وہ حنیف موچی کی بیٹی۔“

وہ مینو کی بجائے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں نے دیکھا مینو کا رنگ لمحہ بھر کو بدلا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ مسکرانے لگی۔

”چلیں کسی حوالے سے سہی آپ نے پہچانا تو۔“

مجھے اس کی بے تکلفی اچھی نہ لگی۔ اسجد شاہ کبھی بھی بچپن میں بھی اس سے یا مجھ سے بے

تکلف نہ رہے تھے۔ خود شاید اسجد شاہ کو بھی حیرت ہوئی تھی کہ وہ معذرت کرتے ہوئے باہر چلے
گئے۔

”تمہارا بھائی بھی تمہاری ہی طرح ہے رابی لگتا ہے اسے ولایت کی ہوا چھو کر بھی نہیں

گری۔“

”حالانکہ ایسا تو نہیں تھا اسجد شاہ بھلے اپنی روایات کا امین دار سہی لیکن تھا تو ایک مرد ہی

اور جب عورت خود ہی خود کو ارزاں کر دے تو مرد کو کیا پڑی ہے اسے بلند مقام دے اگلے چند دنوں

میں میں نے محسوس کیا کہ مینو آتی تو کسی نہ کسی اتفاق سے اسجد شاہ بھی آ جاتے اور پھر مینو کی باتیں

اور ادا کیں۔ مجھے یہ سب اچھا نہ لگتا۔ اسجد شاہ اس کی باتیں دلچسپی سے سنتے اور اس کے سوالوں کے

جواب بھی دیتے..... لیکن ان کا انداز نارمل ہوتا انہوں نے نو سال یورپ میں گزارے تھے ان کے

لیے مینو صرف مینو تھی۔ کوئی آسمانی الپسرا نہ تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مینو انہیں اپنی اداؤں سے

رہنما چاہتی ہے۔ تو کیا وہ باتیں سچ ہیں جو قیام کراچی کے حوالے سے عورتیں اس کے متعلق کرتی

تھیں۔ میری شادی سے صرف چند دن پہلے اس کی ماں بی جان کے پاس آئی تو ان سے التجا کی۔

”بی جان آپ ہی اسے سمجھائیں۔ میری تو سنتی ہی نہیں اچھا بھلا رشتہ ہے برادری کا

ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ پوری بارہ جماعتیں پاس ہے ابو ظہبی میں کام کرتا ہے۔ لیکن انکار کرتی ہے۔“

”کوئی وجہ تو ہوگی نا۔“

”کہتی ہے اپنی برادری اور عزیز رشتہ داروں میں شادی نہیں کرے گی۔“

”اچھا میں سمجھاؤں گی۔ پاگل ہے وہ تو۔“

بی جان نے اس کی ماں کو تسلی دے کر بھیج دیا۔ لیکن مینو نے تو بی جان سے بھی صاف

انکار کر دیا۔

مجھے اپنے ماتھے سے یہ ”ٹھپہ“ مٹانا ہے موچی کا ٹھپہ۔ اس لیے مجھے کسی موچی کی اولاد

سے شادی نہیں کرنا۔“

”رابی دیکھا تم نے کتنی ہی خواتین نے مجھے دیکھا پسند کیا لیکن..... پتا ہے شہروں میں کوئی کسی کی ذات برادری کے متعلق نہیں جانتا۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ ابا سے کہوں گی کہیں شہر چل کر رہتے ہیں۔“

میں نے ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھا اور خاموش رہی میں تو شادی کے بعد فیصل آباد چلی گئی لیکن اس کے متعلق مجھے خبریں ملتی رہیں۔ ابو ظہبی والے لڑکے سے حنیف نے اپنی دوسری بیٹی کی شادی کر دی تھی اور مینو کے بے حد اصرار پر جو توں کی دکان ختم کر کے جنرل سٹور بنالیا تھا۔ جلد ہی اس کا جنرل سٹور بھی چل نکلا تھا۔ کیونکہ حنیف ایک ایمان دار آدمی تھا۔ داماد نے ایک بیٹے کو بھی ابو ظہبی بلوایا تھا۔ گھر میں کافی خوشحالی آ گئی تھی لیکن مینو کے ماتھے پر سے یہ ”ٹھپہ“ نہیں ہٹا تھا لوگ اب بھی اسے حنیف موچی اور حمیدہ موجن کے نام سے بلاتے تھے۔ میں اسجد شاہ کی شادی پر گھر آئی تو بی جان نے مجھے بتایا کہ مینو محلے میں کافی بدنام ہو چکی ہے بے چارہ حنیف موچی تو سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہا۔ اسجد شاہ پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش کی اس نے لیکن میں نے منع کر دیا اسے ادھر آنے سے۔ بی جان جو اس سے ہمیشہ بہت شفقت سے پیش آتی تھیں اب اس سے متنفر ہو رہی تھیں۔ اس نے شہر میں کہیں کسی آفس میں جاب کر لی تھی اور وہیں ورکنگ ویمن ہوسٹل میں رہتی تھی اور ہفتہ بھر بعد ہی گھر آتی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں اب مینو سے نسل سکوں گی۔

بی جان نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ ایسی بدنام اور نافرمان لڑکی سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سنا ہے کہ وہاں شہر میں لڑکوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ محلے کے مردوں نے خود دیکھا ہے اسے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے اور چائے پیتے۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ بے چاری کس خواہش میں خوار ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کہاں سے اس کے ذہن میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا۔ حالانکہ اس روز بی جان نے اسے سمجھایا تھا۔ ”سید سے شادی کر کے تو سیدانی تو نہیں ہو جائے گی ناجہلی۔ رہے گی تو حنیف موچی کی دھی ہی نا۔“

مگر وہ تو اس آرزو میں پاگل ہوئی جا رہی تھی اور اسے نہ اپنی بڑھتی عمر کا احساس تھا اور نہ اپنی بدنامی کا۔ یک بعد دیگرے اس کی باقی کی دو بہنوں کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ لیکن اس نے گھر آنے والے ہر رشتے کو ٹھکرا دیا۔ اور جس رشتے کا انتظار تھا وہ آ ہی نہیں سکتا تھا۔ حنیف نے تیسری بیٹی کی شادی کے بعد اسے وارننگ دی کہ یا تو وہ شادی کر لے اب جو بھی رشتہ آتا ہے اس سے یا ان سے تعلق نہ رکھے۔ میں محلے میں سر اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ اتنی عزت تھی محلے میں۔“

”مینو تیرا دماغ چل گیا ہے۔ سب انسان برابر ہوتے ہیں۔ یہ تو پیٹھے میں کسی نے جوتے سینے تو موچی بن گیا کسی نے کپڑے سینے تو درزی ہو گیا۔ بیٹی خدا کے نزدیک تو بڑا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے، زیادہ پرہیزگار ہے۔ پیغمبروں نے بھی یہ کام کیے۔“

”بی جان یہ چھاپ حنیف موچی کی بیٹی کی چھاپ جو مجھ پر لگی ہے میں اسے مٹانا چاہتی ہوں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب میری شادی کسی ایسے شخص سے ہو جو موچی نہ ہو۔“

”شادی بیاہ تو اپنے قبیلوں اور خاندانوں میں ہی کرتے ہیں لوگ۔“

”لیکن مجھے اپنے قبیلے میں بیاہ نہیں کرنا میرے اختیار میں ہو تو اپنی ولدیت کے خانے سے حنیف موچی کا نام مٹا دوں اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔“

”مینو تو ایسا کیوں سوچتی ہے جہلی۔ تیرا باپ ایک شریف آدمی ہے محلے میں اس کی عزت ہے۔ نمازی پرہیزگار ہے۔“

”میرا باپ شریف ہے نمازی ہے پرہیزگار ہے محلے میں اس کی عزت ہے تو آپ کیوں نہیں کر دیتیں اس شریف آدمی کی بیٹی سے اپنے بیٹے کی شادی۔“

”مینو۔“

بی جان ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئیں۔ اور پھر خفا سی ہو کر اٹھ گئیں اور جاتے جاتے مینو کو بھی گھر جانے کا کہہ گئیں۔

”مینو تو نے بی جان کو ناراض کر دیا ہے۔“

تو نہیں سمجھ سکتی رابی یہ سب مجھے کس قدر اذیت دیتا ہے۔ تم دیکھ لینا ایک روز میں اپنے ماتھے سے یہ ٹھپہ مٹا دوں گی..... تمہیں پتا ہے ویناں احسن مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور وہ کر بھی لیتا مجھ سے شادی لیکن ہماری خالہ جان کو سچ بولنے کی بیماری ہے انہوں نے احسن کے والدین کو صاف صاف بتا دیا کہ میں رشتے میں ان کی بھانجی ہوں اور میرا باپ موچی کا کام کرتا ہے۔ اور اس کے والدین نے انکار کر دیا۔ لیکن میں..... میں بہر حال ایک دن۔

وہ منہ ہی منہ میں بد بدائی اور گھر چلی گئی پھر دو تین دن وہ غائب رہی۔ رخصتی سے چند لمحے پہلے ہی آئی تھی۔

ہاف سیلو والی آرگنڈا کی اوپن شرٹ اور بڑا سا دوپٹا اوڑھے ہائی ہیل کی جوتی نفاس سے کیا میک اپ بارات کے ساتھ آنے والی کئی خواتین نے اس کے متعلق پوچھا۔ اور اس نے میرے کان میں آ کر سرگوشی کی۔

”چھوڑا تیری عزت ہوتی نا تو تیری بیٹی کے لیے رشتہ دیتے یہ تیرے محلے والے۔“
تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے مینو لیکن میرا دماغ ابھی صحیح ہے اس لیے ایک مہینے کے اندر
اندر میں تیری شادی کر دوں گا اب۔“

لیکن مینو نے شہر ہی چھوڑ دیا اور لاہور جا کر ملازمت کر لی۔ کبھی کبھار مہینوں بعد آتی تو
گھر میں نہ تو حنیف اس سے بات کرتا نہ بڑے بھائی۔ ایک لے دے کے بے چاری ماں تھی جو
اس کے لیے کڑھتی اور جلتی رہتی تھی۔

میں اپنے دوسرے بیٹے کی پیدائش پر گھر آئی تو بی جان نے بتایا۔
”مینو نے شادی کر لی ہے لاہور میں۔ سنا ہے کافی کھانا پیتا خوشحال آدمی ہے۔ ایک
بیوی موجود ہے۔ مینو اس کی دوسری بیوی ہے۔ ذات کا چوہدری ہے۔“
”چلو بالآخر مینو کی کوشش بھی رنگ لائی۔“
میں نے خوش دلی سے سوچا۔

”شادی سے پہلے آئی تھی گھر..... ماں باپ سے ملنے اور انہیں ساتھ لے جانے تاکہ وہ
اس کی شادی میں شریک ہو سکیں۔ باپ تو نہیں گیا البتہ ماں بھائی کو لے کر گئی تھی۔ اور بیگانوں کی
طرح شادی میں شریک ہو کر آگئی اس نے اپنے میاں کو یہی بتایا تھا کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے
ماں کو بھی جاننے والی کہہ کر متعارف کر دیا۔ میرے دل میں جیسے درد کے کئی کانٹے ایک ساتھ چبھ
گئے مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ آدمی جیتے جی اپنے خون کے رشتوں
سے کٹ جائے نام اور شناخت ہوتے ہوئے بھی بے نام ہو جائے۔“

”مینو پلٹھی کی اولاد ہے نا۔ حمیداں بہت روتی ہے اسے یاد کر کے۔“
بی جان نے مجھے بتایا میں جتنے دن یہاں رہی کوئی نہ کوئی عورت آ کر کسی نہ کسی بہانے
سے اس کا ذکر ضرور کرتی تھی۔ ہر ایک کے پاس ایک نئی کہانی تھی۔ مجھے کوفت ہوتی۔ اور میرے دل
میں پتا نہیں کیوں بوند باندی ہونے لگتی شاید میں بچپن کی طرح اب بھی مینو کو ہی اپنا دوست سمجھتی
تھی۔

وقت گزرتا رہا اپنی مخصوص چال سے اس بات کو غالباً چار سال گزر گئے تھے، قاسم کو
ڈاکٹر کی کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے لاہور جانا تھا۔ آؤنگ کے خیال سے وہ ہمیں بھی ساتھ
لے گئے میرے بڑے بیٹے نے کہیں سے سن لیا تھا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ ابھی پیدا بھی
نہیں ہوا سو اس نے لاہور دیکھنے کی ضد کی تھی حالانکہ چند دن بعد اس کے پیپر ہونے والے تھے۔

گودہ ابھی صرف سات سال کا تھا لیکن آج کل کی پڑھائیاں سو میں نہیں جانا چاہتی تھی لیکن ایک
اس کی ضد دوسرا قاسم نے بھی کہا تو میں بھی تیار ہو گئی۔ میٹنگز وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم شاہی قلعہ
دیکھنے گئے۔ اور وہاں مجھے مینو مل گئی۔ گانگڑ لگائے اور بہترین جدید فیشن کا ڈریس پہنے وہ جھروکے
میں نینا کھڑی تھی۔

”مینو۔“

میں اسے پہچان کر بے اختیار اس کی طرف چلی آئی۔

”ارے رابی تم۔“

اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

”تم یہاں کہاں؟“

”بس بچوں کو لے کر چلے آئے۔“

میں نے اسے تفصیل بتائی۔

”کتنے بچے ہیں۔“

اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

”دو بیٹے ایک بیٹی۔“

”بڑی آئیڈیل فیملی ہے۔“

اس کی آواز میں مجھے حسرت سی محسوس ہوئی۔

”اور تمہارے۔“

”میرے بچے نہیں ہیں۔“

”تمہیں بچے اچھے نہیں لگتے تھے نا۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں لیکن زیادہ بچے..... ایک دو بچوں کی تو خواہش ہوتی ہے نا لیکن بس قدرت کو ہی
منظور نہیں تمہارے بچے کہاں ہیں۔“

قاسم کچھ فاصلے پر بچوں کے ساتھ کھڑے تھے ننھی رانی کو انہوں نے گود میں اٹھا رکھا

تھا۔

میں نے اشارے سے بتایا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”تم اکیلی آئی ہو یہاں۔“

”نہیں ملک صاحب بھی ہیں۔“

اس کے لہجے میں خود بخود نفخہ جھلکنے لگا تھا۔

ان کے ایک دوست آئے ہوئے تھے کراچی سے انہیں ہی لے کر آئے ہیں۔ ورنہ آج آڈٹ تھا بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے۔“

”تم جاب کرتی ہو اب بھی۔“

”ہاں آخر اتنی تعلیم گھر میں بیکار بیٹھنے کے لیے تو حاصل نہیں کی نا۔“

لیکن تمہارے میاں کے متعلق سنا تھا خاصے پیسے والے اور زمیندار ہیں۔“

سو وہ تو ہیں لیکن میں گھر پر بور ہو جاتی ہوں تم آؤ نا ہمارے گھر۔ یہ رہا میرا ایڈریس۔“

”اس نے پرس سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر دیا۔“

ابھی تو صبح ہم جا رہے ہیں انشاء اللہ پھر کبھی آئے تو ضرور آئیں گے۔

میں نے کارڈ پر نظر ڈالی۔

”مسز امینہ ملک۔“

میں نے زیر لب کہا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔

”چلو تمہاری پیشانی سے وہ چھاپ تو ہٹ گئی مسز ملک۔“

”ہاں۔“

وہ کھل کر مسکرائی۔

بالآخر میں نے وہ ٹھپہ اپنے ماتھے سے مٹا دیا۔

تب ہی میرے پیچھے سے کسی نے اسے آواز دی۔

”مینا۔“

میں نے مڑ کر دیکھا۔

ایک ٹھٹھنے قد کا گہرے سانولے رنگ کا گنجا سمر د پیچھے کھڑا تھا۔ عمر ساٹھ سال سے زیادہ

ہی ہوگی۔

”یہ ملک صاحب ہیں میرے ہسبند۔“

اس نے تعارف کر دیا۔

”اوہ“ ایک انجانا سا درد میرے دل کو چھیلتا چلا گیا اور یہ میری سہیلی ہے سیدہ رابعہ ہم

نے دسویں تک ایک ہی سکول میں پڑھا ہے۔“

”بڑی خوشی ہوئی جی آپ سے مل کر کبھی آئیے نا غریب خانے پر۔“

ٹھیکہ پنجابی لہجہ اور انداز جاہلانہ سا۔ اور مینو ایم۔ اے اکتا کس۔ جس سے اس کی سب سے چھوٹی بہن کا رشتہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی پہلے مینو کے لیے آیا تھا۔ لڑکا وکیل تھا اور خاصا خوب رو لیکن تھا اس کے باپ کے چچیرے بھائی کا بیٹا۔ مجھے مینو کی باتیں یاد آئیں۔

احسن کا سراپا بتاتے ہوئے کتنی ہی بار اس نے کہا تھا وہ جس سے بھی شادی کرے گی وہ احسن کی طرح ہی ہوگا خوب رو اور اس کی تلاش کہاں آ کر ٹھہری تھی۔ مینو مجھے خدا حافظ کہہ کر گھر آنے کی تاکید کر کے ملک صاحب کے ساتھ چلی گئی اور میرے دل پر بوجھ سا آ پڑا۔ میں واپسی کے سفر میں بھی مسلسل اس کے لیے سوچتی رہی اور میرا من بھیگتا رہا پتا نہیں کیوں۔ حالانکہ اس نے تو جو چاہا تھا حاصل کر لیا تھا۔ وہ حنیف موچی کی بیٹی سے سفر کرتے کرتے امینہ ملک بن چکی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے چلتا رہا۔ میں قاسم کے ساتھ کچھ عرصہ کے لیے باہر چلی گئی۔ ہم تقریباً چھ سال بعد واپس آئے تو ہمیشہ کی طرح بی جان سے مل کر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے میں نے محلے والوں کا حال احوال پوچھا۔

ارے وہ مینو آگئی ہے نا واپس یہاں۔ شیخ صاحب والا بچھلی گلی والا مکان اس نے لیا تھا۔ اور اسے ٹھیک کروا کے جدید تقاضوں کے مطابق سیٹ کر لیا ہے اور اس کا میاں۔“

”وہ بھی ساتھ ہی آیا تھا یہاں۔ سنا تھا مینو جس کمپنی میں کام کرتی تھی انہوں نے یہاں شہر میں براچی کھولی ہے تو مینو کو ہیڈ بنا کر یہاں بھیجا ہے۔“

”اور مینو نے شہر میں گھر کیوں نہیں لیا۔“

میں نے خود کلامی کی۔

شاید وہ محلے والوں کو بتانا چاہتی تھی کہ اس نے اپنے ماتھے سے وہ ٹھپہ ہٹا دیا ہے۔

موچی کا۔ میں نے خود ہی سوچا اور بی جان نے پوچھا۔

”ماں باپ سے صلح ہوئی۔“

ارے کہاں حنیف بے چارہ تو پچھلے سال گزر گیا۔ بہن بھائی تو بولتے نہیں اس سے ماں

کبھی کبھار ادھر ادھر چوری چھپے مل لیتی ہے۔

”بے چاری مینو پتا نہیں خوش قسمت ہے یا بد قسمت۔“

میں نے سوچا اور بی جان سے کہا۔ اگر آپ اجازت دیں تو مینو سے مل لوں۔

”مل لینا..... اب تو وہ شادی شدہ عورت ہے۔ بلکہ بانو کو بھیج کر یہاں ہی بلوالینا۔“

ماہِ تمام

مکمل عورت کی صحیح Definition کیا ہے۔ میں آج تک نہیں جان سکا۔ آدمی عورت، کس طرح کی عورت کو کہتے ہیں مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اماں کہتی تھیں۔

”فرحین ایک مکمل عورت ہے فرید علی! پوری سموچی عورت! ایسی عورت جو مرد کے لیے سرتا پاسکھ ہوتی ہے، راحت ہوتی ہے۔ جو مرد کے دکھ اوڑھ لیتی ہے۔ اپنا تن من بھلا دیتی ہے اور چپکے چپکے اس کی اور اس کے بچوں کی خدمت کیے جاتی ہے اور اس سے محبت کیے جاتی ہے۔

صرف اسی سے نہیں، اس سے وابستہ ہر شے سے، ہر ہستی سے.....

لیکن مجھے فرجی کبھی ایک مکمل عورت نہیں لگی۔

کہیں کوئی کمی تھی اس میں حالانکہ ان بیٹے ہوئے چھ سالوں میں فرحین نے مجھے بہت سکھ دیا۔ کبھی مجھ سے شکایت نہیں کی، جھگڑا نہیں کیا، فرمائش نہیں کی اور میری محدود آمدنی میں گھر کو خوش اسلوبی سے سنبھالا۔ بچوں کی اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔

میرے دونوں بچے بہت پیارے، شائستہ اور ذہین ہیں۔ ان کی تربیت میں فرحین نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ان کی پڑھائی کا خیال رکھا۔ انہیں ہوم ورک کروانا، ناشتہ بروقت تیار کرنا۔ یونیفارم صاف ستھرا اور استری شدہ ہو، لُنج ساتھ ہو۔ اسے ہر بات کا خیال رہتا ہے۔

ان چھ سالوں میں اس نے کبھی کوئی ایسا موقع نہیں دیا کہ میں اسے کچھ کہہ سکوں، جھگڑ سکوں۔ شادی کے تقریباً دو سال بعد ایک روز اماں نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ”فرید! تمہیں فرحین

سے کوئی شکایت تو نہیں؟“

بہت سوچنے کے بعد بھی مجھے ایسی کوئی شکایت نہیں ملی تھی جو میں اماں کو بتا کر احساس دلا

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی اگلی صبح میں ابھی بستر پر ہی تھی کہ باہر کسی عورت کی آواز سن کر میں اٹھ بیٹھی۔ وہ بی جان سے باتیں کر رہی تھی۔ اس گھر کے اب بھی وہ طور طریقے تھے۔ احاطے سے ملازم فخر کی اذان کے ساتھ دودھ کی بھری بالٹی لے جاتا۔ اور نماز کے بعد یا تو ایک طرف تو بڑے سے دینگے میں دودھ گرم کرنے کے لیے رکھتی اور دوسری طرف لسی بلوتی اور محلے کی عورتیں اور بچے سورج نکلنے ہی لسی لینے کے لیے اپنے اپنے برتن لے کر آ جاتے اور عورتیں بی جان کے پاس گھڑی دو گھڑی آ بیٹھتیں۔ اور محلے کی خبریں بتانے لگتیں۔ بی جان قرآن بند کر کے جزدان میں رکھتیں اور محلے کی عورتوں سے باتیں کرنے لگتیں۔

”بی جان وہ سنا آپ نے۔“

”کیا۔“

بی جان اس کی طرف متوجہ ہوئیں تو اندر کمرے میں اپنے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے میرا دھیان بھی باہر کی آوازاں پر مرکوز ہو گیا۔

وہ رات مرگئی ہے اپنی مینو موچن حنیف موچی کی بیٹی۔

اور مجھے لگا جیسے کسی نے تیز دھار خنجر کی نوک میرے دل میں چھو دی ہو۔

جیسے کوئی طویل اور پر خار مسافتیں طے کرنے کے بعد وہیں آ جائے جہاں سے چلا تھا۔

خالی ہاتھ، تہی داماں۔

جس چھاپ کو مٹانے کے لیے وہ اتنا خوار ہوئی تھی۔

اتنی اذیتیں سہی تھیں۔

اماں باپ کی جدائی، بہن بھائیوں کی نفرت۔

زمانے کی باتیں اور بدنامی۔

وہ چھاپ تو اب بھی اس کے ماتھے پر لگی تھی۔ یونہی روز اول کی طرح۔ دہکتی ہوئی۔

اس کے گھر سے باہر لگے ہوئے ”ملک ہاؤس“ کے بڑے سے بورڈ نے بھی اسے نہیں

مٹایا تھا۔

اور اس خواہش میں اس نے خود کو رول لیا۔ اور مجھے اس پر ترس آتا ہے جب وہ زندہ تھی

تب بھی۔

اور اب جبکہ وہ زندہ نہیں ہے تب بھی۔

چار دن کی چاندنی ہے۔ اصل حسن تو عورت کے اندر ہوتا ہے۔ اس کا سلیقہ، اس کی محبت، اس کا رکھ رکھاؤ، اس کا برتاؤ، حسن اسی میں ہوتا ہے فرید! باقی ظاہری حسن تو چار دن کی چاندنی ہے۔ تم نے کبھی غور کیا، بعض بہت خوبصورت عورتوں کے گھر نہیں بس پاتے تو کیوں، صرف اس لیے کہ گھر بسانے میں صرف خوبصورتی کام نہیں آتی، کچھ اور بھی درکار ہوتا ہے۔ تمہارے ابا کہا کرتے تھے کہ عورت خوبصورت ہو یا کم صورت، شادی کے کچھ عرصے بعد ساری عورتیں ایک سی لگنے لگتی ہیں۔“

لیکن پتا نہیں کیوں میں نے کئی بار سوچا کہ ارینہ شادی کے سو سال بعد بھی مجھے خوبصورت ہی لگتی میں نے غیر ارادی طور پر کئی بار ارینہ اور فرحین کا مقابلہ کیا کبھی تو فرحین کا پلڑا آسمان سے جا لگتا اور کبھی ارینہ کا.....

میں نے کئی بار فرحین پر بلاوجہ غصہ ہونے کی کوشش کی شاید اس لیے کہ وہ فرحین تھی، ارینہ نہیں..... لیکن وہ بھی عجیب عورت ہے، اس نے پلٹ کر کبھی جواب نہیں دیا۔

”دوست، احباب میری زندگی پر رشک کرتے ہیں اور اماں کہتی ہیں، وہ ایک مکمل عورت ہے لیکن پھر میرے اندر سے ایک ہوک سی کیوں اٹھتی ہے، ایک درد سا ہے، حسرت کی طرح کا کہ کاش اے کاش اس کی جگہ کوئی اور ہوتا.....

میں نے آنکھیں بند کر کے کئی بار تصور میں فرحین کی جگہ ارینہ کو چلتے پھرتے اور کام میں مشغول دیکھا ہے۔ حالانکہ اماں کو وہ مکمل عورت نہیں لگتی تھی۔

”وہ آدمی عورت ہے!“ یہ اماں کے Comments تھے اس کے متعلق..... اور فرحین، اگر فرحین بھی مکمل عورت نہیں ہے تو پھر مکمل عورت کیسی ہوتی ہے؟

میں نے کئی بار اپنے آپ سے پوچھا اور پتا نہیں کیوں ہر بار ارینہ سامنے آکھڑی ہوئی۔ اماں میری ضد پر ارینہ کے لیے میرا رشتہ لے گئی تھیں لیکن انہوں نے مجھے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ارینہ میں ایک مکمل عورت والی کوئی بات نہیں ہے۔

”وہ تو شوکیس میں کھڑی سچی سچائی گڑیا لگتی ہے۔ اس میں عورت پن نہیں ہے جیسے کوئی کھ پتی ہو وہ۔“

مجھے ارینہ کے متعلق اماں کے کمنٹس پسند نہیں آئے تھے لیکن اماں نے میری بات رکھ لی تھی اس لیے میں خاموش رہا تھا۔

ارینہ مرتضیٰ میری کو لگتھی۔ جب پہلی بار اس نے میری نیل پر جھکتے ہوئے مسکرا کر ”ہیلو!“ کہا تھا تو شاید اسی وقت میرا دل اپنا اختیار کھو بیٹھا تھا۔

سکوں کہ ان کا انتخاب غلط تھا۔

شادی کے دو ماہ بعد ہی میری ٹرانسفر ہو گئی تھی اور اماں نے زبردستی فرحین کو بھی میرے ساتھ ہی بھیج دیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اماں کی عقلمندی کا قائل ہو گیا تھا۔ مجھے کبھی دفتر سے دیر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے کپڑے ہمیشہ استری کیے ہوئے ملتے تھے جنہیں فرحین رات کو ہی استری کر کے لٹکا دیتی تھی۔ دفتر سے واپس آتا تو گھر میں پہننے کے لیے شلوار قمیض واش روم میں لٹکے ہوتے۔

جوتے پالش کیے ملتے۔ مجھے کبھی اپنے موزے تلاش نہ کرنے پڑتے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے ناشتہ بروقت نہ ملا ہو یا دفتر سے آنے پر کھانا تیار نہ ہو۔ گھر گندا ہو یا پھر خود فرحین میلی کچلی ہو۔ میں نے ایک دو احباب کے ہاں دیکھا تھا کہ ان کی بیویاں ان کے ذوق جمال کا خیال نہیں رکھتیں۔ گو گھر صاف ستھرا ہے، بچے سچے سنورے ہیں۔ کھانا بھی بنا ہے لیکن خاتون خانہ خود میلے کپڑوں اور الجھے بالوں کے ساتھ شوہر کا استقبال کر رہی ہیں۔ وہ بے چارہ تھا کماندا گھر آیا تو اس حلیے میں دیکھ کر اس کا جی برا ہوتا ہے لیکن فرجی تو ہمہ وقت یوں صاف ستھری نکھری رہتی جیسے ابھی ابھی ڈرائی کلین کی مشین سے نکلی ہو۔

”نہیں اماں!“ میں نے آہستگی سے کہا تھا۔ ”فرجی نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔“

اماں کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی تھیں اور چہرے پر ایک مغروری چمک آگئی تھی۔

”میں نے کہا تھا نافرید کہ فرجی ایک مکمل عورت ہے۔“

ہاں شاید اماں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ ایک مکمل عورت ہے۔

لیکن جانے کیا بات ہے، جب میں گھر میں ہوتا ہوں، اپنے کمرے میں، برآمدے میں کہیں بھی بیٹھا فرجی کو ادھر ادھر مختلف کاموں میں مشغول چلتے پھرتے دیکھتا ہوں تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔

پتا نہیں کیوں۔ جیسے کہیں کچھ تو ہے، جو نہیں ہے۔ کوئی کی ہے۔ لیکن کیا کی..... میں اکثر سوچتا ہوں۔

فرجی بہت خوبصورت تو نہیں لیکن پرکشش ہے جب وہ لائٹ سائیک اپ کرتی ہے یا پھر صرف لپ اسٹک ہی لگا لیتی ہے تو نگاہ لہجہ بھر کو اس کے چہرے پر بٹھری جاتی ہے اور جب کسی فنکشن میں وہ اپنے لمبے سیاہ بالوں کو کھلا جھوڑ دیتی ہے تو دل وہیں کہیں اس کی سیاہ زلفوں میں اٹک جاتا ہے۔

اور پھر اماں نے بھی کہا تھا۔ ”عورت کی ظاہری خوبصورتی اتنی اہم نہیں ہوتی، یہ صرف

تعریف سننا چاہتا تھا۔

”سچ پوچھو تو وہ ایک مکمل عورت نہیں ہے۔ وہ تو مجھے دیکھ کر اس کی طرح لگی۔

نک سب سے درست، سچی سنواری لیکن اس کے پاس سے مجھے عورت کی خوشبو نہیں آئی۔ عورت پن دکھائی نہیں دیا۔ مکمل عورت تو فرحین ہے، سرتاپا!“

اماں بھی بس عجیب ہیں۔ میں مجھ سا گیا تھا۔

عورت تو بس عورت ہوتی ہے۔ یہ عورت پن..... یہ عورت کی خوشبو..... بس افسانوی

باتیں ہیں، جب ارینہ اس گھر میں بیاہ کر آ جائے گی تو اماں کو خود ہی اچھی لگنے لگے گی۔ ابھی تو اماں شاید فرحین کو رد کیے جانے سے ناخوش ہیں۔

فرحین میری خالہ زاد تھی لیکن چونکہ خالہ دوسرے شہر میں رہتی تھیں اس لیے میں نے اسے دو تین بار ہی دیکھا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ارینہ ہر لحاظ سے فرحین سے بہتر ہے اور اس کے سنگ میں جو زندگی گزاروں گا، وہ بہت خوبصورت ہوگی۔ میں نے دل ہی دل میں کتنے ہی پلان بنا ڈالے تھے۔ یہ تک سوچ لیا تھا کہ مجھے نئی مون کے لیے کہاں کہاں جانا ہے۔ کتنی چھٹی لینی ہے اور ارینہ کو رونمائی میں کیا دینا ہے بلکہ میں جیولری دکان پر جا کر ایک خوبصورت لاکٹ سیٹ پسند بھی کر آیا تھا لیکن ارینہ کی والدہ نے معذرت کر لی۔

اماں کے تاثرات تو مجھے معلوم نہیں لیکن مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرا دل غم سے پھٹ جائے گا۔

”ارینہ کیوں؟ آخر کیوں انکار کیا تمہاری امی نے؟“ میں روہنا سہور ہا تھا۔

”سوری فرید! امی کو تمہارا گھر پسند نہیں آیا۔ اندرون شہر کی تنگ گلیوں والا گھر..... انہوں نے

سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا کہ تم پڑھے لکھے ہو، اچھی جاب ہے، ترقی کے امکانات ہیں لیکن.....“

”لیکن کیا ارینہ ہم جلد ہی الگ گھر لے لیں گے، کسی پوش ایریا میں۔ تم اپنی امی سے

بات تو کرو۔“

”لیکن فرید! تمہارا اور احسن کا پروپوزل آگے پیچھے ہی آئے تھے اور امی نے احسن کا

پروپوزل قبول کر لیا۔“

احسن اسی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ مجھ سے جونیئر تھا۔ دبلا پتلا، سانولے رنگ کا لڑکا تھا

جبکہ میں اس کے مقابلے میں بہت وجیہ اور اسارٹ تھا لیکن وہ شادمان میں رہتا تھا اور والدین کا

اکھوتا بیٹا تھا جبکہ ہم چار بہن بھائی تھے اور میرا گھر اندرون شہر بھائی گیٹ کی طرف تھا۔ گو پختہ دو

منزلہ مکان تھا پھر بھی ارینہ کی والدہ نے مجھے رنجیکٹ کر دیا تھا۔

وہ بہت خوبصورت تھی۔ اتنی کہ اگر کوئی شاعر اسے دیکھ لیتا تو شاید اس کے حسن کی تعریف میں دیوان کے دیوان سیاہ کر دیتا۔ نیلی آنکھیں جن کی گہرائیوں میں ڈوب جانے کو دل چاہے، ہونٹوں کی نزاکت ایسی کہ جنہیں دیکھ کر میر کا شعر یاد آئے۔ رنگت ایسی جیسے بلوریں جام کے پیچھے سے جھلکی اسٹرابیری کے ڈالنے والی گلابی آنسکریم یا پھر میدے اور گلاب کی آمیزش.....

پتا نہیں وہ اس قدر دلکش اور خوبصورت لڑکی مجھ پر کیوں اور کیسے مہربان ہو گئی تھی۔ اور پتا نہیں کب ہمارے درمیان محبت کا رشتہ اتنا مضبوط ہو گیا تھا کہ میں نے اس سے کہا۔

”مینا! میں اماں کو تمہارے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں کیوں نہیں، میں تو خود منتظر ہوں کہ تم کب اماں کو بھیجتے ہو۔“

اماں نے سنا تو ایک لمحے کو چپ سی ہو گئیں۔

”فرید! میں نے تو فرحین کے لیے سوچ رکھا تھا۔ فرمی بہت سمجھ دار ہے۔ بہت سلیقہ مند

ہے۔ بہت محبت کرنے والی..... تو اس کے ساتھ بہت خوش رہے گا فرید۔“

”نہیں اماں! میں صرف ارینہ کے ساتھ ہی خوش رہ سکتا ہوں کیونکہ میں اسے پسند کرتا

ہوں بلکہ محبت کرتا ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، جیسے تیری مرضی۔“

”اماں دی گریٹ!“ میں نے انہیں بازوؤں میں پکڑ کر گھما ڈالا۔

”آپ اپنی لاڈلی بھانجی کو بہو بنانا چاہتی ہیں تو اس گھر میں سعید بھی ہے، اطلاعاً عرض ہے۔“

”جانتی ہو، تو بڑا تھا اس لیے پہلے تیرے لیے سوچا۔“

انہوں نے برا سا منہ بنایا لیکن وہ ارینہ کے ہاں میرا رشتہ لے کر چلی گئیں کیونکہ وہ نہ

صرف ہم سب بہن بھائیوں سے محبت کرتی تھیں بلکہ ہماری دوست بھی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ

ایک مثالی ماں تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اماں ارینہ سے مل کر فرحین کو بھول جائیں گی۔ ارینہ کا حسن

ایسا ہی تھا۔ سحر زدہ کر دینے والا..... بھلا فرحین کا اس کے ساتھ کیا مقابلہ تھا۔

لیکن جب میں نے اماں سے پوچھا۔ ”اماں ارینہ آپ کو کیسی لگی؟“ تو انہوں نے ایک

افسردہ نظر مجھ پر ڈالی۔

”جہاں تک شکل و صورت کی بات ہے تو وہ انکھوں میں ایک ہے۔ کہیں پسند ہے تو

میری رائے ضمنی ہو جاتی ہے۔“

”پھر بھی اماں بتا کر نا، اچھی لگی آپ کو۔“ پتا نہیں کیوں میں اماں کے من سے اس قدر

تھی۔ ابھی کچن میں سامان سیٹ نہیں تھا اس لیے میں کھانا لینے باہر نکلا تو اچانک میری نظر سائے والے گیٹ کی طرف اٹھی۔

گیٹ پر ہاتھ رکھے باہر جھانکتی ہوئی، وہ ارینہ ہی تھی۔
اتنی ہی نازک اور دلکش.....
مہکتی ہوئی.....

اس کے کٹے ہوئے بال اس کے خوبصورت چہرے کو حصار میں لیے ہوئے تھے۔
ہونٹوں پر پرل پلپ اسٹک تھی۔

”ارے فرید تم!“ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ گیٹ سے باہر نکل آئی۔
”تم مینا یہاں ہو..... اور بالکل ویسی ہی ہو۔ وقت تمہیں چھوئے بغیر گزر گیا ہے۔“
”تم بھی تو ویسے ہی ہو فرید۔ بس ذرا موٹے ہو گئے ہو۔ لگتا ہے تمہاری وائف تمہیں
بہت مرغن غذا میں کھلاتی ہے۔“ وہ ہنسی۔

اور پھر وہاں گیٹ پر کھڑے کھڑے ہی ہم نے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں۔ میں نے اسے
اپنے متعلق سب بتا دیا اور اس نے بھی۔ اس کے بھی دو بچے تھے۔ ایک بیٹی، ایک بیٹا۔ احسن نے
چند ماہ پہلے پرانی جاب چھوڑ کر نئی جاب کی تھی اور یہ گھر خریدا تھا۔ میں نے کھلے گیٹ سے پورچ
میں کھڑی نئی سیاہ مشوہی لائسنر دیکھی۔ گویا احسن نے بہت ترقی کی تھی جبکہ میری تنخواہ میں کوئی
قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا تھا اور ابھی میرے پاس وہی پرانی بایک تھی۔

”تم شام کو اپنی وائف کو لے کر گھر آنا۔ اس وقت تو احسن آفس میں ہے۔ بچے اسکول
اور میں ذرا پارلر جا رہی ہوں۔“

شام کو میں تیار ہو کر اس کے ہاں جا پہنچا۔ احسن لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ٹی وی
دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ دبلا ہو گیا تھا اور اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ سامنے
رکھی ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھری تھی۔ میں نے نوٹ کیا، وہ بے تحاشا سگریٹ پینے لگا
تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کی پوری مسلسل سگریٹ پینے سے زرد ہو رہی تھیں حالانکہ جب
وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا تو بالکل سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ وہ مجھے بڑی گرم جوشی سے ملا۔

”بھابی کو نہیں لائے یار۔“

”وہ گھر کی سیٹنگ میں مصروف تھی۔“ میں نے بتایا اور وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔
ڈرائنگ روم دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ قیمتی فرنیچر، دبیز قالین اور کرشل

”مینا! تم احسن کے ساتھ خوش رہ سکو گی؟“

میرا خیال تھا وہ نفی میں جواب دے گی لیکن وہ خاموش ہی رہی۔

”مینا تم تو اتنی بولڈ ہو۔ تم اپنی امی سے کہہ سکتی ہو کہ تم میرے ساتھ خوش رہو گی اور.....“

”فرید، میں نے بتایا تھا امی کو لیکن شاید والدین ہمارے لیے بہتر فیصلہ کرتے ہیں اور
بہتر سمجھتے ہیں۔“

ارینہ کے رویے سے میں بہت ڈس ہارٹ ہوا تھا اور کئی دن آفس نہیں جاسکا تھا۔ ان
دنوں اماں نے میری بہت دلجوئی کی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارتیں۔ گھر کا سارا
انتظام رختی (میری بہن) کے سپرد کر کے وہ میرے ساتھ مصروف رہتیں۔ ادھر ادھر کی ہزاروں
باتوں سے میرا دل بہلانے کی کوشش کرتیں اور بیچ بیچ میں فرحین کی کوئی نہ کوئی خوبی بھی بیان کر
دیتیں۔ اماں نے درحقیقت مجھے سنبھلنے میں بہت مدد دی، اگر وہ اس طرح مجھے نہ سنبھال لیتیں تو میں
ٹوٹ جاتا۔

”فرحین ایک مکمل عورت ہے فرید! تم کہو تو میں آپا سے بات کروں؟“ ایک روز اماں
نے پوچھا۔

وہ ایک مکمل عورت تھی یا نہیں۔ اماں ضرور ایک مکمل ماں تھیں۔ انہوں نے مجھے دکھ کے
اس منہ ہار سے باہر نکلانے میں بڑی مدد کی۔

”ٹھیک ہے اماں!“ میں نے سر جھکا دیا۔ اگر ارینہ نہیں تھی تو کوئی بھی ہو، مجھے کیا فرق پڑتا تھا۔
اماں نے میرا مان رکھا تھا۔ میں نے اماں کا مان رکھ لیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ کبھی کبھی دل
میں ٹیس سی اٹھتی حالانکہ میرا گھر ایک مثالی گھر ہے۔ دوست احباب میری زندگی پر رشک کرتے ہیں
پھر بھی کبھی کبھی سوچتا ہوں، مکمل عورت کی Definition کیا ہے اور آدمی عورت کسے کہتے ہیں۔
کیا مجھے ارینہ کو کھونے کا دکھ ہے؟

ایک بار میں نے خود سے پوچھا تھا اور میرے دل نے کہا تھا۔ ”نہیں! اس لیے کہ اس
نے خود اپنے راستے الگ کیے تھے میرے دل میں اس کے لیے کوئی جذبہ نہ تھا۔ پھر بھی فرحین کو گھر
میں چلتے پھرتے دیکھ کر ایک ہوک سی اٹھتی تھی کہ کہیں کوئی نہ ہونے کا احساس ہے۔“

پھر چھ سالوں بعد لچا ایک میری ٹرانسفر کئی اور شہر میں ہو گئی۔ مجھے جس علاقے میں گھر ملا
تھا، وہ خوبصورت علاقہ تھا۔ کشادہ کھلی سڑکیں، دو روہ درخت، تین بیڈ روم کا خوبصورت گھر تھا۔
وسیع لان، کشادہ ڈرائنگ روم، ٹی وی لاؤنج۔ فرحین آتے ہی گھر کو سیٹ کرنے میں مصروف ہو گئی

نے ایکوریشن پیمز..... سب کچھ بہت مکمل تھا۔

”یار احسن تم نے بڑی ترقی کی غالباً تم ہیڈ کوارٹر میں تھے اس لیے۔“

”نہیں یار، کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی۔ میں نے تو جب چھ ماہ پہلے جاب چھوڑی تو اسی

سینٹ پر تھا۔“

”اور یہ سب.....“

”یہ سب مینا کا کمال ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”میں تو ساری تنخواہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔

پتا نہیں کیسے کرتی ہے وہ یہ سب۔ اسے ہی شوق ہے۔ اسی کے کہنے پر میں نے جاب چھوڑی ہے۔

سینٹھ ماجد کا ذاتی بزنس ہے۔ تنخواہ پہلے کے مقابلے میں کچھ بہتر ہے۔ گاڑی وغیرہ بھی ملی ہے۔“

تب ہی ارینہ اندر داخل ہوئی۔ بلو ساڑی، سیلوئس بلاؤز اور خوبصورت میک اپ.....

میری نگاہیں اس پر لچھ بھر کو ٹھہری گئیں۔

”ارے فرید، تمہاری وائف نہیں آئی؟“

”ہاں کچھ مصروف تھی۔“

”کیا باتیں ہو رہی تھیں۔“ وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں، میں بتا رہا تھا فرید کو کہ یہ سب تمہارا شوق ہے۔“ احسن نے بتایا اور میرے

اندر کسی احساس زیاں نے چٹکی لی۔

پھر میں وہاں جتنی دیر رہا، یہ احساس زیاں رہ رہ کر چٹکیاں لیتا رہا۔ اس کے بچے بھی

بہت پیارے تھے۔ خوبصورت امپورنڈ ڈریسز میں ملبوس..... ان پر خواہ مخواہ پیار آتا تھا۔

میں گھر واپس آیا تو میرا دل بجھا بجھا سا تھا۔ عام سے لان کے سوٹ میں ادھر ادھر کام

کرتی فرحین، مجھے عام سے بھی کمتر لگی۔ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم میں اس کے جیمز کا اولڈ فیشن

فرنچیز، چند گھنٹیا ڈیکوریشن پیمز اور بچے بھی عام سے سادہ سے کپڑوں میں ملبوس لان میں ایک

دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

اس روز تو میں نے فرحین سے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اگلے چند ماہ میں میرا احساس

زیاں بڑھ گیا تھا اور میں اس کا غصہ فرحین پر نکالتا حالانکہ اس کا تو کوئی قصور نہ تھا۔ ارینہ نے خود

میرے ساتھ زندگی گزارنے سے انکار کر دیا تھا۔

ہم کبھی کبھار ایک دوسرے کے گھر میں آتے جاتے رہتے اور جس روز ایسا ہوتا، اس روز

میرا موڈ بہت خراب ہو جاتا اور میں بہانے بہانے فرحین کو برا بھلا کہتا رہتا اور اس کا ارینہ کے

ساتھ مقابلہ کرتا رہتا۔

”کیسی پھو ہڑ عورت ہو تم۔ ساری تنخواہ تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں پھر بھی گھر میں ایک

چیز کام کی نہیں۔ بچوں کے ڈریس دیکھو، اپنا حال دیکھو۔“ مجھے گھر کی ہر شے پر اعتراض تھا۔

احسن کی تنخواہ چھ ماہ پہلے تک مجھ سے زیادہ نہ تھی پھر بھی اس کے گھر ضرورت کی ہر

شے تھی۔ ارینہ نے اپنے سلیقے سے مکان کو گھر بنا دیا تھا۔ ایک سے ایک چیز موجود تھی اس کے

ہاں۔ وال ٹو وال کارپٹ، خوبصورت پردے۔

دل چاہتا کہ اپنے گھر کے بوسیدہ پردے نوچ کر پھینک دوں۔

”تم نے ارینہ کے بچوں کے ڈریس دیکھے ہیں۔ کتنا اچھا ٹیٹ ہے اس کا۔ ایک تم ہو،

وہی سڑے بے کپڑے اٹھا کر لے آتی ہو۔ لنڈے کے کپڑوں سے بنے۔“

”وہ ڈریسز بہت قیمتی ہیں اور ہماری استطاعت سے باہر۔“

”تو ارینہ کے شوہر کی بھی تو اتنی ہی تنخواہ ہے۔ وہ بچت کرتی ہے۔ اسے سلیقہ ہے پہننے

اوڑھنے کا۔“

وہ کوئی احتجاج نہیں کرتی تھی لیکن میں نے اسے اب اکثر خاموش اور پریشان دیکھا۔

کبھی کبھی تو وہ سوچوں میں یوں کھو جاتی کہ ارد گرد سے بھی بے خبر ہو جاتی۔ ہمارے درمیان اب

برائے نام گفتگو ہوتی تھی۔

میں گھر کی خاموشی سے گھبراتا تو ارینہ کے گھر چل دیتا۔ جہاں زندگی تھی.....

زندگی کا احساس تھا.....

احسن اور ارینہ کے درمیان لڑائی جھگڑا، روٹھنا منانا، فرمائشیں سب ساتھ ساتھ چلتا

رہتا۔

ایک فرحین تھی جس نے ان چھ سالوں میں نہ کبھی لڑائی کی تھی، نہ کبھی کوئی فرمائش یا

ضد۔ بس روباوٹ کی طرح اپنے کام میں مصروف رہتی۔

میرا احساس زیاں روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے احسن پر رشک آتا اور خود پر ترس.....

اسی کیفیت میں ایک روز میں نے آفس کے ایک پرانے ساتھی سے جو چند دن پہلے ہی

ہیڈ کوارٹر سے تبدیل ہو کر یہاں آیا تھا، احسن کی خوش نصیبی کا ذکر کیا۔

”احسن! خوش نصیب!“ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”اس کی بیوی

ارینہ ہماری کو لگتی تھی۔ جانتے ہو وہ عورت نہیں، عورت کے نام پر دھبہ ہے۔ پاکباز عورت، مرد کی

خوش نصیبی ہوتی ہے میرے یار۔ ارینہ جیسی عورت نہیں۔ جس کوٹھی میں آج کل احسن رہتا ہے، وہ کوٹھی سیٹھ ماجد نے گفٹ کی ہے ارینہ کو اور یہ سارا ٹھاٹھاٹ باٹ ارینہ کی وجہ سے ہے۔ بے چارا احسن!“

مجھے یقین نہ آیا لیکن میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اسی روز میں نے ارینہ کو سیٹھ ماجد کی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھے دیکھا۔

”وہ مکمل عورت نہیں ہے۔ شوکیس میں کھڑی بھی سنوری گڑیا ہے۔“ اماں نے کہا تھا۔

اس روز میں بہت افسردہ تھا۔ آفس سے گھر آتے ہوئے میں نے کئی بار اپنے اس رویے کے متعلق سوچا جو میں ان چند ماہ سے فرحین سے روار کھے ہوئے تھا۔ میری تنخواہ بارہ ہزار تھی جس میں سے پانچ ہزار میں اماں کو بھجوا دیتا تھا اور سات ہزار فرحین کو دے دیتا تھا۔ ان سات ہزار میں سے بھی کمیٹیاں ڈال کر فرحین نے پچاس ہزار اکٹھے کر لیے تھے جو اس سال رخصتی کی شادی پر کام آئے تھے شاید ارینہ کے گھر کی شان و شوکت دیکھ کر میں اندھا ہو گیا تھا۔

میں شرمندہ سا گھر میں داخل ہوا تو پہلی بار گھر گندا نظر آیا۔ میرے کپڑے اور گیلاتولیہ نی دی لاؤنج میں صوفے پر پڑے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پر صبح کے ناشتے کے برتن پڑے تھے۔ واش روم میں میرے گھر میں پہننے والے کپڑے موجود نہ تھے۔

”فرجی!“ میں نے اسے آواز دی۔ ”میرے کپڑے نکال دو۔“

”پلیز خود نکال لیں۔“ وہ آٹے میں سنے ہاتھوں کے ساتھ آئی۔ ”مجھے ابھی کھانا بنانا

ہے۔“

”تم نے ابھی تک کھانا نہیں بنایا، بچے کیا بھوکے ہیں؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”طبیعت ٹھیک ہے اور بچوں کو میں نے سینڈویچ بنا کر کھلا دیئے ہیں۔ میں دراصل ایک جاب کے لیے انٹرویو دینے گئی تھی۔ پرسنل سیکرٹری کی جاب ہے۔ پرکشش تنخواہ ہے۔ امید تو ہے جاب مل جائے گی۔ اگر مل گئی تو پھر نیا شیڈول سیٹ کر لوں گی۔ کھانا رات کو ہی بنا دیا کروں گی۔“

”مگر کیوں، تمہیں جاب کی کیا ضروری ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے نہیں، آپ کو ضرورت ہے۔ آپ کا جی چاہتا ہے کہ گھر میں احسن بھائی کے گھر

جیسا فرنیچر ہو۔ بچوں کے ڈریسز قیمتی ہوں، وہ بیڈ سیٹ جو ارینہ کے بیڈ روم میں ہے وہ پچاس

ہزار سے زیادہ کا ہے۔ ایک ایک فانوس ہزاروں روپوں کا ہے اور صرف سات ہزار روپے میں یہ سب کچھ نہیں آ سکتا فرید۔ میں بھی جاب کر لوں گی تو چند سالوں تک ہم کچھ بہتر اشیاء خرید سکیں گے۔“

”فرجی!“ میں شرمندہ ہو گیا۔ ”کوئی ضرورت نہیں جاب کرنے کی۔“

”لیکن میرے پاس جادو کی چھڑی نہیں ہے جسے گھمانے سے جو وہ سب کچھ مل جائے جس کی آپ کو خواہش ہے۔ آپ کو پتا ہے پردے، کشن، سب کچھ میں نے خود گھر میں سیا تھا اور تھوڑی تھوڑی بچت کر کے یہ کارپٹ خریدا تھا۔“

”پلیز فرجی، لیواٹ میں نے کہہ دیا نا کہ تمہیں جاب نہیں کرنا بس۔“

”جواب نہ کروں اور آپ کے طعنے، آپ کی باتیں سنتی رہوں۔ سب جانتی ہوں میں، آپ ارینہ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ مجھے بتایا ہے اس نے۔ یہ دکھ ہے آپ کو اور اب پچھتا رہے ہیں۔ آپ کا مسئلہ کیا ہے..... پچھتاوا ہے تو اب کر لیں کسی امیر زادی سے شادی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”بھجوا دیں مجھے گھر واپس اور ڈھونڈ لیں کوئی شہزادی جو آپ کے گھر کو ارینہ کے گھر جیسا بنا دے۔“

وہ بول رہی تھی اور رو رہی تھی اور میرے اندر ہلکی ہلکی پھوار ہو رہی تھی۔

کیسی سکیت تھی۔

وہ ایک خلش جو دل میں تھی، وہ ایک کمی جو محسوس ہوتی تھی، یکا یک ختم ہو گئی تھی۔

سارے خلا بھر گئے تھے۔

”فرجی!“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر مڑ گئی۔

روٹھی روٹھی اور خفا..... دھواں دھار روتی ہوئی..... جھگڑتی ہوئی.....

کیا یہی کمی تھی، کیا میں یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے لڑے جھگڑے، ضدیں کرے،

فرمائشیں کرے۔

میرے ہونٹوں پر بے اختیار سی مسکراہٹ آ گئی۔ روٹھنے اور منانے کا اپنا ہی الگ چارم

ہوتا ہے۔ میں اسے منانے کے لیے اس کے پیچھے لپکا۔

مجھے نہیں معلوم کہ مکمل عورت کی Definition کیا ہے لیکن میں دل ہی دل میں اماں

کی بات پر ایمان لے آیا تھا کہ وہ ایک مکمل عورت ہے!

پوری سموچی عورت!

گرتے تھے۔ ارینہ رزاق جو راولپنڈی کے قریب کسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اور شکیل احمد کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی اور بقول اس کی روم میٹ فریدہ مدبر کے، وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کے نفل پڑھتی تھی اور شکیل احمد کی رفاقت کی دعائیں مانگتی تھی اور اس کے آنسو اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر گرتے تھے اور تب ہم سب اسے بڑے خلوص سے مشورہ دیا کرتے تھے کہ وہ دعائیں مانگنے کی بجائے سیدھے سبھاؤ شکیل احمد کے پاس جا کر حال دل کہہ دے۔ وہ یقیناً اس من موئی صورت پر فدا ہو جائے گا۔

”بھلا ایسا کیسے ممکن ہے۔“ وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔ ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے گرتے اور وہ کسی معجزے کے انتظار میں دعائیں مانگتی رہتی۔ ہم اس کی عدم موجودگی میں اس کا مذاق اڑاتے۔

”بے چاری متوسط طبقے کی لڑکیاں! اپنی محبتوں کو پانے کے لیے یونہی دعائیں کرتی ہیں اور پھر دعائیں کرتے کرتے ایک دن کسی اور کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہیں۔“
اب میں خود بھی یہی کر رہی تھی۔ بالکل متوسط طبقے کی لڑکیوں کی طرح اور شین حیرت سے مجھے نکا کرتی۔

”کیا ہو گیا ہے رو شین تمہیں؟ تم اتنی بیوقوف تو ہرگز نہ تھیں۔“
”کیا ہو گیا ہے مجھے؟“ میں حیرت سے اسے دیکھتی۔ اب میں اسے کیا بتاتی کہ میں رو شین اوصاف اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ ارمان نصیب کی محبت میں، وہ ارمان نصیب جو خوبصورت شعر کہتا ہے اور جس کے بال زلفوں کی طرح اس کے شانوں پر بکھرے رہتے ہیں اور جو بڑے اسٹائل سے دھاری دار چادر اوڑھتا ہے یوں کہ اس کا ایک پلو دائیں بازو سے نکال کر دوسرا بائیں کندھے پر ڈال دیتا ہے اور جب دور خلا میں دیکھتے ہوئے اور دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں دبے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہتا ہے۔ ”شہناجی! اور سنائیے کیسی ہیں آپ؟“
تو میرا دل سینے میں اتنا شور مچاتا ہے کہ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ابھی سینے کی دیواریں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

یہ دل تو اسی روز اسی جیلے اور قدرے انوکھے سے مرد کے قدموں میں گر گیا تھا جس روز پہلی بار سفیر نے میرا اس سے تعارف کروایا تھا اور اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر کو قدرے خم دیتے ہوئے کہا تھا۔

”نمستہ دیو جی!“

اور میں وہیں جیسے فریز ہو گئی تھی۔ اس کا وہ خوبصورت دھیمہ جہ، اس کی ۱۰ سالہ

انٹلیکچول

”میں تمہاری ان وفاؤں سے ادب گیا ہوں، بیزار ہو گیا ہوں۔ چٹ گئی ہو تم مجھ سے۔ متوسط طبقے کی عورتوں کی طرح ہر وقت ہاتھ باندھے چاکری کے لیے مت کھڑی رہا کرو میرے سامنے۔“ ارمان نے میرے ہاتھ سے ناول لے کر صوفے پر پھینکا اور غصے سے بھناتا ہوا بیڈروم میں کھس گیا۔

میں وہیں ٹی۔ وی لائونج میں ساکت کھڑی رہ گئی۔ یہ کوئی آج کی بات تو نہ تھی۔ ایسا کئی مہینوں سے ہو رہا تھا اور میں حیران تھی کہ کیا یوں بھی ہوتا ہے۔ اس طرح ”کی کوئی فاؤں سے ادب جاتا ہے؟ محبتوں سے بیزار ہو جاتا ہے؟ چاہتوں سے بھاگتا ہے؟
ارمان میری محبتوں اور چاہتوں سے بھاگ رہا تھا۔ میں جو اس کے لیے جان سے گزر گئی تھی۔ لیکن یہ ارمان نصیب تھا جو خود کو انٹلیکچول (Intellectual) کہلاتا ہے۔ ایسے ہی انٹلیکچول مرد کی تو میں نے خواہش کی تھی۔ کیا سارے انٹلیکچول ایسے ہی ہوتے ہیں، ارمان نصیب کی طرح؟

شین نے مجھے کتنا سمجھایا تھا۔ ”رو شین یہ ارمان مجھے تو بہت پیارا ہے۔ تم اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکو گی۔“

لیکن تب مجھ پر بھوت سوار تھا اس انٹلیکچول مرد کے ساتھ زندگی گزارنے کا۔ میں اس کے سحر میں گرفتار ہو چکی تھی۔ پورے اس کی محبت میں ڈوب چکی تھی۔ اس متوسط طبقے کی نہیں تھی پھر بھی متوسط طبقے کی لڑکیوں کی طرح نفل پڑھ پڑھ کر اس کے ساتھ کی دلیانیں مانگتی تھی۔

”یا اللہ اس کا ساتھ مل جائے، اس کی دائمی رفاقت!“

اور ارینہ رزاق کی طرح دعا کے لیے پھیلے ہوئے۔۔۔ تھوں پر قطرہ قطرہ آنسو

آنکھیں، مجھے لگا تھا جیسے میں لوہے کا معمولی ذرہ ہوں اور وہ مقناطیس! اس روز بھی اس نے فان کلر کی گرم چادر اسی انداز میں اوڑھ رکھی تھی اور اس کا دراز قد سفیر کے قد کے مقابلے میں بہت نمایاں لگ رہا تھا۔ سفیر مجھے اس کے مقابل کھڑا کتنا چھوٹا سا لگا تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں سفیر کے پاس سے ہٹ کر اس کے مقابل آکھڑی ہوئی تھی۔

”یہ ارمان صاحب ہیں۔ شعر کہتے ہیں اور فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں۔“ سفیر ہنسا تھا۔ ”اور خود کو ہمہ وقت انٹلیکچول ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔“

”اچھا تو انٹلیکچول ایسے ہوتے ہیں؟“ میں نے سوچا تھا۔

ایک بار میڈم زبیری نے کہا تھا۔ ”یہ تم کن دو اور دو چار کرنے والے لوگوں میں پیدا ہو گئی ہو اور اب یونہی کسی دو اور دو چار کرنے والے سے بیاہ دی جاؤ گی۔ تمہارے لیے تو کوئی انٹلیکچول مرد ہونا چاہیے جو خوبصورت لفظوں میں تمہارے حسن کو سراہ سکے اور جو تمہارے حسن کے قصیدے لکھے اور پھر تمہارے قدموں میں پھولوں کے ڈھیر لگا دے۔“

سراونچا کر کے ارمان نصیب کو دیکھتے ہوئے مجھے لگا تھا کہ یہی وہ مرد ہے جس کے متعلق میڈم زبیری نے کہا تھا اور جسے دیکھتے ہی میرا دل اپنی بیٹ کا ردھم کھو بیٹھا تھا اور گالوں پر گلال سا بکھر گیا تھا۔

جب رات کو اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے میں نے ٹین کو اس کے متعلق بتایا تھا تو اس نے بے پردائی سے کندھے اچکائے تھے۔ ”دیکھا ہے میں نے اسے ایک بار سفیر بھائی کے ساتھ! بہرہ دیا ہے۔ دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ایک ڈھونگ ہے اور پتا ہے جب اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمستے کہا تھا تو میرا جی چاہا تھا کہ اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں پر زور سے تھپڑ لگاؤں اور کہوں، مہاراج جی! آپ کی دیوی سرحد پار رہ گئی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ بھی ادھر ہی ہجرت کر جائیں۔ اور اگر مجھے سفیر بھائی کا خیال نہ ہوتا تو میں کہہ بھی دیتی۔“

مجھے ٹین کی سوچ پر بہت حیرت ہوئی تھی کہ اسے ارمان کا اسٹائل پسند نہیں آیا تھا۔ حالانکہ اس کا اسٹائل ہی تو مجھے بھا گیا تھا اور ابھی تک میرے کانوں میں اس کا گیمیر لہجہ رس گھول رہا تھا۔ ”نستے دیوی جی۔“ اس کی حلاوت نے میرے رگ و پے میں ایک منھاس سی بھر دی تھی۔ مجھے ٹین کی رائے قطعی پسند نہیں آئی تھی لیکن میں نے اس سے بحث نہیں کی تھی۔ اس کی Judgement کتنی صحیح تھی حالانکہ وہ عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔

وہ میری طرح خوابوں کی دنیا میں نہیں رہتی تھی اور بچپن ہی سے بہت پریکٹیکل تھی۔ جبکہ میں! نئے خواب دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ بچپن میں بھی کہانیاں پڑھتے ہوئے میں خواب دیکھنے لگتی تھی۔

کبھی مجھے لگتا جیسے میں بھی خوابیدہ شہزادی ہوں اور کوئی شہزادہ کوس در کوس منزلیں طے کرتا، مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے سوئے ہوئے محل میں آ گیا ہے۔ اور کبھی مجھے لگتا جیسے میں سنڈریلا ہوں اور میرا شیشے کا ایک جوتا بادشاہ کے محل میں رہ گیا ہے اور سب سے خوبصورت شہزادہ مجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ اور کبھی مجھے لگتا جسے میں ونڈر لینڈ کی میری ہوں جو خرگوش کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ایک عجیب دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ یہ خواب دیکھنا مجھے کتنا مہنگا پڑا تھا۔

”مجھے حیرت ہے کہ سفیر بھائی جیسے شخص کی اس بہروپے سے دوستی کیسے ہو گئی؟“ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا تھا اور پھر اپنے نوٹس بنانے میں مشغول ہو گئی تھی۔

اسے پڑھائی کا شوق جنوں کی حد تک تھا۔ میں نے بھی سوچا تھا بھلا ارمان نصیب جیسے انٹلیکچول اور بندے نے سفیر جیسے دو اور دو چار کرنے والے بندے سے کیسے دوستی کر لی۔ کہاں ارمان نصیب جیسا شاعر اور کہن سفیر، جس کا ادب و شاعری سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ جو ایم بی اے کی ڈگری لے کر بھی ڈل کا ڈل تھا اور صبح سے شام تک اس چکر میں پڑا رہتا تھا کہ بزنس کو زیادہ سے زیادہ پھیلا سکے۔ اور جس کے پاس کبھی اتنی فرصت بھی نہیں ہوتی تھی کہ کبھی اس لڑکی کو نگاہ اٹھا کر دھیان سے دیکھ لے جس کے حسن و خوبصورتی کا پورے خاندان میں شہرہ تھا اور جسے کالج سے لے کر یونیورسٹی تک ہر جگہ بیوٹی کونین اور چارمنگ پرنسز کا ٹائٹل ملتا رہا ہے اور جو بچپن ہی سے اس کی منگیتر کے عہدے پر فائز ہے۔

سفیر میں مجھے اس سے پہلے اتنی خامیاں کبھی دکھائی نہیں دی تھیں۔ میں تصور ہی تصور میں اس کا اور ارمان کا مقابلہ کرتی رہتی۔ ارمن کتنا دراز قد ہے اور سفیر بونا سا اور ایک بار میں نے یہی بات ٹین سے کہہ دی تھی۔ سفیر اسی وقت ہمارے پورشن سے گیا تھا۔

”یہ سفیر کا قد کتنا چھوٹا ہے۔“ میرے تصور میں ارمان تھا، چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا قد۔ ”ہیں؟“ ٹین نے حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔ ”اتنا اچھا تو ہے سفیر بھائی کا قد اور پھر تمہارے پانچ فٹ چار انچ قد کے ساتھ تو بڑا سوٹ کرتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب تم دونوں ساتھ ساتھ کھڑے تھے تو بہت اچھے لگ رہے تھے۔“

”بھلا میرا اور اس کا کیا ذکر۔“ میں جھنجھلا گئی تھی۔ ٹین سے تو بات کرنا قطعی فضول تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے سفیر میں کوئی برائی کیوں نہیں نظر آتی تھی اس کے سانولے رنگ میں بھی اسے اٹریکشن نظر آتی۔

”مردوں پر یہی رنگ سوٹ کرتا ہے۔ سانولے مرو کا آدھا حسن اس کی سانولی رنگت میں ہوتا ہے۔ روٹین تم نے کبھی غور کیا؟“

نشین پتا نہیں کس دنیا میں رہتی تھی۔ شاید اس نے ارمان کی رنگت کو کبھی دھیان سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی صاف شفاف سفید رنگت میں، جس میں ہلکا سا گلابی پن تھا، کتنی کشش تھی۔ جیسے ایک ساتھ کئی سورج اس کے چہرے پر اتر آئے ہوں۔

”بہت خوبصورت مرد خود پرست ہوتے ہیں۔ ان کے دل محبتوں سے نا آشنا ہوتے ہیں۔“ یہ نشین کی رائے تھی۔

لیکن ارمان تو ہرگز ایسا نہیں تھا۔ گو اسے بہت خوبصورت مرد کہا جاسکتا تھا لیکن اس کا تو پور پور محبتوں میں گندھا ہوا تھا۔ جب وہ ذرا سا سرخم کر کے، پلکیں اوپر اٹھا کے کہتا۔ ”شہناجی، یہ اتنا حسن! میں تو بے موت مارا جاؤں گا۔ کیوں آزما رہی ہیں میرا صبر۔“ تو اس کی آنکھوں میں محبتوں کا ایک دریا ہلکورے لے رہا ہوتا۔ اس کے ہونٹ، اس کی آنکھیں، اس کے ہاتھ اس کا پورا وجود محبتوں کا اظہار کرتا تھا۔

یہ نشین تو بیوقوف ہے۔ اسے ابھی لوگوں کی پہچان نہیں ہے اور جانے کیا الٹا سیدھا پڑھتی رہتی ہے جس نے اس کی سوچ اور فکر کو مجھ سے اتنا مختلف کر دیا ہے۔ حالانکہ لوگوں کی پہچان تو مجھے نہیں تھی۔ نشین تو بہت عقلمند، بہت سمجھدار تھی۔ اس نے بہت پہلے، جب میں نے میڈم زبیری کے ہاں جانا شروع کیا تھا، مجھ سے کہا تھا۔ ”یار روشین! یہ میڈم زبیری کچھ پراسرار سی لگتی ہیں، جیسے ان کے ظاہر و باطن میں تضاد ہو۔ جیسے انہوں نے اپنا وجود دبیز پردے کے پیچھے چھپا رکھا ہو۔“

میڈم زبیری مجھے پہلی بار جم خانے میں ملی تھیں۔ اس شام ڈیڈی کو اور سفیر کو کچھ لوگوں سے جم خانے میں ملنا تھا شاید کوئی بزنس ڈیلنگ تھی۔ ڈیڈی کی طبیعت خراب تھی۔ سفیر آ پا تو میں اسما کے ہاں جانے کے لیے تیار ہو کر ٹی وی لاونچ میں کھڑی تھی۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا۔

”کیا کہیں جا رہی تھیں؟“

”ہاں۔ اسما کی طرف جانا تھا لیکن وہ گھر پہنچ نہیں ہے۔ اور میں ان طویل چھٹیوں سے انتہائی بور ہو رہی ہوں۔“

”اچھا تو پھر میرے ساتھ چلو، جم خانہ۔“

”ہاں، ہاں لے جاؤ۔“ ڈیڈی نے تائید کی۔ ”اچھا ہے کچھ پتا چلے گا کہ بزنس ڈیلنگ میں لوگوں سے کیسے بات چیت کی جاتی ہے۔“

ڈیڈی کی برقعہ خواہش تھی کہ میں ایم بی اے کر لوں اور بزنس میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ ہم دو ہی بہنیں تھیں اور ادھر سفیر بھی اکلوتا تھا۔ ڈیڈی چاہتے تھے کہ ہم ان کا بازو بنیں لیکن مجھے بزنس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لہذا میں انگریزی ادب میں ماسٹرز کر رہی تھی جب کہ نشین ڈیڈی کی خواہش کی

تکمیل میں ایم بی اے کرنا چاہتی تھی۔

”ان لوگوں کو بہت اسپیشل پروٹوکول دینا ہے روشین۔“ راستے میں سفیر نے مجھ سے کہا تھا۔

لیکن وہ سب لوگ مجھے انتہائی بور لگے تھے اور ان کی گفتگو اس سے بھی زیادہ بور۔ سو میں معذرت کر کے اٹھ آئی تھی اور باہر کورٹ کی طرف جاتے ہوئے مجھے میڈم زبیری ملی تھیں جو ٹینس کھیلنے جا رہی تھیں۔ انہوں نے خود ہی مجھے مخاطب کیا تھا۔

”ہیلو کیوٹ لڑکی! تمہارے چہرے پر اتنی بیزاری کیوں ہے؟“ پھر کچھ ہی دیر میں وہ مجھ سے اچھی خاصی بے تکلف ہو گئی تھیں۔ انہیں اس بات پر بہت حیرت ہوئی تھی کہ میں اتنے بڑے بزنس ٹائیکون کی بیٹی ہوں اور اس قدر سادہ۔

”یارتو اس بزنس فیملی میں کچھ ان فٹ سی نہیں لگتی ہو؟“

اسی روز انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا اور میں ان سے انتہائی متاثر ہوئی تھی۔ ان کی علمی و ادبی گفتگو، ان کا ڈریس، ان کا اسٹائل، ہر چیز نے مجھے اثر کیا تھا اور اب سفیر مجھے ڈھونڈتا ہوا کورٹ تک آیا تھا اور میں نے ان سے تعارف کروایا تھا۔

”یہ سفیر ہے میرا کزن۔“

”صرف کزن یا.....“ وہ شوخی سے مسکرائی تھیں اور زندگی میں پہلی بار سفیر کے نام پر میرے رخسار تپ اٹھے تھے۔ تب وہ کھلکھلا کر ہنسی تھیں اور پھر بڑی گرم جوشی سے سفیر سے ہاتھ ملایا تھا۔

”آپ کا نام تو بہت سنا تھا۔ آج ملاقات بھی ہو گئی۔“ ان کی آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی بھلا سفیر کب سے اتنا مشہور ہو گیا کہ میڈم زبیری جیسی خواتین نے اس کا نام سن رکھا تھا۔

”تم اسے کب سے جانتی ہو روشین؟“ راستے میں سفیر نے پوچھا تھا۔

”ابھی یہاں جم خانہ ہی میں ملاقات ہوئی ہے۔“

”لوگ اس کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے بلکہ کچھ تو صاف لفظوں میں بلیک میلر کہتے ہیں۔ اس پر یلو جرنلزم کا الزام بھی ہے۔“

”میں نے سفیر کی بات پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ لوگوں کی رائے کا کیا ہے، وہ تو ہر ایک کے متعلق یونہی الٹی سیدھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ سفیر نے تو یوں بھی ایک سنی سنائی بات کی تھی۔ سو میں نے اس سے میڈم زبیری کے متعلق کچھ نہ پوچھا تھا اور نہ ہی میرے ذہن میں یہ تھا

شاندار ہے۔ کتنا اعلیٰ فرنیچر ہے، کتنی زبردست ڈیکوریشن ہے، ایک سے ایک قیمتی کرشل ہیں۔ بلجیم اور اٹلی کے اور بیڈرومز سے لے کر ڈرائنگ روم تک میں ایک ایک فائونٹس لاکھوں کا تھا۔ بالکل سادہ کاشن کا لباس پہننے والی میڈم زبیری جو دولت کی غلط تقسیم کے خلاف تھیں۔ جن کی آنکھیں اس بات پر آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں کہ عربی گھوڑے تو دبلے پتلے اور کمزور تھے جبکہ خچروں کے جسم فربہ تھے۔

اتنی خوبصورت باتیں کرنے والی میڈم زبیری میرا آئیڈیل بن گئی تھیں۔ وہ اکثر مجھے یونیورسٹی ہی سے پک کر لیتیں اور پھر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی اسکالر سے ملوانے لے جاتیں اور میں ان دنوں خود کو دی آئی پی سمجھنے لگی تھی جسے میڈم زبیری اتنی اہمیت دے رہی تھیں۔

اس روز بھی انہوں نے مجھے یونیورسٹی ہی سے پک کر لیا تھا۔ میں نے اپنی گاڑی واپس کر دی تھی۔ میڈم زبیری کے ہاں لُچ تھا اور بڑے بڑے ادیب و شاعر مدعو تھے اور مجھے بہت شوق تھا اتنے بڑے بڑے لوگوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا۔ میڈم کو راستے میں Shen one سے اپنے لیے جوتا لینا تھا۔ جب ہم Shen one سے نکل رہے تھے تو سفیر نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ بھی غالباً وہاں شاپنگ کرنے آیا تھا۔ اس نے میڈم زبیری کو مسکرا کر Wish کیا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”تھینک گاڈ! تم مجھے یہاں مل گئی ہو۔ میں تمہیں ہی لینے جا رہا تھا۔ یہاں کچھ کام تھا سو ذرا دیر کو رہا تھا۔“

”کیوں خیریت ہے نا؟“ میں گھبرا گئی۔

”ہاں! بس اکل نے تمہیں بلوایا تھا۔“

”کیا ابھی جانا ضروری ہے؟ میں تو میڈم کے ساتھ جا رہی تھی۔ آج لُچ تھا۔ بڑے بڑے رائٹرز کو بلوایا تھا میڈم نے۔“ میں روہانسی ہو رہی تھی۔

”اے!“ اس نے معذرت طلب نظروں سے میڈم کو دیکھا جو مسلسل اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

”آپ کے ہاں تو ایسے لُچ ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پھر بھی سہی۔“

”چلیں پھر سہی۔ لیکن اب کے تم بھی ساتھ آنا۔“

”شیو!“ یہ کہہ کر سفیر مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا روشین کہ یہ اچھی عورت نہیں ہے۔“ گاڑی روڈ پہ لاتے ہی اس

نے کہا۔

”اچھی عورتیں کیسی ہوتی ہیں سفیر؟“

کہ میری آئندہ کبھی میڈم سے ملاقات ہوگی۔ میں تو آج بھی جم خانہ جا کر انتہائی بور ہوئی تھی۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک ہفتے بعد جب یونیورسٹی کھلے گی تو میڈم زبیری مجھے تلاش کرتی ہوئی وہاں آ جائیں گی۔

میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی کہ کسی نے مجھے آواز دی۔ مڑ کر دیکھا تو میڈم زبیری تھیں۔

”ارے آپ یہاں کیسے؟“

”ہائے روشی جان! صرف تم سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔ ایک ہی ملاقات میں تم نے مجھے اپنا اسیر کر لیا ہے۔ اتنی اداس ہو گئی تھی جانو۔ جانے کیا بات ہے تم میں۔“ انہوں نے میرے رخسار پر بوسہ دیا۔

میں ان کے خلوص سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ کاشن کا سادہ ڈریس، کانوں میں بہرے کے ننھے ننھے ٹاپس، کٹے ہوئے بال، اور بغیر میک اپ کے معصوم سا تاثر دیتا ہوا چہرہ! اسما بھی ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنا کارڈ دیا اور اپنے گھر آنے کی پر خلوص دعوت دی۔ ملنے رہنے کو کہا پھر وہ خود ہی کتنی بار مجھ سے ملنے یونیورسٹی اور گھر آ گئیں۔ ان کی گفتگو مجھے مزہ دیتی تھی۔ ان کا اسٹائل مجھے امپریس کرتا تھا۔ وہ گفتگو میں بڑے بڑے ادیبوں، فلسفیوں اور شاعروں کے حوالے دیتی تھیں۔

”انہوں نے دنیا بھر کا ادب گھول کر پی رکھا ہے۔“ میں نے مٹین کو بتایا تھا اور ایک روز زبردستی اسے اپنے ساتھ میڈم زبیری سے ملوانے لے گئی تھی۔ واپسی پر اس نے جو رائے میڈم کے متعلق دی تھی، اس نے مجھے اندر ہی اندر مشتعل کر دیا تھا لیکن میں نے مٹین سے کچھ نہیں کہا تھا۔ البتہ دل ہی دل میں مجھے پچھتاوا ہوا تھا کہ خواہ مخواہ مٹین کو میڈم زبیری سے ملوایا۔ اب وہ ضرور مجھے منع کرے گی کہ میں میڈم زبیری جیسی خاتون سے، جن کے ظاہر و باطن میں تضاد دکھائی دیتا ہے، تعلقات نہ رکھوں۔ لیکن اس نے مجھے کچھ نہیں کہا تھا اور اگر وہ کچھ کہتی بھی تو میرے لیے ناممکن تھا کہ میں میڈم سے قطع تعلق کر لوں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میڈم سے ملنے کے بعد مجھے اپنے گھر کا ہر فرد بہت چھوٹا لگنے لگا تھا۔ زندگی کا مقصد صرف دولت اکٹھا کرنا ہی تو نہیں ہے۔ یہ کیا کہ شاندار گھروں میں رہو، قیمتی ڈریس پہنو، شاندار گاڑیوں میں گھومو اور دن بھر دو دو چار کرتے رہو۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ زندگی تو بہت خوبصورت ہے اور اسے خوبصورت طریقے سے ہی بسر کرنا چاہیے۔

ایجوکیڈ، اسکالر اور انٹلیکچوئل لوگوں کی طرح!

میں نے اس بات پر تو کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ میڈم زبیری کا ڈیفنس میں اپنا گھر کتنا

”اچھی عورتیں جیسی بھی ہوتی ہیں، کم از کم میڈم زیری جیسی نہیں ہوتیں۔“

”میڈم بہت اچھی ہیں۔ دراصل تمہاری اپروچ ہی اتنی ہے۔ تمہارا ذہن دو اور دو چار سے آگے نہیں سوچتا۔“

میں نے اس سے بہت بحث کی تھی لیکن اس نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ سوائے اس کے کہ مجھے تمہارے خیالات سن کر افسوس ہوا روٹھیں۔ اس بات کا مجھے ہمیشہ دکھ رہا کہ میں اس روز بڑے بڑے رائٹرز کو قریب سے سن اور دیکھ نہیں سکتی تھی۔ میں نے کئی دن تک سفیر سے بات نہیں کی تھی کہ اس نے جھوٹ کیوں بولا۔

”اس لیے کہ میں نہیں چاہتا کہ اس عورت کے ساتھ تمہارا نام بھی آئے۔ روٹھیں وہ اچھی عورت نہیں ہے اور تم بیوقوف لڑکی ہو۔“

”سفیر بھائی صحیح کہتے ہیں روٹھیں۔“ ٹین نے بھی اس کی تائید کی۔ ”تم نہیں جانتیں کہ میڈم زیری نے اپنے اصل چہرے پر اور کتنے چہرے لگا رکھے ہیں۔“

لیکن مجھے ان دونوں کی باتوں کا اعتبار کہاں تھا۔ سو میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ میں میڈم سے ملنا ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔ بلا سے سفیر ناراض ہو جائے اور ٹین کو برا لگے۔ لگتا تھا جیسے میں ان کے ٹرانس میں تھی۔ لیکن ہوا یوں کہ میڈم خود ہی ملک سے باہر چلی گئیں۔ کتنے سارے دن میں اس بات پر اداس رہی کہ وہ مجھ سے ملے بغیر چلی گئیں۔ یہ تو بہت دنوں بعد مجھے پتا چلا تھا کہ وہ اس طرح کیوں چلی گئی تھیں۔ دراصل میں نے کبھی اخبار وغیرہ پڑھنے میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ اس لیے مجھے ملک میں ہونے والے اہم اور غیر اہم واقعات کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ اس روز جب میں ارمان کے حق میں ٹین کو بڑی بڑی دلیلیں دے رہی تھی اور میڈم زیری کی کبھی ہوئی باتیں بھی دہراتی جا رہی تھی تو ٹین نے بہت غصے سے کہا تھا۔

”روٹھیں فارگا ڈسک۔ اس کے اقوال مت دہراؤ مجھے ملک دشمن عناصر سے نفرت ہے اور تمہیں تو شاید یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ وہ اچانک ملک سے فرار کیوں ہوئی ہے۔“

”فرار ہوئی ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”اس لیے خاتون کہ وہ کئی ایجنسیوں کو مطلوب تھیں۔ اور اس سے پہلے کہ انہیں گرفتار کیا جاتا، وہ بھاگ گئیں۔“

ٹین کے بتانے کے باوجود پتا نہیں کیوں میں ان سے نفرت نہیں کر سکتی تھی۔ وقتاً فوقتاً ان کی کبھی ہوئی باتیں میرے ذہن میں گونجتی رہتیں اور مجھے اپنے سب خاندان والے بہت چھوٹے سے لگتے۔ دو اور دو چار کرنے والے لوگ! کاش! مجھ جیسی آرٹسٹک مائنڈڈ لڑکی کسی انٹلیکچوئل

فیلٹی میں جنم لیتی۔ مجھے ان کی بات یاد آتی تو مجھے خود پر ترس آنے لگا تھا۔

☆☆☆

میں اپنی ایجوکیشن مکمل کر چکی تھی اور ٹین اپنی پڑھائی میں بہت مصروف تھی۔ آنٹی اور می بہت کم سخن اور گھریلو سی تھیں۔ سفیر، انکل اور ڈیڈی صبح گھر سے نکلتے تو شام گئے آتے۔ میں بہت بور ہو رہی تھی۔

”اچھی اچھی کتابیں پڑھا کرو۔“ ایک روز سفیر نے مجھے مشورہ دیا۔ ”ذہن کو وسعت ملے گی۔“

”کاش! میڈم زیری ہوتیں تو مجھے گائیڈ کرتیں کہ مجھے کیا پڑھنا چاہیے۔“ سفیر نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ ”میرے پاس بہت اچھا انتخاب ہے۔ دل چاہے تو آجانا کسی دن۔“

میں اس کا انتخاب دیکھ کر ایک لمحہ کو حیران رہ گئی۔ اس نے ساری دنیا کا ادب اکٹھا کر رکھا تھا۔ شیلے، کیلس، ٹیکسپیئر، گورکی، موپساں، ٹامس سے لے کر ممتاز مفتی اور بانو قدسیہ تک کی کتابیں اس کی اسٹڈی میں تھیں۔

کیا یہ ساری کتابیں سفیر نے بھی پڑھ رکھی ہیں۔ میں نے سوچا تھا اور پھر خود ہی اس کی نفی کر دی تھی۔ ناممکن! یہ بڑے اور امیر لوگوں کا ایک طریقہ ہے۔ ایک بار میڈم نے کہا تھا۔ ”دوسروں پر رعب ڈالنے اور محض نمائش کے لیے یہ لوگ بڑے ادیبوں کی کتابوں سے اپنی شیلیف سجالیتے ہیں۔ حالانکہ ان کو پتا تک نہیں ہوتا کہ موپساں کون ہے اور سارتر کون تھا۔ گورکی کی ”ماں“ کیا تھی؟ تاہم میں سفیر کی اسٹڈی میں جانے لگی تھی۔ اور اس روز بھی میں کتاب ہی لینے ادھر گئی تھی۔ جب سفیر نے مجھے ارمان سے متعارف کروایا تھا۔

ہمارا گھر ایک ہی تھا، بس پورٹن الگ الگ تھے۔ جنہیں مہندی کی باڑا لگ کرتی تھی۔ ان دنوں سفیر ایک نئی مل لگانے کے سلسلے میں مصروف تھا۔ سو کئی بار ایسا ہوا کہ ارمان اس سے ملنے گھر آیا تو وہ نہ تھا۔ میں ارمان کی اسٹڈی میں ہوتی، وہ جاتے جاتے بھی چند باتیں کر جاتا۔ یہ تو بعد میں مجھے پتا چلا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس وقت آتا جب سفیر گھر پر نہ ہوتا تھا۔

یوں ارمان میرے حواس پر چھاتا چلا گیا۔ اور سفیر دور ہوتا گیا۔

”شناجی آپ کی ہنسی جیسے دور کہیں پہاڑوں پر برف گر رہی ہو۔“

”آپ کی آواز جیسے کہیں جھرنے بہہ رہے ہوں۔“

”شناجی آپ کو پتا ہے میں صرف ایک نظر آپ کو دیکھنے کے لیے آتا ہوں اور یہ ایک

نظر مجھے دن بھر معطر رکھتی ہے۔“

وہ چند لمحوں کے لیے آتا اور کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ جاتا جو گھٹنوں مجھے سرشار رکھتی۔
میں کتاب سامنے رکھے ان لفظوں کی حلاوت میں کھوئی رہتی۔

مجھے سفیر کی ہر بات پر اعتراض ہونے لگا تھا۔ میں اس کی ہر بات، ہر عمل کا موازنہ ارمان سے کرنے لگی تھی۔ ارمان مجھے شاجی کہہ کر بلاتا تھا، سفیر نے کبھی مجھے کوئی پیارا سا مختصر نام نہیں دیا تھا۔ ارمان مجھے دلنشین لفظوں میں سراہتا، جب کہ میری یادداشت میں ایسا کوئی لمحہ نہیں تھا جب سفیر نے میری تعریف کی ہو۔

ان دنوں جب میں ارمان کے سحر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سفیر نئی مل کی مشینری کے سلسلے میں جاپان چلا گیا اور یوں ارمان کا آنا موقوف ہو گیا۔

میں بولائی بولائی سی پھرتی۔ جیسے کہیں کچھ کھو گیا ہو۔ وہ اس کا نگہیر لہجہ، وہ اس کی محبتیں لٹاتی آنکھیں، اور اس کی وہ خوبصورت ادبی گفتگو، شیلے، کیٹس، بائرن کی شاعری پر بحث، ممتاز مفتی اور نجیب محفوظ کی تحریروں پر تبصرہ۔ میں تو جیسے اس کی طلسم میں جکڑی گئی تھی۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے روشین؟“ دو ایک بار ٹین نے پوچھا اور پھر مذاق بھی کیا۔ ”سفیر بھائی تو یاد نہیں آرہے؟“

بھلا سفیر میں یاد آنے کے قابل بات ہی کیا تھی۔ جو یاد آ رہا تھا، اس نے آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ پھر ایک روز اس کا فون آ گیا۔

”شاجی کیسی ہیں آپ؟“

”آپ؟“ میں مسحوری ہو گئی۔ ”کہاں تھے آپ اتنے دنوں سے؟“

”کس بہانے آتا شاجی لیکن کیا بتائیں۔ راتوں کا چین اور دن کا سکون لوٹ لیا آپ

نے۔ یہ کیسا شب خون مارا ہے آپ نے ہمارے دل پر۔“

وہ بولتا رہا اور اس کے خوبصورت لفظ دل میں پھول کھلاتے رہے۔ اتنے دنوں کی بے چینی کو راحت مل گئی۔

”ہم تو آپ کو بنا دیکھے مرجائیں گے شاجی۔ سفیر تو جانے کب آئیں۔ آپ کو پتا ہے ہم تو ایک بار آپ کو میڈم زیری کے ساتھ دیکھ کر ہی دل کھو بیٹھے تھے۔ سفیر سے دوسری دراصل آپ کے لیے کی تھی۔“

یہ انکشاف مجھے حیران کر گیا اور ایک لمحے کو فخر سے میرا سر بلند ہو گیا۔ یہ اتنا اسٹاکش اور انٹلیکچوئل بندہ میرے لیے، صرف میرے لیے؟

”کچھ کریں شاجی، نہیں تو۔۔۔۔۔“

پھر میں اس سے باہر ملنے لگی۔ کبھی کہیں، کبھی کہیں۔ ٹین اپنی پڑھائی میں مصروف تھی۔ سفیر باہر تھا۔ میری مصروفیات کے متعلق پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ارمان جب بھی فون کرتا، میں اس سے ملنے چل دیتی۔ میں نے سوچا تھا زندگی یوں ہی گزرتی رہے گی۔ ایسے ہی خواب کے سے عالم میں مگر سفیر آیا تو مجھے ان خوابوں سے جاگنا پڑا۔ گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ایک دن میں ارمان سے مل کر آئی تو می کو جیولر سے بات کرتے دیکھا۔ می نے مجھے بھی بلالیا۔

”ادھر آنا روشین! یہ خورشید صاحب چوڑیوں کے ڈیزائن لائے ہیں، پسند کرلو۔“

”یہ سب کیا ہے ٹین؟“

”تمہاری شادی۔“ ٹین نے مزے سے چیونگم چباتے ہوئے کہا۔

”کس کے ساتھ؟“ میرے تصور میں یکدم ارمان آ گیا تھا۔

”کمال ہے۔ تمہیں نہیں معلوم، کس کے ساتھ؟“ ٹین نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ سفیر بھائی کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟“ وہ شوخ ہو رہی تھی۔

”نہیں!“ میں وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”میں سفیر کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے روشین۔“ ٹین نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”شاید! لیکن سفیر مجھے پسند نہیں ہے۔ شو پلیز۔ ماما سے کہہ دو۔ مجھے اس سے شادی نہیں

کرنا۔“

”کیا تم کسی اور سے؟“

”ہاں!“

میں ایک دم بہت بہادر ہو گئی تھی۔ سب ہی نے مجھے سمجھایا تھا۔ می، ڈیڈی اور ٹین نے لیکن میں تو بچپن ہی سے ضدی تھی پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ کسی کی بات مان لیتی۔ اور پھر ارمان بھی مسلسل مجھے اکسارہا تھا۔

”شاجی ہم بھلا کیسے زندہ رہ پائیں گے۔ یہ چہرہ دیکھنے کو نہ ملے گا، یہ آواز سننے کو نہیں ملے گی تو کیسے جی پائیں گے شاجی۔“

بالآخر ڈیڈی نے ہار مان لی۔

”ٹھیک ہے، روشین سے پوچھو، وہ کس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

ارمان کا نام سن کر ایک لمحے کو تو سب ہی ششدر رہ گئے۔ سفیر کا چہرہ غصے سے سرخ

ہو گیا۔

”وہ تو ایک بہت گھٹیا اور چپ سا آدمی ہے انکل۔ روٹین کو سمجھائیں۔“
 ”بہر دیا!“ ٹین نے ناک چڑھائی۔ ”تم پچھتاؤ گی روٹین۔ وہ تو سفیر بھائی کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہے۔ تم نے کبھی سفیر بھائی کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بہر حال اگر سفیر بھائی نہ سہی تو کوئی اور سہی۔ دنیا اچھے لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔“
 مگر میں فلسفہ بولتی۔ میڈم زبیری کی کہی باتیں دہراتی کہ میں اس ماحول میں فٹ ہوں۔

”اس عورت کا تو نام ہی نہ لو۔“ ٹین تو اس سے بہت چڑتی تھی۔ ”تم تو اس ماحول میں اسے مس فٹ نظر آتی تھیں اور خود سفیر پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتی رہی؟“
 لیکن تب مجھے ٹین کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ بھلا اسے سفیر جیسے عام سے دو اور دو چار کرنے والے بندے پر ڈورے ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے تو انہوں نے خود بتایا تھا کہ بڑے بڑے انٹلیکچول ادیبوں اور شاعروں نے انہیں پروپوز کیا تھا۔
 ”ارمان کا تو کوئی فیملی بیک گراؤنڈ نہیں ہے۔“ ایک دن ڈیڈی نے بتایا۔ ”میں نے پتا کروایا ہے۔“ نہ کوئی ڈھنگ کی جاب، نہ کوئی گھر اور میرے خیال میں تو ایجوکیشن بھی کوئی خاص نہیں ہے۔“
 ”ارمان سے تمہاری شادی نہیں ہو سکتی۔“ می نے صاف صاف کہہ دیا۔ ”کوئی خاندانی آدمی ہوتا تو بات بھی تھی۔“

ڈیڈی ارمان سے ملے اور دو گھنٹے کی ملاقات کے بعد انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔ ”خاندانی بیک گراؤنڈ سے الگ، ذاتی طور پر بھی وہ ایک سٹی آدمی ہے۔“
 میں حیران تھی کہ ان سب کو ارمان میں کوئی خوبی کیوں نظر نہیں آتی اور انہی دنوں میں نے اربینہ رزاق کی طرح نفل پڑھ پڑھ کر خدا سے اس کی دائمی رفاقت کی دعائیں مانگی تھیں لیکن جب ڈیڈی نے حتمی فیصلہ سنا دیا تو میں نے ولیم فائیو کی جانے کتنی گولیاں نگل ڈالیں۔ شاید گولیوں کی مقدار کم تھی کہ میں بچ گئی مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں ارمان کی زندگی میں شامل ہو گئی۔
 میں ڈیڈی کی بے حد رلاؤ لی تھی۔ پہلی اولاد ہونے کے ناتے سب ہی نے مجھے بہت چاہا تھا۔ انکل اور آنٹی بھی مجھ پر جان دیتے تھے۔

حالانکہ میرے اس فیصلے اور شادی سے کوئی بھی خوش نہ تھا پھر بھی میری شادی اسی دھوم دھام سے ہوئی جیسی ہونی چاہیے تھی۔ ڈیننس میں فل فرزند کوٹھی شادی سے پہلے ہی میرے نام کر

دی گئی تھی اور رخصت ہو کر میں اسی کوٹھی میں گئی تھی۔ ارمان کو ہنڈا کارڈ کے علاوہ پندرہ لاکھ روپے سلامی میں دیئے گئے تھے۔ انکل اور ڈیڈی نے اپنے طور پر اسے سیٹ کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ مل میں اس کے شیراز رکھے تھے اور گلبرگ میں بہت شاندار آفس بنا کر اسے امپورٹ، ایکسپورٹ کا بزنس سیٹ کر کے دیا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ارمان نے یہ کہہ کر آفس بند کر دیا۔
 ”میں پڑھنے پڑھانے والا آدمی ہوں۔ مجھ سے یہ دو اور دو چار نہیں ہوتا۔“

ان دنوں تو مجھے ارمان کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ میں خوابوں کے ہنڈولوں میں جھول رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا واقعی بزنس اس کے بس کا کام نہیں اور پھر کچھ کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ”وہ پندرہ لاکھ روپیہ جو تمہیں سلامی میں ملا تھا اور وہ دس لاکھ جو انکل نے مجھے گفٹ دیا تھا، انہیں بینک میں رکھو۔ ہر ماہ کا انٹرسٹ ہم دونوں کے لیے بہت کافی ہے۔“
 ”تو کیا تمہارا اتنا ہی حصہ تھا شاجی؟“ ارمان نے جواب میں کہا تھا۔
 ”کیا مطلب؟ اتنا کچھ تو ڈیڈی نے دیا ہے۔“
 ”کروڑوں کی جائیداد میں سے صرف اتنا تو تمہارا حق نہیں تھا۔“
 ”حصہ وہی ہوتا ہے جو ملتا ہے۔“

میں تو ہمیشہ سے درویش صفت تھی اور میڈم زبیری نے تو مجھے اپنے لیکچر سے بالکل ہی غنی کر دیا تھا۔ میں نے سارا روپیہ ارمان کے حوالے کر دیا۔ میں نے دولت کے حصار کو توڑ کر ایک انٹلیکچول مرد کو چنا تھا۔ میں خوشی کے بادلوں پر سوار تھی۔ مگر ایک دم نیچے آ گری۔
 ابھی زیادہ دن تو نہیں ہوئے تھے۔ شاید چھ ماہ یا سات ماہ۔ اس روز ارمان دیر سے گھر آیا تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر گر پڑا اور آنکھیں موند لیں۔
 ”ارمان۔ ارمان!“ میں نے گھبرا کر اسے جھنجھوڑا ڈالا مگر وہ بے حد بے سدھ تھا۔ میں نے اس کے جوتے اتارے اور تولیے کو ٹھنڈے پانی میں بھگو کر اس کے چہرے پر پھیرنے لگی۔ کبھی پاؤں سہلاتی اور کبھی ہتھیلیاں رگڑتی۔ تب گھبرا کر میں نے سوچا کہ کسی ڈاکٹر کو بلاؤں۔ جب میں باہر جانے لگی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا ہو گیا تھا آپ کو؟“ آنسو میرے رخساروں پر ڈھلک آئے۔
 ”کچھ بھی نہیں۔“ وہ کتنی دیر تک ہنستا رہا۔ ”تم کتنی بیوقوف ہو۔ آج ذرا زیادہ پی لی تھی،

نشہ ہو گیا۔“

میں حیرانی سے آنکھیں کھولے اسے دیکھتی رہی۔
 ”بہت محبت کرتی ہو مجھ سے؟“ اس کی آواز اب بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

میں نے سر ہلا دیا۔

”تو پھر اس کا عملی ثبوت دونا جانم۔ اپنا حصہ اپنے ڈیڈی سے مانگ لو۔“
”کیسا حصہ؟“ مجھے شاک سا لگا۔

”تمہارا حصہ! آدھا تو تمہارا ہی ہے نا۔ اپنے ڈیڈی سے کہو۔ اپنی زندگی میں ہی تمہیں تمہارا حصہ دے دیں۔ ورنہ وہ سفیر اور مٹین بہت چالاک ہیں۔ سب پر قبضہ کر لیں گے۔“
”خدا ڈیڈی کو طویل زندگی دے اور مٹین اور سفیر ایسے نہیں ہیں۔“
”تو پھر مرد بھوکے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“
”اور وہ بچیس لاکھ روپیہ؟“
”سب ختم ہو گیا۔“
”مگر کیسے؟“

”نذر کر دیئے حسینوں کو۔ ماہ پاروں کے قدموں میں ڈھیر کر دیئے۔“ وہ بولتے بولتے پھر سو گیا اور میں کتنی ہی دیر تک شاک کے عالم میں بیٹھی رہی۔
”نہیں! ارمان اتنا گھٹیا نہیں ہو سکتا۔ یقیناً دوستوں نے زبردستی پلا دی ہوگی اور اب نشے میں الٹی سیدھی کہہ رہا ہے۔“ مگر ارمان نے تو ہوش میں آ کر بھی یہی بات دہرا دی۔
”بچیس لاکھ روپیہ آخر کہاں خرچ ہوا۔ صرف چند ماہ میں؟“
”حساب دوں تمہیں؟ مرد ہوں اور مرد حساب دیتا نہیں، لیا کرتا ہے۔“
میں حیرت سے اس کا منہ نکلتی رہی تھی۔ آج تک انکل، ڈیڈی، سفیر، کسی کو میں نے اس طرح حلق پھاڑ کر بولتے نہیں سنا تھا۔

پھر اس کا یہ مطالبہ زور پکڑتا گیا۔ میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میری خاموشی پر وہ گالیاں دیتا، تھپڑ مارتا اور فضول بکواس کرتا اور میں ساکت بیٹھی سوچتی رہتی۔ یہ ہے وہ انٹلیکچوئل مرد جس کی میں نے خواہش کی تھی اور اپنے سارے پیاروں کا دل دکھایا تھا۔
اس نے سارے ملازموں کو فارغ کر دیا تھا۔ خود باہر سے کھا کر آتا۔ گھر میں اکثر کھانے کو کچھ نہ ہوتا۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ مر بھی جاؤں تو ڈیڈی سے اپنے حصے کا مطالبہ نہیں کروں گی۔

اب تو وہ کھلم کھلا پینے لگا تھا۔ گھر پر بھی اس کے دوست احباب آتے۔ ادب پر بحث ہوتی۔ سیاست کے داؤ پیچ سمجھے جاتے۔ کارڈز کھیلتے ہوئے بیہودہ گوئی ہوتی، شعر کہے اور سنائے جاتے۔ اونچے اونچے قہقہے لگائے جاتے اور آخر میں جام پڑھائے جاتے اور میں بیڈروم کا دروازہ

بند کیے خاموش آنسو بہایا کرتی۔ باہر ڈرائنگ روم میں ان کے اونچے بے ہنگم قہقہے سن کر مجھے سارا شگفتہ کا زندگی نامہ یاد آ جاتا۔

میں انہیں

بک شیلف پر سجے دیکھتی تھی۔

ان بڑے بڑے ادیبوں

فلسفیوں اور شاعروں کو

اور میری نگاہیں عقیدت سے

جھک جاتی تھیں

جیسے میں

دپوتاؤں کے حضور کھڑی ہوں

لیکن جب سے

میں نے انہیں

سارا شگفتہ کے

زندگی نامے میں دیکھا

تو مجھے لگا

جیسے وہ سب کے سب

مکروہ چہروں والے

غول بیابانی ہوں

اور غلطی سے انسانوں کی دنیا میں آ گئے ہوں۔

سارا شگفتہ کے زندگی نامے سے نکل کر یہ غول بیابانی ہمارے ڈرائنگ روم میں اودھم

مچاتا اور انہی میں ایک ارمان نصیب بھی تھا جو سب کے چلے جانے کے بعد نشے میں دھت گالیاں

بکتا ہوا آ کر بیڈ پر گر جاتا۔

پچھتاوا میری رگوں کو کاٹنے لگا تھا۔ میں تھکنے لگی تھی۔ ہر روز ایک ہی مطالبہ! ایک سی

گالیاں!

اس روز بھی میں گالیاں اور تھپڑ کھا کر لاؤنج میں سر جھکائے بیٹھی تھی کہ سفیر اور مٹین

آ گئے۔ میری شادی کے کچھ دنوں بعد ہی اس کی شادی سفیر سے ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس کا ایم بی اے

ابھی مکمل نہیں ہوا تھا لیکن انکل کا اصرار تھا اور اب امتحان سے فارغ ہو کر وہ مجھے ملنے آئی تھی۔ میں

نے اپنے آنسو ضبط کر لیے۔ لیکن اس کی نظریں جیسے اندر تک اتر گئیں۔

”خوش نہیں ہونا روٹھیں؟“ ارمان نے نقاب اتار دیا ہے ناں

”وہم ہے تمہارا، میں خوش ہوں بہت۔“ میں نے زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی کہ میں ٹھین اور سفیر کے سامنے اپنے انتخاب پر شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔

”سچ کہہ رہی ہو؟“

ٹھین کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا جسے میں نے آہستہ سے چھڑایا۔ ”ہاں۔“

تب ہی ارمان بیڈ روم سے نکل آیا۔ وہی دھاری دار فان کلر کی چادر، اسی اسٹائل سے

لیے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ سجائے۔

”نمستے شمو جی اور سفیر جی۔“

”بہر و پیا!“ ٹھین کا دیا ہوا لقب میں نے دل ہی دل میں دہرایا۔

”آج تو غریب خانے کے نصیب جاگ اٹھے ہیں۔“

”نصیب تو آپ کے جاگ گئے ہیں سچ مچ ہی۔“

ٹھین نے بے ساختہ کہا تھا جس پر اس نے قہقہہ لگایا۔ اونچا طویل قہقہہ۔

”نوٹھین تم نے سارا ز سے کوئی ڈریس خریدا؟ زبردستی نئی ورائٹی آئی ہے۔“ ٹھین میری

طرف متوجہ ہو گئی۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ارے ہم غریب لوگ“ سارا ز کے بوتیک کے ڈریس کہاں افورڈ کر سکتے ہیں۔“

ارمان نے بڑے اسٹائل سے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ کبھی اس اسٹائل پر میں کتنا مرتی تھی لیکن اس وقت زہر لگا تھا مجھے۔ سفیر کی گہری نظریں میرے چہرے پر تھیں اور مجھے لگا تھا وہ اندر تک اتر کر مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں اس کی نظروں سے بچنے کے لیے چائے کے بہانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ٹھین میرے پیچھے کچن میں چلی آئی اور مجھے چائے بناتے دیکھتی رہی۔

”میں نے تمہیں منع کیا تھا نا روٹھیں۔“ اس کی آنکھوں سے دو آنسو گرے۔ میں نے

مڑ کر اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا۔ اگر میں دیکھ لیتی تو ضبط نہ کر پاتی اور بھرم ٹوٹ جاتا۔

”ممی کیسی ہیں؟“

”تمہیں یاد کرتی ہیں بہت۔“

”آؤں گی کبھی دن۔“

میں نے برائے نام دودھ والی چائے بنا کر ٹرے میں سجائی۔ ساتھ رکھنے کو کچھ نہ تھا۔

ٹھین تاسف سے مجھے دیکھتی رہی۔ اور جب میں چائے لے کر آئی تو سفیر اٹھ کھڑا ہوا۔

”او کے ارمان نصیب۔“ I will do something ”خدا جانے ارمان نے اس

سے کیا کہا تھا کہ چند دن بعد ہی علی پازہ اور کوئل مارکیٹ میرے نام کر دی گئی۔ میرے اکاؤنٹ میں ڈیڈی نے کافی کیش بھی جمع کروا دیا تھا۔ کئی دن تک سفیر آتا اور ارمان کو ساتھ لے جاتا رہا۔

”میں نے چاہا تھا کہ ارمان تمہاری سیٹ پر بیٹھے۔ لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں

ہے۔ تاہم اس کا نام ملز کے ڈائریکٹرز میں شامل کر دیا گیا ہے۔“ ایک روز سفیر نے مجھے فون پر

بتایا۔ ”وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ سو یہ پلازہ اور مارکیٹ ہے۔ اس کے کرائے سے زندگی آسانی سے گزار لے گا۔“

یہ مارکیٹ اور پلازہ کوئی چھوٹا موٹا پلازہ نہیں تھا بلکہ ڈبل اسٹوری مارکیٹ تھی۔ اور علی پلازہ کے انڈر گراؤنڈ اور گراؤنڈ فلور پر پچیس کے قریب شاپس تھیں فرسٹ اور سیکنڈ فلور پر فلیٹس تھے۔ ارمان کو واقعی کچھ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ لاکھوں میں کھیلنے لگا تھا۔ اس کا حلقہ احباب بھی بدل گیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے جم خانہ جاتا۔ ریس کھیلنے کے لیے کراچی اور راولپنڈی جایا کرتا تھا۔ بڑے بڑے لوگوں سے اس کے تعلقات ہو گئے تھے۔ وہ انہیں ڈنر اور پارٹیاں دیتا اور ان کے ہاں پارٹیوں میں جاتا اور مجھے بڑے فخر سے متعارف کرواتا۔

”مائی وائف! اوصاف گروپ آف انڈسٹریز کے اوصاف صاحب کی بیٹی۔“ پھر متعارف کروا کے بھول جاتا کہ میں بھی وہاں ہوں۔ اپنے مخصوص دلکش لہجے میں وہ سب سے ملتا ہوا پارٹی میں موجود سب سے خوبصورت خاتون کے پاس جا بیٹھتا اور پھر جیسے اس کی آنکھیں مقناطیس بن جاتیں۔ اس کے پورے وجود سے طلسمی کرنیں پھوٹنے لگتیں۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ میں اسے ٹھوکر مار کر چلی آؤں۔ ایک بار پھر یہ اپنے کرشن نگر کے اس دو کمروں کے گھر میں چلا جائے جہاں کی دیواروں کا سینٹ تک اکھڑا ہوا تھا۔ لیکن پھر ٹھین کا یا سفیر کا فون آ جاتا۔

”ٹھیک تو ہونا..... روٹھیں؟“

”ہاں!“ میرے تھکے ہارے وجود میں توانائی بھر جاتی۔

”خوش ہو؟“

”ہاں!“ میں خوش ہونے کی ایکٹنگ کرتی۔ ”ارمان میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔“ لیکن

ٹھین کو کبھی میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

”کوئی پرالم ہو تو جھجکنا مت۔ ہم سب ہیں نا تمہارے اور یہ مت سمجھنا کہ تمہارے ساتھ

کوئی نا انصافی ہوئی ہے۔ سب کچھ تمہارا ہے، تمہارا اور تمہارے بچوں کا۔ تمہارا حق ہمیشہ ہے اور

رہے گا۔ یہ تو ارمان.....“

وہ ہر بار فون بند کرتے ہوئے ضرور کہتی۔ کیا میں نہیں جانتی تھی کہ ارمان کیا ہے۔ لالچی، حریص! جیسے کتے کے آگے ہڈی ڈال دی جائے اور وہ اس ہڈی کو چچوڑتا رہے۔

ہر بار میرا دل چاہتا ہے کہ کہوں، ٹین سنو میں تھک گئی ہوں۔ اس شخص کے ساتھ بھاگتے بھاگتے میرا دم ٹوٹنے لگا ہے۔ مجھے اس کے چنگل سے نکال لو۔ لیکن پھر میری عزت نفس، میری انا میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔

نہیں ٹین بھلا کیا سوچے گی؟ سفر کیا کہے گا؟ ڈیڈی، انکل سب، کتنا سمجھایا تھا سب نے۔ نہیں! اور میں نئے سرے سے ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔

وہ رات گئے نشے میں دھت آتا ہے تو اس کے جوتے اتارتی ہوں۔ وہ واٹس روم میں جاتا ہے تو باہر ٹاول ہاتھ میں لیے کھڑی رہتی ہوں۔ اس کے کپڑے اپنے ہاتھ سے استری کرتی ہوں۔

کبھی کبھی وہ محفوظ ہوتا ہے اور کبھی کبھی برس پڑتا ہے۔

میں کیا کروں؟ میں ٹین اور سفیر کے سامنے سر اٹھا کر کھڑی رہنا چاہتی ہوں کہ اس انٹلیکچول مرد کو میں نے خود منتخب کیا تھا سو میں ہر طرح سے اسے جیتنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اپنی وفاؤں سے، اپنی خدمت گزاری سے اور ارمینہ رزاق کی طرح نفل پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگتی ہوں ایسے کہ میرے آنسو میری پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پر گر رہے ہیں۔

اس کی غلیظ گالیاں میرے کانوں میں گونجتی ہیں اور سارا شگفتہ کے ”زندگی نامے“ میں موجود سارے انٹلیکچول، ارمان سمیت غول بیابانی میں بدل جاتے ہیں۔ اپنی لمبی زبانیں نکالے آگ کے گرد وحشیانہ رقص کرتے ہوئے۔

”یارب اس انٹلیکچول مرد کو جسے میں نے منتخب کیا تھا، انسان کی جون دے دے۔

یا خدا!

میری دعائیں میری ہتھیلیوں پر آنسوؤں کی صورت گرتی رہتی ہیں اور میرے گرد وحشیانہ رقص جاری رہتا ہے۔